**آئینہٴ حقوق**

ترجمہ اردو

**حقوق از دیدگاہ امام سجاد﷣**

**شرح رسالۃ الحقوق**

تألیف

**استاد قدرت اللہ مشایخی**

ترجمہ

نثار احمد زینپوری

e

مشخصات کتاب

|  |  |  |
| --- | --- | --- |
| نام کتاب | : | آئینہٴ حقوق |
|  |  | حقوق از دیدگاہ امام سجاد﷣ |
| تالیف | : | استاد قدر اللہ مشایخی |
| ترجمہ | : | نثار احمد زینپوری |
| تاریخ اشاعت | : | رجب، ۱۴۳3؁ھ |
| ناشر | : | جعفری پروپگیشن سینٹر |
| پتہ | : | Asma Manzil, Room No. 10, Bazar Road, Opp. Khoja Masjid, Bandra (W), Mumbai–50. Tel.: 2642 5777. www.jpconline.org  E-mail: jpcbandra@yahoo.com, jpcbandra@gmail.com |

# 

# فہرست

[عرض ناشر 4](#_Toc322104587)

[مؤلف کے قلم سے Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104588)

[عمرۂ مفردہ Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104589)

[مکۂ مکرمہ میں داخل ہونا Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104590)

[اعمال عمرۂ مفردہ Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104591)

[احرام Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104592)

[واجبات احرام Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104593)

[مستحبات ِاحرام Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104594)

[مکروہاتِ احرام Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104595)

[محرماتِ احرام Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104596)

[محرمات احرام سے متعلق سوالات و جوابات Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104597)

[مستحبات ِ دخولِ حدودِ حرم Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104598)

[مستحبات ِ دخولِ مکۂ مکرمہ Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104599)

[مستحبات ِ دخولِ مسجد الحرام Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104600)

[طواف Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104601)

[واجبات ِ طواف Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104602)

[آداب و مستحبات ِ طواف Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104603)

[نماز طواف Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104604)

[مستحبات نماز ِ طواف Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104605)

[سعی Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104606)[(صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان چکر لگانا) Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104607)

[مستحبات ِسعی Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104608)

[تقصیر یا حلق Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104609)

[طواف النساء اور اُس کی نماز Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104610)

[محصور و مصدود](#_Toc322104611)[(جو دشمن وغیرہ یا مرض کی بنا پر حج و عمرہ سے روک دیا گیا ہو) Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104612)

[طواف وداع Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104613)

[مسائل متفرقہ Error! Bookmark not defined.](#_Toc322104614)

# حرف مترجم

شرح رسالۃ الحقوق کا اردو ترجمہ آئینہ حقوق، ادارۂ ’’ القائم (عج)‘‘ کی اولین پیشکش ہے، امید ہے بارگاہ رب العزت، خدمت امام زمانہ او ر قارئین کی نظر میں شرف قبولیت حاصل کرے گی۔

جیسا کہ نام ہی سے واضح ہے رسالۃ الحقوق مختصر کتاب ہے لیکن زیر نظر کتاب جناب مستطاب قدرت اللہ مشایخی کی شرح کا ترجمہ ہے۔ امام زین العابدین ؑ نے پچاس حق بیان فرمائے ہیں، ان میں دوسرے حقوق کے ساتھ اعضاء انسانی کے حقوق کے ذیل میں ان کی ساخت اور حساسیت و نزاکت اور ان کی فعالیت کی بھی وضاحت کردی ہے جس ے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان ایک چلتی پھرتی کائنات ہے شاید خداوند عالم نے اسی لئے ایک طرف پوری کائنات اور ایک طرف انسان کو رکھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب ؑ نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

اتزعم انك جرم صغير وفيك انطوي عالم الاكبر

کیا تم خود کو چھوٹا سا وجود سمجھتے ہو، حالانکہ تمہارے اندر عالم اکبر سمایا ہوا ہے۔

اس عالم اکبر پر کتنے حقوق واجب ہیں، ان کو کیسے ادا کیا جاسکتا ہے، ان کے ادا نہ کرنے کی صورت میں انسان کن آفتوں اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے، یہ باتیں قارئین کو اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو جائیں گی، انشاء اللہ۔

’’ادارۂ القائم‘‘ میں میرے شریک کار جناب مولانا غلام عباس صاحب زین پوری ہیں جوکہ جامعۃ المنتظرنوگانواں سادات میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

نثار احمد زین پوری

مدرستہ الواعظین لکھنؤ

# اپنی بات

میرے تعلیمی سفر کا ابتدائی زمانہ تھا، حوزۂ علمیہ جامعۃ المنتظر میرا عملی گہوارہ تھا، ایک روز کچھ فارغ التحصیل طلبہ میز پر رکھی ہوئی ایک ضخیم و وقیع کتاب کے بارے میں گفتگو کررہے تھے، میں نے کتاب کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آیت اللہ العظمی شہید سعید قاضی نوراللہ شوستری کی تالیف احقاق الحق ہے، اس زمانہ میں میری اتنی استعداد نہیں تھی کہ اس بحر بیکراں میں شناوری کرسکوں لہٰذا جہاں سے کتاب اٹھائی تھی وہیں رکھدی، جب کچھ عربی سمجھ میں آنے لگی تو اس کی عظمت و آفاقیت کا اندازہ ہوا، اسی زمانہ سے میرے دل میں یہ جذبہ مچلنے لگا کہ کاش جوانوں کے لئے اس کا ترجمہ اردو میں ہوجاتا اور ان کو اپنے مذہب کی حقانیت و آفاقیت کا علم ہو جائے۔ ظاہر ہے اس اہم کام کے لئے ایک خطیر رقم اور طویل مدت درار ہے لہٰذا فی الحال اس کام کو ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا۔ اپنی اس دلی خواہش کی تسکین کے لئے جوانوں کی خدمت میں بطور خاص رسالۃ الحقوق کی شرح کا ترجمہ پیش کررہے ہیں۔ اس کار خیر میں میرے شریک کار حجۃ الاسلام و المسلمین مولانا نثار احمد صاحب زین پوری ہیں۔

غلام عباس

حوزۂ علمیہ جامعۃالمنتظر ،نوگانواں سادات

# مقدمہ

حق اور حقوق، انسانی معاشروں کے درمیان نہایت اہم بحث تھی اور آج بھی ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست انسان کی زندگی سے ہے، انسان کے مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے یہ بحث وجود میں آئی ہے، صاحبان علم عرصۂ دراز سے حقوق سے بحث کرتے چلے آئے ہیں اس موضوع پر انھوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں ہیں۔

حق، انبیاء خصوصاً اسلام کے نورانی و انسان ساز مکتب میں خاص توجہ کا مرکز رہا ہے چنانچہ مختلف عبارتوں اور تعبیروں سے اس کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں :

یوں تو تعریف و توصیف کے لئے حق کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن آپس میں اس پر عمل کرنے کا دائرہ بہت محدود ہے۔ دو آدمیوں میں ایک کا حق دوسرے پر اس وقت ہوتا ہے جب دوسرے کا حق اس پر ہوتا ہے اور دوسرے کا حق اس پر اس وقت ہوتا ہے جب اس کا حق دوسرے پر ہو، پھر اگر کوئی ایسا ہے کہ اس کا حق دوسروں پر ہو لیکن اس پر کسی دوسرے کا حق نہیں ہے تو یہ صرف خدا سے مخصوص ہے اس کی مخلوق کا یہ مرتبہ نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنے بندوں پر اقتدار رکھتا ہے اس نے جہاں بھی احکام جاری کئے ہیں عدل و انصاف کے ساتھ جاری کئے ہیں۔

انبیاء کے (خصوصاًاسلام کے ) مکتب میں نظام حقوقی ایک قطعی اور مسلم حقیقت ہے، مسلمانوں کے درمیان یہ بات بخوبی واضح ہے کے اجتماعی و سماجی روابط اور اختلافات کو قرآن کے احکام اور اس کے بیان سے حل ہونا چاہیے، قرآن نے بھی مسلمانوں اور اسلامی معاشروں کویہ بات اچھی طرح سمجھا دی ہے چنانچہ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

جو لوگ خدا کی نازل کی ہوئی آیتوں کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے ہیں وہی نافرمان و فاسق ہیں۔۱؎ اسی سورے کی دوسری آیتوں میں ایسا نہ کرنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔

جو لوگ خدا کی نازل کی ہوئی (کتاب) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔

جو لوگ اس چیز کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے کہ جس کو خدا نے نازل کیا ہے تو وہی ظالم ہیں۔

اے رسول ؐ ان کے درمیان ان آیتوں کے ذریعہ حکم و فیصلہ کیجئے، جو خدا نے نازل کی ہیں اور ان کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے۔

انبیاء (خصوصاً) اسلام کے مکتب میں حقوقی نظام کی بنیاد الٰہی و انسانی اصولوں پر استوار ہے اور اس کے پس پشت بلند و بالا اور پاکیزہ مقاصد ہیں اور زندگی کے تمام زاویوں اور معاشرے کے ہر ایک پہلو پر توجہ رکھتا ہے اور اس میں عدل قائم کرتا ہے۔

اسلام کا حقوقی نظام معاشرہ کو کرامت و شرافت کی بنیاد پر استوار کرتا ہے اور صحیح تصور کائنات کی اساس پر اس کی اصلاح کرتا ہے اور نسلی و قومی امتیازات کی نفی کر کے سارے مومنوں کو کالے، گورے، عربی و عجمی اور خاندانی تفریق مٹا کر، ایک معاشرہ سمجھتا ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے حاکمیت خدا کی ہے یہاں تک جو لوگ قانون سازی کے عہدہ پر فائز ہوتے ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خدا کے قوانین کو کشف کریں اور اجتماعی و سماجی دستورات اس کے مطابق قائم کریں اور خود بھی مکمل طور پر اس کی اطاعت کریں۔

اسلام کے قوانین فطرت سے ہم آہنگ ہیں وہ انسان کی خواہشوں اور تمایلات کو ضرورت کے مطابق نہ کم نہ زیادہ در خود اعتنا سمجھتا ہے اور اپنی معاشرہ کی ضرورتوں کی تکمیل، خودمختاری، آزادی، اقتصادی و تہذیبی وثقافتی ترقی اور اسلامی معاشرہ کی قیادت کے ذریعہ ثابت و متغیر قوانین کے دائرہ میں انسان کو اس کے مقصد تخلیق اور ہدایت کی طرف لے جاتا ہے۔

## حق

جو شخص حقوق کے اقسام سے بحث کرتا ہے، اسے ہر چیز سے پہلے حق کو پہچاننا چاہیے، اس لئے پہلے ہم لغت میں حق کے معنی دیکھیں گے اور پھر اس کے اصطلاحی معنی اور اس کی اقسام بیان کریں گے اور مفہوم حق، ماہیت حق، حق و ملک کے فرق اور حق و حکم کے فرق کو بھی بیان کریں گے۔

## حق کے لغوی معنی

لغت میں حق کے متعدد معنی بیان ہوئے لیکن ہم یہاں ان میں سے انھیں کی طرف اشارہ کریں گے جو اہم ہیں :راغب اصفہانی لکھتے ہیں : دراصل حق کے معنی مطابقت و موافقت رکھنا ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مطابقت و ہم آہنگی کی حق کے اکثر معانی میں رعایت ہوئی ہے۔ منجملہ :

الف۔ حق، خدا اور پیدا کرنے والے کے معنی میں استعمال ہوا ہے: اس نے ساری مخلوق کو حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے۔

’’ فذالکم اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ب۔ حق مخلوق کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس لحاظ سے کہ مخلوق کو حکمت کے مطابق خلق کیا ہے،

’’ وما۔۔۔۔۔۔

ج۔ حق واقع کے مطابق اعتقاد رکھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے،

’’فھدی اللہ۔۔۔۔

د۔ حق اس قول و فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو شائستہ اور نپا تلا ہو۔

لقد۔۔

بعض اہل علم اور صاحبان لغت نے لکھا ہے کہ جن معنی میں حق مستعمل ہوا ہے ان کی تحقیق سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اصل میں حق کے معنی ثبوت ہیں اور حق کے تمام معنی کی بازگشت ثبوت ہی کی طرف ہوتی ہے۔

بنابریں حق عبارت ہے ہر ثابت امر سے خواہ وہ واقعی ہو یا نسبی۔ اسی لئے ہم خدا کو حق کہتے ہیں کیونکہ وہ ثابت و حقیقی ہے اور قرآن کو اس اعتبار سے حق کہتے ہیں کہ اس کا خدا کی طرف سے ہونا ثابت ہے او ر جو امر واقع و ثابت ہوتا ہے اس کو حق کہتے ہیں۔ اور عدل کو اس لیے حق کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز کے ثبوت و بقا کا ضامن ہے اور اسلام کو اس کی حقیقت و واقعیت اور اس کے ثبوت کے لحاظ سے حق کہتے ہیں۔

کسی شخص کی ملکیت اور اس کے مخصوص حصہ کو بھی حق کہتے ہیں یہ بھی اس کے ثبوت ہی کے لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ قانون کے حکم اور معتبر قراردار کی بنا پرمعین و ثابت ہوا ہے، حق کے مختلف معنی کے مقابل میں باطل بھی آتا ہے اور اس کے اپنے معنی ہیں۔

## مفہوم حق

لفظ حق، مصدر، اسم مصدر اور صفت کی صورت میں استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے : وہ جانتے ہیں کہ خدا واضح حق ہے۔ خدا کے فعل کے لئے بھی حق کا لفظ استعمال ہوا ہے،خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ دین خدا کے لئے بھی حق کا لفظ استعمال ہوا ہے، خدا وہ ہے کہ جس نے اپنے رسول کو دین حق کے ساتھ بھیجا۔ وعدہ کے بارے میں بھی آیا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کا وعدہ حق ہے،وحی کے لئے بھی حق کا لفظ ہے۔ کتاب سے ہم جس چیز کی وحی ی ہے وہ حق ہے۔ قصص کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ بیشک یہ قرآن کے برحق قصے ہیں۔ اور حکم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کریں۔

مزید برآں قرآن مجید میں حق کا ایک مخصوص مفہوم ہے جو دو انسانوں کے درمیان کے رابطہ کویا ایک انسان اور دوسری چیز کے رابطہ کو بیان کرتا ہے اس صورت میں کبھی مطلق طور پر استعمال ہوتا ہے، اپنے قرابتداروں کا حق دے دو۔ اور کبھی ل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، ان کے اموال میں مانگنے والوں اور محروموں کا حصہ ہے، کبھی علیٰ کے ساتھ ہوتا ہے، مقروض و مدیون کا لکھوا لنا چاہیے۔

امام زین العابدین ؑ اور دیگر ائمہ علیہم السلام کے کلام میں حق کا استعمال حقوقی اصطلاح میں نہیں ہوا ہے بلکہ اخلاقی حقوق میں ہوا ہے، اگرچہ ان میں سے اکثر میں اجتماعی پہلو بھی ہے اور اس کتاب میں ہماری اصل بحث اسی سے ہے۔

## حق کے اصطلاحی معنی

حق کے اصطلاحی معنی کے سلسلہ میں مغرب کے فلسفیوں اور اسلامی علماء کے درمیان اختلاف ہے: ہم یہاں ان میں سے بعض اختلافات کو بیان کرتے ہیں :

۱۔ فرانس کے معاشرہ شناش اور ماہر اقتصادیات لرمی نیہ،نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے، حق بشر کے روابط کی ہم آہنگی اور ان کا توازن ہے، یہ بات پہلے بھی بیان ہوچکی ہے کہ لغوی اعتبار سے حق اس عدل کو کہتے ہیں جو موجودات کے درمیان یا ہر موجود کے اجزا میں ہم آہنگی و توازن پیدا کرتا ہے، بنا برایں، فرانسوی معاشرہ شناس نے حق کی جو تعریف کی ہے اگرچہ وہ عین عدل نہیں ہے لیکن اس سے بہت قریب ہے۔

۲۔ بعض نے حق کی تعریف اس طرح کی ہے۔حق ایک فطری و طبیعی یا قرار دار و اعتباری واقعیت و حقیقت ہے کہ جو اپنے مالک کو اس کی نگہبانی کرنے کے لئے طاقت دیتی ہے،جیسے حق حیات، حق آزادی و مساوات، ازداوجی حق اور قصاص وغیرہ کا حق۔

۳۔ سید محمد آل بحرالعلوم۔ تیرہویں صدی کے عظیم فقہاء میں سے ہیں، کہتے ہیں :حق کبھی ملک کے مقابل اور کبھی اس کے مرادف مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے اور دونوں معنوں میں ایک اعتباری و فرضی طاقت ہے کہ جس کے سبب سے ایک انسان کو کسی مال یا کسی شخص پر یا دونوں پر تسلط و غلبہ دیا جاتا ہے، جیسے کرایہ پر لی گئی چیز کہ کرایہ پر دینے والے کو کرایہ پر لینے والے مخصوص مال پر تسلط ہوتا ہے۔

۴۔ شیخ انصاری ؒ فرماتے ہیں : حق،ایک قسم کا تسلط و قدرت ہے کہ جس کے سبب صاحب حق اپنے لئے کوئی فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔

۵۔ محمد کاظم اخوندخراسانی کہتے ہیں : حق، خاص اعتبار اور ایک مخصوص اضافہہے جوحکم وضعی یا تکلیفی یاکسی دوسری چیز سے سمجھ میں آتا ہے جیسے ملک سے فائدہ اٹھانے اور اس میں تصرف کرنے کاحق ملکیت سے اخذ ہوتا ہے، اسی طرح حق مارہ (راہ گیر کاحق) کہ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ا س کے لئے اس باغ کا پھل کھانا مباح ہے کہ وہ جس کے پاس سے گزرتا ہے۔

۶۔ آیت اللہ سید محسن الحکیم کہتے ہیں :

حق ملک ہی کی ایک قسم ہے اور ملک مالک اور مملوک کے درمیان ایکخاص قسم کا رابطہ ہے۔

۷۔ سید محمد کاظم یزدی طباطبائی:

حق، کسی چیز پر ایک اعتبار اور فرضی تسلط ہے یا اس کا تعلق خارج کی کسی چیز سے ہوتا ہے، جیسے کسی زمین کو پتھروں سے گھیرنا یا خارج کے علاوہ دوسری چیز سے ہوتا ہے جیسے خیار فسخ کا حق، یا کسی پر ہوتا ہے مثلاً قصاص کاحق،بنابرایں حق، ملک سے کم رتبہ ہے بلکہ اسی کی ایک قسم ہے۔

۸۔ دوسرے افراد نے حق کو ملک سے نچلے درجے پر رکھا ہے اور حق و ملک دونوں کو تسلط کے دو مرتبہ میں قرار دیا ہے۔ چنانچہ آیت اللہ ابوالقاسم الخوائی لکھتے ہیں ملکیت عام قدرت و تسلط سے عبارت ہے جب کہ حق خاص تسلط ہے۔

۹۔ علامہ طباطبائی مرحوم فرماتے ہیں :

حق ایک قسم کا اختصاص ہے۔ یہ اختصاص اجمالی طور پر معاشرہ کے وجود میں آنے سے پہلے بھی تھا اور معاشرہ کی تشکیل کے بعد مختلف اور گونا گوں صورتوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے، ان میں سے ایک حق ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حق اور ملک میں کیا فرق ہے۔

## حق اور ملک کا فرق

مفہوم حق پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ حق اور ملک کے درمیان جو فرق ہے اس کو بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک اور مالکیت کے مفہوم کی بھی وضاحت کردی جائے تاکہ ان دونوں کا فرق روشن و واضح ہوجائے۔

۱۔ ملک ایک شرعی حکم ہے جس کا تعلق اصل چیز یا اس کی منفعت سے ہوتا ہے اور یہ مالک کو مالک ہونے کی حیثیت سے اس سے فائدہ حاصل کرنے یا ان کا عوض لینے کی طاقت و قدرت دیتا ہے۔

۲۔ ملکیت، کسی چیز کے اختصاص سے عبارت ہے کہ دوسروں کو اس سے منع کرے اور اس کے مالک کو اس میں تصرف کا موقع دے مگر یہ کہ کوئی شرعی مانع اس کو اس میں تصرف سے باز رکھے۔

۳۔ ملک ایک اعتباری رابطہ ہے کہ جس کی بنیاد پر مملوک، مالک سے مخصوص ہوجاتا ہے اور اس کے مقتضا سے مالک کو قانون کے دائرے میں یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے جس طرح چاہے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو اس میں تصرف کرنے سے باز رکھے لیکن اگر شرعی موانع ہوں جیسے حکم افلاس اس صورت میں وہ اس میں تصرف نہ کرسکے گا۔

گذشتہ نظریات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض فقہا نے حق کو ملک سے نچلے درجہ میں رکھا ہے اور بعض نے اس کو کبھی ملک کے مقابلہ میں اور کبھی اس کے مرادف سمجھا ہے۔

حق اور ملک کے بارے میں جو وضاحت کی گئی ہے اس کو ملحوظ رکھنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حق، مصادیق کے لحاظ سے ملک سے اعم ہے لیکن اس کا مفہوم ملک کے مفہوم سے جدا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان دو بنیادی فرق ہیں :

۱۔ حق کو تصرفات کی تمام قسمیں بھی سمجھا جاسکتا ہے اور ایک چند تصرف بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ ملکیت کے برخلاف کہ اس کا مقتضا تصرفات عینی ہوتا ہے جیسے (کھانا، پہننا وغیرہ) اور تصرفات اعتباری جیسے بیچنا اور بخشنا وغیرہ کا جائزہونا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مقامات پر یہ تصرفات قانون کے حکم سے محدود ہوجائیں یا وقتی طور پر ممنوع قرار دیئے جائیں جیسے بچہ اور محجور کا اپنے مال میں تصرف کرنا۔

۲۔ مفہوم مالکیت صرف ایک اضافہ کو مستلزم ہو اور وہ مالک و مملوک کے درمیان ایک اضافہ و نسبت ہے جب کہ مفہوم حق میں صاحب حق اور متعلق حق کے درمیان جو اضافہ ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک اضافہ اور ملحوظ رکھا جاتا ہے اور وہ عبار ت ہے۔’’ من لہ۔۔۔۔۔۔ الحق‘‘ سے بنا برایں یہ دو مفہوم مستقل ہیں اور ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی جگہ نہیں آسکتا۔

## حق کی قسمیں

لغوی اور اصطلاحی معنیٰ، مفہوم حق اور ملک سے اس کے فرق کی وضاحت و تحقیق کے بعد ہم حق کی تقسیم بیان کرتے ہیں :

### ۱۔ حق طبعی اور حق وضعی

حق کی کچھ تقسیمات ہیں جن کو حقوق سے متعلق کتابوں میں درج کیا گیا ہے انھیں میں سے حق طبیعیاور حق وضعی بھی ہے بشر کے طبیعی حقوق کی بنیاد ایک ہی چیز پرہے اور وہ ہے انسان کا ان چیزوں سے استفادہ کرنا جو خداوند عالم نے پیدا کی ہیں اور انسان کی بقا اور کمال کا تلق ان سے استفادہ کرنے پر موقوف ہے۔ بعبارت دیگر حقوق طبیعی وہ حقوق ہیں جو فرضی واعتباری نہیں ہیں بلکہ وہ فطری طور پر دنیا میں پیدا ہوتے ہیں،جیسے زندگی اور آزادی کا حق ہر ایک کو محض پیدائش سے حاصل ہوجاتا ہے اور انسان کے حقوق کی بنیاد انھیں طبیعی حقوق پر قائم ہے۔

وضعی حقوق فرضی یااعتباری ہیں ان کو انسان نے خود کسی خاص مناسبت کی وجہ سے بنایا ہے۔ آیت اللہ سید محمد کاظم یزدی نے حقوق کو اس طرح تقسیم کیا ہے (یہ تقسیم نقل و انتقال اورحق کو ساقط کرنے کے لحاظ سے ہے)

۱۔ جوحقوق صاحب حق کے مرنے سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتے اور جن کا ساقط کرنا یا دوسرے کی طرف منتقل کرنا صحیح نہیں ہے وہ ہے باپ کا حق، حاکم کی ولایت کا حق، عورت سے خوش فعلی کا حق اور وصی ہونے کاحق۔

۲۔ جن حقوق کو ساقط کرنا جائز ہے لیکن دوسرے کی طرف منتقل کرنا صحیح نہیں ہے اور صاحب حق کی موت سے بھی وہ قہری طور پر دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتے ہیں وہ ہے: غیبت کا حق، گالی کا حق اور توہین کے ذریعہ اذیت و آزار پہنچانے کاحق یا زدکوب کرنے کاحق جب کہ اس کو راضیکرنا اور صاحب حق سے معاف کراناواجب ہو اور توبہ کافی نہ ہو۔

۳۔ جو حقوق حقدار کے مرنے کے بعد وارثوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور ان کا ساقط کرنا بھی جائز ہے لیکن انھیں دوسرے کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں وہ ہے حق شفعہ۔

۴۔ جن حقوق کو ایک دوسرے کی طرف منتقل کرنا اور ساقط کرنا جائز ہے، وہ حق خیار اور حق قصاص ہے۔

۵۔ جن حقوق کوبغیر عوض کے منتقل اور ساقط کرنا جائز ہے وہ ہے قسم کاحق۔ اس نظریہ کی بنا پر جس کو فقہا کی ایک جماعت، جیسے قواعد میں علامہ نے اور لمعہ میں شہیداولؒ نے، نقل کیا ہے۔

۶۔ جن حقوق میں نقل واسقاط مشکوک ہے مثلاً والدین اوراولاد کے نفقہ کاحق۔

### ۲۔ اللہ کااور لوگوں کا حق:

فقہا نے ایک کلی تقسیم میں حق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے :حق اللہ اورحق الناس۔امام خمینیؒ تحریر الوسیلہ میں تحریر فرماتے ہیں حقوق کی، اپنی کثرت کے باوجود، دو قسمیں ہیں،حق اللہ اور حق الناس، اسی کتاب میں حقوق کی دوسری تقسیم کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ حق اللہ کی دو قسمیں ہیں۔ محض خدا کا حق، جیسے زنا کی حد اور لواط کی حد یا خدا اور بندوں کامشترک حق جیسے تہمت کی حد اور چوری کی حد۔

لوگوں کا وہ حق ہے جس کو قانون بنانے والے نے کسی خاص فرد یا خاص افراد کے لئے بنایا ہوتا کہ وہ اس حق کی روشنی میں اپنے منافع حاصل کرسکے مثلاً حق الشفعہ حق الناس ہے اور اس کو استعمال کرنے سے فائدہ حاصل ہوتا ہے یا وہ فائدہ جو غیر منقول مال سے شریک کو ملتا ہے کسی دوسرے سے اس کا ربط نہیں ہوتا ہے، حق قصاص بھی حق الناس ہے اس سے بھی مقتول کے وارث ہی استفادہ کرسکتے ہیں۔

یہ بات واضح ہوجانے کے بعد، کہ حق الناس وہ حق ہے جو کسی فرد یا چند افراد سے مخصوص ہوتا ہے، ہم یہ کہتے ہیں : اسی کے مقابلہ میں خداکا حق ہے اور اس سے مراد معاشرہ کا عام حق ہے۔خصوصاً اللہ کیحق کو اس کے حقیقی معنی پر انھیں حمل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ خدا کوحق لینے کی ضرورت نہیں ہے۔اوران کا اس کو کوئی نفع پہونچتا ہے پس قانون بنانے والوں نے پورے اسلامی معاشرے اور امت مسلمہ کے لئے جو قانون بنائے ہیں اصطلاح میں انھیں حق اللہ کہتے ہیں :

فقہا کو سبیل اللہ کے معنی میں اس بات کا اذعان و یقین ہے کہ اس کوحقیقی معنی پر حمل کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا اس سے وہ امور مراد ہیں جو سب کے فائدے کے لئے ہیں، جن کا تعلق سارے معاشرے سے ہے اور ان کا فائدہ تمام لوگوں کے لئے ہے۔ شرح لمعہ کی کتاب الزکوٰۃ میں مرقوم ہے:وہعام المنفعہ امور جو ہم کو اس کی خوشنودی، قربت اور اس کے ثواب تک پہونچاتے ہیں وہ فی سبیل اللہ ہیں، جیسے مسجد بنانا، ضرورت مندوں کی مدد کرنا، دو آدمی کے درمیان صلح کرانا، علمی مدارس تعمیر کرانا اور نظام دین کو ثابت و قائم رکھنا۔

### ۳۔ حق اختصاص، اولویت اور مالکیت:

فقہا نے حق کی ایک اور تقسیم کی ہے اوریہ کہ حق،اختصاص اولویت اور مالکیت پر تقسیم ہوتا ہے و حق اختصاص کا تعلق عام طور پر اس جگہ سے ہوتا ہے کہ جہاں کسی چیز کی شرعی یاعرفی مالیت نہ ہواور نتیجہ میں مالکیت اس سے سلب ہو چکی ہو، اختصاص اورحق اولویت میں یہی فرق ہے کیونکہ اختصاص میں مالیت نہیں ہوتی ہے اوراس سلسلہ میں دوسرے سے صلح نہیں کی جاسکتی لیکن حق اولویت میں صلح کی جاسکتی ہے جیسا کہ اس سلسلہ میں شیخ انصاری فرماتے ہیں : فائدہ کے لئے نجس العین کی حفاظت کرنا جائز ہے،بظاہر ان چیزوں میں حق اختصاص ہے جو کہ حیازت یا سابقہ مالکیت سے پیدا ہوتا ہے مثلاً کسی کے حیوان کامرجانا اور اس کے گوشت کا خراب و فاسد ہونا اس حق پرعوض کے بغیر مصالحت نہیں ہوسکتی، بلکہ عوض کے ساتھ بھی اس صورت میں مصالحت ہوسکتی ہے کہ وہ عوض اس حیوان یا گوشت کی قیمت شمار نہ ہو۔

مرحوم نائینی فرماتے ہیں : ان چیزوں کا حق اختصاص کہ جو شرعی مالیت نہیں رکھتے ہیں،جیسے وہ شراب جو سرکہ بننے کے قابل ہے، انھیں حق کہا جاتا ہے۔

جوش دیئے ہوئے انگور، جو کہ شراب میں تبدیل ہوچکے ہیں، نجس ہیں اور اسلام میں شراب کی کوئی قیمت نہیں ہے لیکن چونکہ ان کو اتنا پکایا جاسکتا ہے کہ جس سے وہ سرکہ بن جائے اور قیمتی ہوجائے اگرچہ وہ مالیت نہیں رکھتے ہیں لیکن بعد کے عنوان کے لحاظ سے حق اختصاص محفوظ ہے۔

حق اولویت اورحق اختصاص کے درمیان یہ فرق ہے کہ جس چیز سے حق اولویت کا تعلق ہوتا ہے وہ شرعی مالیت کی حامل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی اسے تلف وضائع کرتا ہے تو وہ ضامن ہے اور اسے چاہیے کہ اس کا مثل یا اس کی قیمت مالک کو دے۔ مثلاً حق تحجیر میں حقدار کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اس میں تصرف نہیں کرسکتا۔ اور اگر کوئی اس کی اجازت و رضا کے بغیر اس میں تصرف کرتا ہے اور اس پر کوئی کام کرتا ہے تو اس میں حق نہیں پیدا کرسکتا۔

حق مالکیت، مالکیت کی تعریف ہم پہلے بیان کرچکے ہیں لیکن یہاں اس میں کچھ اضافہ کرتے ہیں : ہر انسان اپنی ذہنی تصویر پر تسلط رکھتا ہے یعنی جب چاہتا ہے اس کو ایجاد کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو مٹا دیتا ہے۔ اس تسلط کو تکوینی تسلط کہتے ہیں، اور جب خارج والی چیزوں کے بارے میں انسان ایساتسلط پیدا کرلیتا ہے تو وہ ان کا مالک بن جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مالکیت، خارج والی چیز پر شخصی تسلط، ایک اعتبار ہے کہ وہ خود اس میں صرف کرسکتا ہے اور دوسروں کو تصرف کرنے سے روک سکتا ہے بعض لوگوں نے کہاہے کہ مالکیت اعتباری، مالک و مملوک کے درمیان ایک اضافہ و نسبت ہے۔

## حقوق امام زین العابدین ؑ کی نظر میں

شرح رسالۃ الحقوق کہ جو جو فرد، اجتماعی اور اخلاقی حقوق کے بارے میں ہے اور حضرت علی ابن الحسین ؑ کا کلام ہے اب ہم اس کو شروع کرتے ہیں نیز بہت سے فردی حقوق کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

## انسان اور ذمہ داری

انسان کے اندر ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو دوسرے موجودات کے اندر نہیں ہے زندگی میں انسان کے لئے بہت سخت ذمہ داری ہے جو اس کی عقل و ادراک اوراجتماعی شعور سے وجو د میں آتی ہے، ذمہ داری ایک درخت ہے جس کی زمین معرفتیں ہیں اور اعتقاد اس کی جڑیں ہیں اور حوادث و بحران اس کی بہاریں ہیں۔ اگر اس کی زمین زرخیز ہے تو وہ ہر بہار میں پھل دے گی اور اس پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ کیونکہ آفت کسی کمی کی وجہ سے آتی ہے۔

### ذمہ داری کی بنیاد

خداوند عالم بلا وجہ نعمتیں نہیں دیتا ہے اور جو دیا ہے اس کو بلندی اور برتری کا معیار نہیں قرار دیتا ہے اور جو دیا گیا ہے اس کو کوئی نتیجہ ہوتا ہے یا اس کو واپس لوٹانا ہوتا ہے اس نتیجہ میں برتری ہے یہیں سے ذمہ داری پیدا ہوتی ہے کہ خداوند فرماتا ہے : یقینا اس روزتم سے نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

پس سرمایہ کو حرکت میں رکھئے ورنہ ذخیرہ اندوزی اور احتکار ہو جائے گا۔ جو دیا گیا ہے اس کا کچھ صلہ اور نتیجہ ہونا چاہیے۔ سرمایہ کا کچھ نفع ہونا چاہیے اور وہ جس کا ہے اسے اسی کے لئے ہونا چاہیے۔

### ذمہ داری کو سمجھنے کا طریقہ

ذمہ داری کو سمجھنے ک یلئے چند اصولوں کی ضرورت ہے۔

۱۔ ہوا و ہوس سے آزادی۔

۲۔ ذمہ داری کو پورا کرنے کی طاقت پیدا کرنا۔

۳۔ اس کو سمجھنا اور پہچاننا قرآن کہتا ہے:

جس نے ہدایت پائی اس نے اپنے ہی فائدہ کے لئے ہدایت پائی ہے اور جو گمراہ ہوا ہے وہ بھی اپنے نقصان کے لئے گمراہ ہوا ہے اور کوئی شخص کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہم اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے جب تک کہ اس کے پاس پیغمبر نہیں بھیج دیتے۔

انسان کی ذمہ داری خود اسی سے شروع ہوتی ہے۔ اس پر دو قسم کی ذمہ داری ہے: فردی واجتماعی۔ فردی ذمہ داری کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ہر نفس اپنے کئے کارہین و گروی ہے۔پھر فرماتا ہے : مردوزن میں سے جو بھی نیک کام انجام دیتا ہے اور وہ مومن ہے تو ہم اسے پاک و پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور اسے اس کے عمل سے بہتر جزا عطا کریں گے۔ اور انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں کے بارے میں فرماتا ہے:

لوگوں کے اعمال کے سبب خشکی اور دریا میں فساد ظاہر ہو (پھیل ) گیا ہے تاکہ ہم ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائیں شاید یہ پلٹ کر آجائیں۔

### ذمہ داری ذوق اور انتخاب کی بنیاد پر ہوتی ہے

ہر شخص اپنے ذوق،لیاقت اور طاقت و امکان کے مطابق ذمہ داری قبول کرتا ہے ایک کاشتکار اور مرغی فارم والا ہے دوسرا یالوہار یا درزی ہے، حکماء کا قول ہے کہ انسان، مدنی الطبع ہے یہ اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے اور اجتماعی زندگی کی طرف انسان کے راغب ہونے کی اسی طریقہ سے تفسیر ہوسکتی ہے۔جب زندگی کی بنیاد تعاون پر استوار ہے تو پھر یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ معاشرہ ے افراد کی ایک دوسرے کے بارے میں کیا ذمہ داری ہے اور دوسری طرف چونکہ انسان کے اندر خود خواہی کا جذبہ ہوتا ہے اور مشہور قول ’’ الحق لمن غلب ‘‘ لہٰذا وہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرلیتا ہے اور یہیں سے اجتماعی قتل و غارت گری پیدا ہوتی ہے اور یہیں سے معاشرہ کے لئے قانون کی احتیاج پیدا ہوتی ہے اور یہ کہ حصارکی صورت میں کچھ نظام اور مقررات معاشرہ میں وجود پذیر ہوں تاکہ ہر ایک اپنے مفاد و منافع کی حفاظت کرے۔

یہ تو بھی انسان کی ذمہ داری۔ انسان کچھ حقوق کا حامل ہے اسے ان کی رعایت کرنا چاہیے اور اسے جو کچھ عطا کیا گیاہے اس کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے گا بالکل اس طرح جیسا کہ قرآن فرماتا ہے : آنکھ، کان اور دل، سب سے سوال کیا جائے گا۔

یہ چیزیں واضح ہوگئیں تو ضروری ہے اپنی ذمہ داری کی حدوں کو پہچانیں اور یہ سمجھیں کہ کن حقوق کے بارے میں وہ ذمہ دار ہیں !

## رسالۃ الحقو ق اور امام ؑ سوانح عمری

حقوق کے بارے میں قضا وجزاء کے مختلف پہلوؤں سے مکاتب حقوق میں بحث ہوئی ہے۔ نمایاں اور قدآور شخصیتوں نے فردی و اجتماعی حقوق کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فردی و اجتماعی اور اخلاقی حقوق کے موضوع پرامام زین العابدین ؑ کے رسالۃ الحقوق سے جامع کتاب موجود نہیں ہے۔

شیعوں کے چوتھے امام حضرت زین العابدین ؑ نے ۳۷ھ؁ یا ۳۸ھ؁ میں ولادت اور ۹۴ھ؁ یا ۹۵ھ؁ میں شہادت پائی اور جنت البقیع میں اپنے چچا کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مرحوم کلینی نے آپ کی ولادت ۳۸ھ؁ اور شہادت ۹۵ھ؁ اور آپ کی عمرمبار ۵۷ سال تحریر کی ہے۔ (مشہور مورخ) یعقوبی نے آپ کی شہادت ۹۹ھ؁ اور عمر مبارک ۵۸ سال لکھی ہے۔ شیخ مفید نے آپ کی ولادت ۳۸ھ؁، شہادت ۹۵ھ؁ اور عمر مبارک ۵۷ سال تحریر کی ہے۔

آپ کی سوانح عمری کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے چنانچہ مورخین اور سیرت نگاروں نے آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں تحریری کی ہیں آپ امامت، ولایت و عصمت اور صداقت کے درجہ پر فائز تھے۔ آپ بہت عظیم انسان تھے۔ ایسی عبادت کی کہ زین العابدین نام پایا یعنی عبادت کرنے والوں کی زینت اور سجدے ایسے کئے کہ سید الساجدین لقب پایا یعنی سجدہ کرنے والوں کے سردار، خوف و خشیت خدا میں اتنا گریہ کیا ک تاج البکائین لقب پایا اور خدا سے اس طرح مناجات کی کہ لوگوں کو خدا سے دعا مانگنے اور اس سے ہم کلام ہونے کا دستور العمل ’’ صحیفۂ سجادیہ‘‘ یادگار چھوڑا۔

آپ سے ز یادہ صبر کرنے اور مشقتیں برداشت کرنے والا کون ہوگا کہ سانحۂ کربلا کے خونباز واقعہ کواپنی آنکھوں سے دیکھا اور ظلم وستم کے خلاف شام کی جامع مسجد میں خطبہ دے کر اپنا تعارف کرایا اور اپنے بزرگوں ی عظمت کو واضح اور بنی امیہ کی سرکشی وبیداد گری کو طشت ازبام کیا۔

معنویت کے بلند مقام پر فائز تھے اور دلوں میں اتنا اثر و نفوذ تھا کہ جب آپ ؑ خانۂ کعبہ کے طواف ک یلیے پہنچے تو مجمع بے اختیار چھٹ گیا اور راستہ صاف کردیا تاکہ آپ ؑ حجر اسود کو بوسہ دیں ار ہشام بن عبدالملک جو کہ اژدہام کی وجہ سے طواف نہیں کرسکا تھا اور حجر اسود کو بوسہ نہیں دے سکا تھا وہ ایکگوشہ میں کھڑاہوایہ منظر دیکھ رہا تھا اور لوگوں کی نظروں میں امام زین العابدین ؑ کے احترام اور ان کے دل میں آپ کی عقیدت کا مشاہدہ کررہا تھا۔ اس نے معلوم کیا :یہ کون ہے؟ جس کی اتنی عظمت ہے؟ فرزدق اپنے جوشیلے اشعار کے ذریعہ امام کا تعارف کراتا ہے اور ہشام سے کہتا ہے۔۔۔ کیا تم انھیں نہیں پہچانتے یا تجاہل کررہے ہو؟ یہ وہ ہیں کہ جن کے نقش قدم کو سرزمین بطحا پہچانتی ہے، انھیں خانۂ خدا، سرزمین حرم اور دوسری زمینیں پہچانتی ہیں۔

فرزدق نے اپنے اس طویل قصیدہ میں آپ کی عظمت کوبیان کیا ہے لیکن ہم اس مختصر کتاب میں پورا قصیدہ نقل کرنے سے قاصر ہیں۔ ہشام بن عبدالملک نے حسد کی بنا پر فرزدق کا وظیفہ بند کردیا تو امام زین العابدین ؑ نے فرزدق کو تاحیات وظیفہ دیا۔

آپ ؑ نے نبوت کے گھرانہ میں آنکھ کھولی کہ جس گھر کوخدا نے رفعت و بلندی کی اجازت دی ہے آپ ؑ وحی کے فرزند اور امام کے پروردہ اور خودامام ہیں۔ آپ مکمل انسان شناس ہیں، آدمی کی روح کے تمام زاویوں اور فردی و اجتماعی اور ثقافتی و سیاسی حقوق سے باخبر ہیں۔ ’’ رسالۃ الحقوق ‘‘ جو کہ پچاس حقوق پر مشتمل ہے، کو احادیث کی بہت سی کتابوں سے جمع کیا گیاہے اور صدیوں سے علماء ودانشوراس کی شرح لکھتے رہے ہیں ان شروح میں سے بعض کا ہم اس مقدمہ میں ذکر کریں گے۔

## رسالۃ الحقوق کے تراجم و شروح

رسالۃ الحقوق عرصۂ دراز سے علوم اسلامی کے دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور انھوں نے اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں، عظیم محقق یونیورسٹی کے پروفیسر جناب ڈاکٹر سید جعفر شہیدی نے اپنی کتاب زندگانیٔ علی ابن الحسین ؑ کے صفحہ ۱۷۰ و ۱۷۱ پر ان تراجم و شروح کا ذکر کیا ہے جو اس طرح ہیں :

۱۔ رسالۃ الحقوق، مولف سید سبط الحسن لکھنوی، حاشیہ کے ساتھ

۲۔ رسالۃ الحقوق، مولف عبدالہادی مختار، مولف کے مقدمہ کے ساتھ ’’ کتاب الشہر‘‘ کے سلسلہ کا ایک جز ہے اور کاظمین میں سید صادق صدر کے مقدمہ کے ساتھ چھپا ہے۔

۳۔ رسالۃ الحقوق، یہ فاضل نبیل و ماہر حقوق جناب توفیق الفلیکی، مقیم نجف اشرف، کی تالیف ہے۔

۴۔ اس رسالہ کے فقرے، سخناامام سجاد،، نامی رسالہ میں ڈاکٹر صاحب الزمانی کے توسط سے ۱۳۲۶؁ھ میں سے شائع ہوئے ہیں۔

۵۔ فاضل محترم جناب حاج شیخ محمد باقر کمرہ ای، نے رسالۃ الحقوق کا خصال کے متن سے پورا ترجمہ کیا ہے۔

۶۔ رسالۂ حقوق از مرحوم ناصری۔

۷۔ رسالہ حقوق از علی گل زادہ غفوری۔

۸۔ ترجمہ رسالہ حقوق از آیۃ اللہ جنتی، اس کا ترجمہ تحف العقول کے متن سے کیا ہے اور انتشارات علمیہ اسلامی نے ۱۳۵۴؁ھ میں شائع کیا ہے۔

۹۔ ترجمہ رسالہ حقوق از فاضل محترم جناب حاج سید احمد فہری زنجانی۔ یہ ترجمہ خصال کے متن سے کیا ہے۔

۱۰۔ رسالہ حقوق مختصر مقدمہ کے ساتھ انتشارات دارالتوحید، تہران سے ۱۴۰۳؁ھ مشں شائع ہوا ہے۔ دانشمند محترم جناب سپہری نے اپنی کتاب، ترجمہ و شرح رسالۃ الحقوق کے مقدمہ میں ڈاکٹر جعفرشہیدی کی مذکورہ فہرست نقل کرنے کے بعد دیگر تراجم و شروح کے مزید نام نقل کئے ہیں جو اس طرح ہیں :

۱۔ ترجمہ کوتاہ و سادہ جز وۂ کوچک امام چہارم موسسۂ درراہ حق، قم۔

۲۔ ترجمہ رسالۂ حقوق تالیف جناب ابراہیم میانجی، یہ رسالہ، کتاب ’’ سخنان برگزیدہ‘‘ کے ضمن میں ص ۱۹۱ تا ص ۲۲۲ پر کتاب خانہ مرتضوی تہران سے ۱۳۹۴ھ؁ ق میں شائع ہوا تھا۔

۳۔ اس رسالہ کا ترجمہ و شرح ’’ مبانی مناسبات انسانی در مدیریت اسلامی ‘‘ کے نام سے ۱۳۶۵ھ؁ میں دوبارہ انتشارات امیر کبیر سے شائع ہوا تھا۔ اس کے مولف سید محمود سیاہپوش (حسینی) ہیں۔

۴۔ کتاب ’’ صراط المومنین ‘‘ درترجمۂ رسالۂ حقوقیہ حضرت زین العابدین ؑ تالیف جناب قوام اسلامی جاسبی ص ۲۳۲ پر مشتمل ہے۔

۵۔ رسالۃ الحقوق للامام علی بن الحسین زین العابدین ؑ، عربی میں انتشارات اسماعیلیان نے قم میں دو جلدوں میں چھاپا ہے۔ یہ سید علی قبانچی کی تالیف اس پر حجۃ الاسلام سید محمد جواد تبریزی نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس کتاب میں علمی و دینی مواد بہت زیادہ ہے مگر افسوس کہ مولف نے روایات اور تاریخی مطالب کے مآخذ و مدر ک تحریر نہیں کئے ہیں خود سپہری صاحب نے بھی اس رسالہ کا ترجمہ و شرح کی ہے جو ۱۹۵ صفحات پر مشتمل ہے اور انتشارات دارالعلم نے قم میں ۱۳۷۰؁ھ میں شائع کیا ہے۔ آپ کی اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے رسالہ الحقوق کی سند کی بھی چان پھٹک کی ہے اس رسالہ کی یہ خصوصیت دیگر شروح میں نہیں پائی جاتی ہے۔ ہم یہاں انھیں کی سند کی تحقیق کو نذر قارئین کررہے ہیں۔

## تحقیق سند رسالۃ الحقوق

ہم پہلے بھی ذکر کرچکے ہیں کہ یہ رسالہ عرصۂ دراز سے علماء اور اسلامی دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور بہت سے بزرگوں نے اس کو اپنی معتبر کتابوں سے نقل کیا ہے ہم اس کو جن قدیم ترین منابع سے اس کو نقل کیا ہے وہ یہ ہیں :

۱۔ تحف العقول اثر:مرحوم ابن شعبہ حرانی متوفی ۳۸۱ھ؁، یہ رسالہ تحف العقول کے ص ۱۸۴ تا ص ۱۹۵ پر مرقوم ہے۔

۲۔ من لا یحضرہ الفقیہ ’’ اثر: رئیس المحدثین مرحوم شیخ صدوق متوفی ۳۸۲ھ؁ ق ج ۲ ص ۶۱۸ سے ۶۲۶ مرقوم ہے۔

۳۔ مکارم الاخلاق’’ اثر: مرحوم شیخ طبرسی متوفی ۵۴۸ھ؁ ق ’’ یہ رسالہ اس کتاب کے ص ۴۱۹ سے ۴۲۴ پر مرقوم ہے اس رسالہ کے دوسرے منابع جو علماء نے بیان کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں :

شیخ صدوق کی کتاب ’’ الخصال ‘‘ ص ۵۶۴، انھیں کی امالی ص ۳۶۸، علامہ مجلسی مرحوم کتاب بحار الانوار ج۷۴ ص۲ مرحوم خوئی کی شرح نہج البلاغہ ج ۱۴ ص ۱۳۴، سید محسن امین مرحوم کی، اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۶۳۸، محدث نوری مرحوم کی مستدرک الوسائل ج۲ ص۲۷۴ علامہ مامقانی مرحوم کی مرأۃ الکمال ج ۳ ص۵۹۹، تحف العقول کے مولف نے اس رسالہ کو بغیر سند کے نقل کیا ہے لیکن مرحوم شیخ صدوق نے، من لا یحضرہ الفقیہ میں اور (خصال) میں بھی اس کی سند بیان کی ہے۔ رجال سند کی تحقیق جو کہ دشوار مفید کام ہے جو علمائے رجال کی مخلصانہ زحمتوں اور محنتوں سے انجام پذیر ہوا ہے اور جس سے ائمہ کی صحیح معرفت ہوتی ہے اور جھوٹے راویوں کی قلعی کھلتی ہے۔ اسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جو کہ جناب سپہری صاحب کی تحقیق کا نتیجہ ہے موصوف نے سند کی تحقیق کا معیار کتاب (من لا یحضرہ الفقیہ) کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ مرحوم شیخ صدوق کو اس کتاب کے منقولات پر پورا اعتماد تھا۔ موصوف سند کی تحقیق کے سلسلہ میں لکھتے ہیں : مرحوم صدوق نے پہلے اس رسالہ کو مرسل طریقہ سے نقل کیا تھا اور لکھاتھا۔

اسماعیل ابن فضل نے ثابت بن دینار سے او انھوں نے سید العابدین علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے۔ پھر کتاب کے اختتام پر جہاں انھوں نے اپنے مشائخ کا ذکر کیا ہے اس طرح تحریر فرمایا ہے۔ اس کتاب میں جو کچھ میں نے امام زین العابدین ؑ کے رسالۃ الحقوق میں اسماعیل ابن فضل سے نقل کیا ہے اسی کی روایت میں نے علی ابن محمد ابن موسیٰ سے کی ہے وہ فرماتے ہیں : ہم سے محمد بن جعفر کوفی اسدی نے روایت کی اور کہا: ہم سے محمد بن اسماعیل برمکی نے روایت کی اور کہا: ہم سے عبداللہ ابن احمد نے بیان کیا اور کہا: ہم سے اسماعیل بن فضل نے بیان کیا اور انھوں نے ثابت ابن دینار ثمالی سے اور انھوں نے سید العابدین علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام سے روایت کی ہے:

میں نے مذکورہ سند سے آگاہ ہونے کے لئے رجال شیعہ کے قدیم ترین منابع، جو کہ اصل اربعہ رجالیہ کے نام سے مشہور ہے، اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن علی ابن احمد بن موسیٰ کا ذکر رجال کی کتابوں میں نہیں ہے اس لئے اس سند کو مجہول قرار دیا گیا ہے۔ محمد بن جعفر اسدی کوفی ) کی رجال کی کتابوں میں توثیق کی گئی ہے۔

محمد بن اسماعیل برمکی، بھی موثق ہیں اور ممدوح ہیں اگرچہ ابن الغضائری نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن موثق قرار دینے والوں نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ جس میں ان کی توثیق ہوئی ہے۔

عبداللہ بن احمد نام کے کئی آدمی ہیں، رجال و حدیث کے ماہر و محقق جناب علی اکبر غفاری نے یہ احتمال دیا ہے کہ ہوسکتا ہے عبداللہ بن احمد رازی مراد ہوں۔ عبداللہ بن احمد رازی بھی قابل اعتماد ووثوق نہیں تھے۔ خواہ اس سند میں عبداللہ بن احمد رازی مراد ہوں یا یہ نام چند آدمیوں کے درمیان مشترک ہو کہ ممکن ہے ان میں سے بعض ضعیف اور بعض ثقہ ہوں۔ عمل میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ جب تک حدیث کے سلسلۂ روات میں سب ثقہ نہیں ہوتے اس وقت تک اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

سلسلۂ سند میں جوآخری فرد ہے اس کی بھی تحقیق ہونی چاہیے اور وہ ابوحمزہ ثمالی یا ثابت بن ابی صفیہ ہے یہ پاک اورآزادمنش آدمی تھے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان کی دیانت داری ہی ہے کہ اس تاری اور پر آشوب دور میں ان کے تین بیٹوں نے زید بن علی کے پرچم انقلاب کے سایہ میں شہادت پائی تھی ان کے بارے میں نجاشی تحریر کرتے ہیں :

ان کے بیٹے نوح و منصور اور حمزہ تینوں نے زید کے ساتھ شہادت پائی خود انھوں نے جناب امیر المومنین ؑ امام حسین ؑ اور امام زین العابدین ؑ کو درک کیا تھا، وہ ان مقدس ہستیوں کی حدیث نقل کرنے میں قابل اعتماد اور معتبر صحابی تھے اور آپ کے بہترین مددگار تھے۔ حضرت سید الشہداء سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے ان کے متعلق فرمایا: ابوحمزہ اپنے زمانہ میں ایسے ہی تھے جیسے اپنے زمانے میں سلمان تھے۔

## تحقیق سند کا نتیجہ:

رجال حدیث کی تحقیق اور ان کی چھان پھٹک کے سلسلہ میں جناب سپہری اس طرح لکھتے ہیں :

اس حدیث کے صحیح ہونے،اور یہ کہ ہر امام کی زبان سے صادر ہوئی ہے پر چند دلیلوں کے ذریعہ اعتماد کیا جاسکتا ہے اور وہ دلیلیں یہ ہیں :

۱۔ مرحوم قہپائی مجمع الرجال (ج ۷ ص ۲۱۹) میں لکھتے ہیں : مرحوم شیخ صدوق کے اجازۂ شیوخ میں وہ لوگ ہیں کہ کتب رجال میں نہ ان کی مدح ملتی ہے نہ مذمت۔ لیکن شیخ صدوق ؒ ان کا نام لکھنے کے بعد رضی اللہ اور رحمۃ اللہ لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صدوقؒ ان کے ایمان و صداقت اور ان کی وثاقت پر اعتماد رکھتے تھے ورنہ وہ ان کے ناقابل اعتماد ہونے اور فاسد العقیدہ ہونے کی تصریح کرتے چہ جائیکہ ان کے لئے خدا کی رضا و رحمت کی دعا کرتے۔

۲۔ من لا یحضرہ الفقیہ کے مقدمہ میں شیخ صدوقؒ رقم طراز ہیں :

اس کتاب کی تالیف سے میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں دوسرے راویوں اور مصنفین کی مانند جو روایت بھی مل جائے اسی کو کتاب کی زینت بنا دو بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب میں ایسی روایات جمع کروں جن کے ذریعہ میں فتویٰ دوں اور یہ فیصلہ سنا سکوں کہ یہ صحیح ہیں میراتو عقیدہ یہ ہے کہ یہ میرے اور میرے پروردگار کے درمیان حجت ہے۔

۳۔ اس بات کو پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ بہت سے بزرگوں نے اپنی معتبر کتابوں میں اس رسالہ کو نقل کیا ہے اور یہ عرصۂ دراز سے علماء کی توجہ کا مرکز رہا ہے، علماء کااس قبول کرنا اور مرحوم صدوقؒ کے نقل کرنے پر ان کا اعتماد کرنا اس رسالہ کوقبول کرنے کی دلیل ہے۔

۴۔ آیت اللہ العظمیٰ بروجردی مرحوم۔ جو کہ رجال میں مہارت رکھتے تھے۔ ان راویوں کے بارے میں، کہ جن سے صدوقؒ مرحوم نے اس رسالہ کو نقل کیا ہے، اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں :

لیکن وہ رسالۃ الحقوق جس کی حضرت زین العابدین علی بن الحسین سلام اللہ علیہ سے روایت کی گئی ہے۔ اس کے راویوں میں سے اسمٰعیل بن فضل ہاشمی نوفلی ہیں جو نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کی اولاد سے ہیں یہ بصرہ کے محدثین میں سے تھے اور موثق ہیں،ثابت بن دینار ابوحمزہ ثمالی ہیں یہ بھی موثق ہیں اور حسین بن صدوق کی سند یہ ہے جعفر بن محمد بن قولویہ سے اور انھوں نے حسین بن محمد عامری سے، جو کہ کلینی کے شیوخ میں سے ہیں، اور انھوں نے اپنے چچا عبداللہ بن عامر سے اور عبداللہ بن عامر نے محمد بن ابی عمیر سے اور محمد بن ابی عمیر نے عبدالرحمٰن بن محمد سے اور انھوں نے فضل بن اسمٰعیل بن فضل سے اور انھوں نے اپنے والد اسمٰعیل بن فضل سے روایت کی ہے اور سند موثوق بہ ہے۔

سپہری صاحب آخر میں تحریر فرماتے ہیں :

مذکورہ دلیلوں اورقرائن کے علاوہ، علماء اسلام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ اخلاق و معارف اور مستحبات سے متعلق احادیث کو قبول کرنے میں سند کے مسئلہ میں تسامح سے کام لیتے ہیں یہ اصل، تسامح اولۂ سنن میں، مشہور ہے ایسی حدیثوں کو قبول کرنے کے لئے ان کے مضمون کو بلند ہونا چاہیے، اصول و عقائد اور مذہبی و عقلی مسلمات کے منافی نہیں ہونا چاہیے اور رسالۃ الحقوق میں یہ خصوصیات موجود ہیں۔

مولف کہتا ہے : ہم نے رسالۃ الحقوق کی اس شرح میں دو اعتبار سے، تحف العقول کا متن رکھا ہے:

۱۔ تحف العقول، ان کتابوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے جن میں رسالۃ الحقوق نقل ہوا ہے۔ اگرچہ تحف العقول کے مولف نے اس کی سند نقل نہیں کی ہے کیونکہ تمام کتابوں میں انھوں نے حذف سند کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

2۔ مولف نے ان کتابوں کی بہ نسبت کہ جن میں یہ رسالہ نقل ہوا ہے تما م کتابوں سے زیادہ مفصل اور جامع عبارتیں نقل کی ہیں۔

زیادہ تر حقوق کے ذیل میں ہم نے ان عبارتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو مکارم الاخلاق میں بعبارت دیگر نقل ہوئے ہیں اور، حج کے حق کو جو کہ تحف العقول کے متن میں بیان نہیں ہوا ہے، ہم نے مکارم الاخلاق سے ہی نقل کیا ہے اور اس شرح میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ جن پچاس حقوق کو امام زین العابدین ؑ نے خلاصہ کے طور پر بیان فرمایا ہے آیات و روایات کے ذریعہ ان کی اتنی وضاحت کردی جائے کہ جس سے کتاب کا حجم زیادہ نہ ہو جن حقوق میں کوئی لغوی شکل تھی تو اس کو ہم نے لغت ہی کے اعتبار سے حل کیا ہے۔ اس شرح کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ رسالۃ الحقوق میں زیادہ تر اخلاقی پہلو ہیں لیکن ہم نے ممکن حد تک اس کے فقہی حقوق کو بھی بیان کردیا ہے تاکہ قاری حقوق کے سلسلہ میں دین اسلام کی جامعیت کو اچھی طرح سمجھ لے۔

امیدہے کہ امام سجاد ؑ حقیر کی طرف توجہ فرمائیں گے، اپنی عنایات میں مجھے بھی شامل فرمائیں گے اور میری خطاؤں کو معاف فرمائیں گے اور خداوند عالم سے میرے لئے دعا فرمائیں گے کہ وہ مجھے اہل بیت معصوم ؑ کے دین ومکتب کے خدمتگاروں میں قرار دے۔

# دیپاچہ

؟؟؟

جان لو کہ تمہارے اوپر بزرگ و برتر خدا کے کچھ حقوق ہیں خواہ انھیں تم حرکت و جنبش میں انجام دویا سکون و آرام میں، اس منزل میں جس میں تم اترے ہو، یا اس عضو کے ساتھ جس کو تم نے بدلا ہے یا ان اقدار کے ساتھ جس کو بروئے کار لائے ہو، ان حقوق میں سے بعض، بعض حقوق سے بڑے ہیں۔

تمہارے اوپر خدا کے بڑے حقوق وہ ہیں جو اس نے اپنے لئے تمہارے اوپر واجب کئے ہیں۔ اس کے بعد بدن کے اعضاء کو مدنظر رکھتے ہوئے سر سے پیر تک کے لئے کچھ حقوق واجب کئے ہیں، کچھ حقوق تمہاے اوپر تمہاری آنکھ کے ہیں اور تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہارے کان کے ہیں، تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہاری زبان کے ہیں، تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہارے ہاتھ کے ہیں، تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہارے پیر کے ہیں، تمہارے اوپرکچھ حقوق تمہارے شکم کے ہیں، تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہاری شرم گاہ کے ہیں، یہ سات اعضاء ہیں کہ جن سے اعمال انجام پذیر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد خداوند عالم نے تمہارے اوپر تمہاے اعمال و افعال کے حقوق رکھے ہیں چنانچہ تمہاری نماز، روزے اور تمہاری زکوٰۃ کا تمہارے اوپر حق ہے اور دیکھو تمہارے کاموں کے بھی تمہارے اوپر کچھ حقوق ہیں۔

اب تم اپنیجسم و جان سے باہر نکلو اور جن ے حقوق تمہارے اوپر ہیں ان کیطرف جاؤ، ان حقوق میں سے واجب ترین حق تمہارے ائمہ کا ہے اس کے بعد تمہاری رعیت کا ہے اور پھر تمہارے رشتہ داروں کاحق ہے۔ اور انھیں حقوق سے دوسرے حقوق کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

تمہارے اوپر تمہارے ائمہ کے تین حق ہیں، پھر ان میں سے تمہارے اوپر واجب ترین حق اس شخص کا ہے جو تمہارے اوپر سیاسی غلبہ وبرتری رکھتا ہے اور جس کے ہاتھ میں تمہارے امور کی باگ ڈور ہوتی ہے اور اس کے بعد اس شخص کا حق ہے کہ جس کے اختیار میں تمہارا علمی نظم و نسق ہوتا ہے، پھر اس شخص کا حق ہے کہ جس کے اختیار میں ملکی نظام ہے اور ہر نظم و نسق امام کے اختیار میں ہے۔

تمہارے اوپر تمہارے ماتحتوں کے بھی تین حقوق ہیں، ان میں سے واجب ترین حق اس کا ہے جو تمہاے زیر تسلط ہے پھر ان لوگوں کا حق ہے جو تمہارے علم کے زیر تسلط ہیں بیشک جاہل عالم کی رعیت ہے۔ پھر ان کا حق ہے جو ملک کے لحاظ سے تمہارے زیر تسلط ہیں جیسے عورتوں، غلاموں اور کنیزوں کا حق۔

عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق تمہارے اوپر بہت زیادہ ہیں جو ایک دوسرے سے اتنے ہی متصل ہیں جتنا رحم میں قربت ہے تمہارے ان کے درمیان، تمہارے اوپر تمہاری ماں کا واجب ترین حق ہے، پھر تمہاے باپ کا حق ہے اس کے بعد اولاد کا حق ہے۔ پھر تمہارے بھائی کا حق ہے جو جتنا قریب ہے اس کا اتنا ہی حق ہے۔ جو اول ہے وہی اول ہے۔

اس کے بعد تمہارے آزاد کرنے والے اور تمہارے ولی نعمت کا حق ہے پھر اس مولا کا حق ہے جس کی نعمتیں ابھی تک جاری ہیں اس کے بعد ان لوگوں کا حق ہے جنھوں نے تمہارے ساتھ نیک سلوک کیا ہے۔ پھر اس مؤذن کا حق ہے جو تمہیں آواز اذان سے نماز کی طرف متوجہ کرتا ہے اس کے بعد پیش نماز کا حق ہے، پھر تمہارے ہم نشین کا حق ہے اس ے بعد تمہارے ہمسایہ کا حق ہے اس کے بعد تمہاے ہم سفر و ہمراہ کا حق ہے، پھر تمہارے شریک کا حق ہے اس کے بعد تمہارے مال کا حق ہے، پھر تمہارے مقروض کا حق ہے۔ پھر تمہارے رفیق کا حق ہے اس کے بعد تمہارے دشمن کا حق ہے جس نے تمہارے خلاف دعویٰ کیا ہے اس کے بعد اس شخص کا حق ہے جو تمہیں مشورہ دیتا ہے اور پھر اس شخص کا حق ہے جو تم سے وعظ و نصیحت کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔

اس کے بعداس کا حق ہے جو تم سے بڑا ہے، پھر اس کا حق ہے جو تم سے چھوٹا ہے، پھر تم سے سوال کرنے والے کا حق ہے اس کے بعد اس شخص کا حق ہے جس سے تم سوال کرتے ہو، پھر اس کا حق ہے جس پر تمہاری طرف سے زیادتی و بد سلوکی ہوئی ہے خواہ قول سے ہوئی ہو یا فعل سے یا اس کا مذاق اڑانے سے یا تمہارے قول و فعل کا اس نے مذاق اڑایا ہو۔ جان بوجھ کر ایسا کیا ہو یا غفلت کی وجہ سے۔ پھر تمہارے اوپر تمہاے ہم مذہب لوگوں کا حق ہے۔ اس کے بعد تمہارے اوپر اس کافر ذمی کا حق ہے، جو اسلام کی پناہ میں زندگی بسر کررہا ہے۔پھر وہ حقوق ہیں جو زندگی کے اسباب بدلنے سے وجود پذیر ہوتے ہیں، پس خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی خدا نے ان حقوق کی ادائیگی میں مدد کی جو اس پر واجب کئے تھے اور اس سلسلہ میں اس کوتوفیق دی اور اسے ثابت قدم رکھا۔

یہاں تک حضرت علی ابن الحسین علیہما السلام نے ان تمام حقوق کے بارے میں ایک مقدمہ برأت واستہلال کے عنوان سے بیان کیا ہے کہ جن کو بعد میں تفصیل سے بیان فرمائیں گے۔ اور اولین حق خدا کا حق قرار دیا ہے۔ خداوند عالم سے دعا ہے ہ ان پر اس طرح عمل ہو کہ جیسی اس کی رضا ہے۔

## خدا کا حق

خدا کا حق جو کہ تمام حقوق سے بڑا ہے وہ یہ کہ تم اسی کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دو۔ جب تم خلوص کے ساتھ اس ی عبادت کروگے تو خدا نے بھی اپنے اوپر یہ لازم کرلیا ہے کہ وہ دنیوی اور اخروی چیزوں میں تمہاری کفایت کرے گا اور تمہاری لئے تمہاری محبوب و پسندیدہ چیزوں کو محفوظ رکھے گا۔

## بعثت انبیاء کا مقصد:

انبیاء کی اہم ترین ذمہ داری یہ تھی کہ وہ لوگوں کو عبادت کی طرف بلائیں اور ہر قسم کے شرک سے جنگ کریں۔ ارشاد ہے: ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا تاکہ وہ امت کو خدا کی عبادت کرنے کا حکم دے اور اسے طاغوت و سرکش سے بچتے رہنے کی تلقین کرے ان میں سے بعض کی تو خدا نے ہدایت کردی ہے اور بعض پر گمراہی و ضلالت مسلط ہوگئی ہے، زمین پر چلو، پھر واوردیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

اس آیت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی ذمہ داری یہ تھی کہ لوگوں کو خدا کی عبادت کی طرف دعوت دیں، ہر قسم کے شر ک سے جنگ کریں اور ان دونکں کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور اپنے فریضہ کو بہترین طریقہ سے انجام دیں، لوگوں کو بتوں، چاند سورج اور گائے وغیرہ کی پرستش سے روک کر خدا کی عبادت کی طرف بلائیں۔

## خدا کی عبادت فطری ہے:

خدا کی عبادت کرنا اور اس کی بارگاہ میں خضوع کرنا انسان کی فطرت کا جز ہے۔ فطرت کے ایک معنی سرشت بھی ہیں جس کو انسان کے وجود و طبیعت کا جز کہا جاتا ہے اور سارے انسانوں میں وضاحت کے ساتھ نمایاں ہے اس سلسلہ میں رسول ؐ فرماتے ہیں : ہر بچہ فطری طور پر خدا پرست پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ جو اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ ہر انسان فطری اور ذاتی طور پر خداپرستی کی طرف مائل ہوتا ہے اس میلان کو انھوں نے میل عالی کا نام دیا ہے وہ کہتے ہیں : جس طرح انسان حقیقت جوئی کی طرف مائل ہے چنانچہ علم و حکمت اور فلسفہ کے حصول کا شوق سرچشمہ بھی یہی ہے، یعنی انسان فطری طور پر حقیقت کو پہچاننے کی طرف مائل ہے اور حقیقت شناشی کا میلان اس کے اندرز بچپنے سے شروع ہوتا ہے اور عمر کے آخر تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے یہ حقیقت جوئی ہی کا جذبہ ہے جو اسے والدین سے عجیب و غریب قسم کے سوالات کرنے پر ابھارتا ہے وہ تمام چیزوں کی خلقت اور ان کے وجود میں آنے کے اسباب و علل کو جاننا چاہتا ہے، جس طرح وہ اخلاقی فضائل کی طرف میلان رکھتا ہے اسی طرح وہ نیکی، احسان کرنے اور صدقہ دینے میں بھی لذت محسوس کرتا ہے، حسن و خوبصورتی کی طرف بھی میلان رکھتا ہے خواہ وہ معنوی و مادی اور اخلاقی ہو، اس رجحان و تمایل کو ثابت کرنے ک یلئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح انسان کے اندر کمال مطلق، علم مطلق، جمال مطلق اور کمالات کے سر چشمہ کی طرف میلان و رجحان ہوتا ہے اور یہی چیز اسے خدا تک پہونچا دیتی ہے، اس سلسلے میں دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے۔ فطری طور پر انسان کے خدا کی طرف مائل ہونے کے بارے میں قرآن کہتا ہے :

تم اپنی توجہ دین حنیف پر مرکوز کرلو کہ یہی خدا پرستی کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے یہی سیدھا سچا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

اس آیت میں جو لفظ دین استعمال ہوا ہے اس کو درج ذیل دو منی میں سے کسی ایک معنی میں استعمال کیا جاسکتا ہے:

۱۔ دین کے بنیادی و اصلی احکام آدمی کی سرشت کے مطابق و ہم آہنگ ہیں۔

۲۔ خدا کی طرف میلان اور اس کے لئے سراپا تسلیم ہونے ہی کو اسلام کہتے ہیں، جو اس صفت سے متصف ہوجائے اس کو مسلمان کہتے ہیں۔ بنا بر ایں یہ کہا جاسکتا ہے : دین کے فطری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان کی سرشت و فطرت میں خدا پرستی اور اس کے احکام کو تسلیم کرنے کا میلان پیدا کردیا گیا ہے۔ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب ؑ نہج البلاغہ کے خطبۂ اول میں اس فطرت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

پھر خدا نے ان کے درمیان رسول بھیجے اور پے در پے انبیاء آئے تاکہ وہ ان سے فطرت کے عہد و معاہدہ کو پورا کرائیں۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں : کلمۂ توحید و اخلاص ہی انسان کی فطرت ہے۔

## مصائب میں خدا سے پناہ مانگنا فطری بات ہے

جو چیز فطری ہے اس کے اثبات کے لئے اگرچہ دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن بعض لوگ جاہ و منصب کے نشہ میں مست ہوکر اپنے معبود کو بھول جاتے ہیں اور ان کے ذہن پر نسیان و فراموشی کے پردے پڑجاتے ہیں اور وہ پھر کسی حادثہ کے واقع ہونے سے یک بیک غفلت و فراموشی کی تاریکی سے باہر نکل آتے ہیں اور اپنے معبود کی طرف متوجہ ہوجاتے خدا کی طرف دست دعا بلند کرتے ہیں ان کے اس فعل سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ یہ خدا کی طرف تمایل ان کی فطرت ہے۔ جس پر غفلت کی گرد پڑگئی تھی چنانچہ جیسے ہی غفلت کی گرد برطرف ہوئی وہ خدا کی طرف متوجہ ہوگئے۔

منقول ہے کہ ایک شخص امام صادق ؑ کی خدمت میں شرف یاب ہوا اور بڑے ہی تعجب خیز انداز میں معرفت خدا کے بارے میں گفتگو کرنے لگا اور عرض کی: میں نے بڑے سے بڑے عالم سے بحث کی ہے لیکن کوئی بھی مجھے تحیر سے نجات نہیں دلا سکا امام صادق ؑ نے راہ فطرت ہی کے ذریعہ اسے اس کے تحیر سے نجات دلائی اور اس سے فرمایا: کیا تم نے کبھی کشتی سے سفر کیا ہے؟ دریا کا سفر کیا ہے؟ اس نے کہا:ہاں۔ آپ ؑ نے فرمایا : کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کشتی ٹوٹ گئی ہو اور تم نے کسی ٹوٹے ہوئے تختہ کا سہارا لیا ہو اور موجوں میں پھنس گئے ہو؟ اس نے کہا ہاں : ایسا ہوا ہے آپ نے فرمایا:

تمہیں وہاں نہ خشکی نظر آتی تھی اور نہ کوئی نجات دلانے والا دکھائی دیتا تھا! کیا اس وقت تم تہ دل سے کسی ایسی طاقت کی طرف راغب ہوئے تھے جو تمہیں نجات دلائے؟اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: وہی خدا ہے، آپ کی اس گفتگو سے اسے تحیر سے نجات مل گئی۔

انسان کا خدا کی طرف مائل ہونا فطری بات ہے اور سارے انبیاء اسی فطرت کو نکھارنے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔

امام زین العابدین ؑ نے جس چیز کو سب سے بڑا حق قرار دیا ہے: وہ ہے خدا کی عبادت کرنا اور شرک سے بچنا، بحث کے آغاز میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی طور پر عبادت کے لغوی بیان کردیئے جائیں۔ اس کے بعد یہ بیان کیا جائے گا کہ اسلام نے کن چیزوں کو عبادت قرار دیا ہے، شرک کیا ہے اور اس کے کتنے درجے ہیں۔

## عبادت کے لغوی معنی

مشہور لغت شناس راغب اصفہانی عبودیت اور عبد کے معنی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں : ’’ عبودیت ‘‘ کے معنی ہیں خود کو ذلیل و حقیر سمجھنا۔لیکن عبادت اس سے زیادہ بلیغ ہے اور چونکہ عبادت خود کو نہایت ذلیل و حقیر سمجھنا ہے لہٰذا اس عبادت کا مستحق وہی ہوسکتا جو سارے صفات کمالیہ و جمالیہ کا حامل اور ساری نعمتوں کا مالک ہو اور وہ خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، اسی لئے یہ عبادت اس سے مخصوص ہوگئی ہے پھر لکھتے ہیں ’’ عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔عبادت بالتسخیر جیسا کہ سجود میں ذکر ہوا ہے یعنی کوئی موجود خود کو خدا کے قابو او اس کی تسخیر میں سمجھے اور اپنے وجود کو اس کی مخلوق تصور کرے۔ دوسری قسم، عبادتِ اختیاری ہے جو کہ صاحبان نطق و فہم کے لئے ہے آیات میں جس عبادت کا ذکر ہوا ہے وہ یہی اختیاری عبادت ہے جس کو انسان اپنے اختیار و ارادہ کے ساتھ بجالاتا ہے۔

واضح رہے کہ عبادت و اطاعت کے درمیان فرق ہے عبادت خدا سے مخصوص ہے جب کہ اطاعت کا اطلاق خدا کے غیر پر بھی ہوتا ہے مثلاً والدین یا شوہر کی اطاعت۔

## قرآن میں عبد کے معنی

عبد: قرآن میں دو معنی میں استعمال ہوا ہے: ایک غلام و مملوک۔ جیسا کہ خدا وند عالم کا ارشاد ہے:

قتل کے سلسلہ میں تم پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ آزاد کے عوض آزاد اورغلام کے بدلے غلام اور عورت کے قصاص میں عورت (قتل کی جائے گی)

خدا نے اس مملوک غلام کی مثال دی ہے جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا ہے۔

نیز فرماتا ہے: آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز نہیں ہے مگر یہ کہ وہ رحمان (خدا) کی بندگی میں اس کی طرف آئے گی۔

اقرب الموارد میں مرقوم ہے: عبد انسان ہی کو کہا جاتا ہے خواہ وہ آزاد ہو یا غلام۔ عبد کے دوسرے معنی خدا کے عبادت گذار اور اس کے مطیع کے ہیں۔ خدا وند عالم کا ارشاد ہے:

اے ان لوگوں کی اولاد کہ جن کو ہم نے نوح کے ساتھ ان کی کشتی میں سوار کیا یہ جان لو کہ وہ شکر گذار (عبد) بندے تھے۔

پاک ہے وہ خدا کہ جس نے اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ کی سیر کرائی اور ہمارے بندے ایوب کا بھی ذکر کیجئے کہ جب انھوں نے اپنے رب کو پکارا۔

ان آیتوں میں ’’ عبد ‘‘ شائستہ اور خدا کے مطیع انسان کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور حضرت نوح و ایوب اور رسول ؐ، خدا کے شائستہ ترین بندے ہیں۔

خدا کی عبادت دو طرح کی جاتی ہے ایک حلال و حرام سے متعلق اس کے احکام کی اطاعت کر کے یہ ایک قسم کی طاعت و فرمانبرداری ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

میری عبادت کرو اور میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔

میں نے جناتوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو ایک ہی مطمح نظر سے خدا کی عبادت کرتے ہیں (شک و تردد کی حالت میں عبادت کرتے ہیں ) اگر اسے مال یا کوئی خیر ملتی ہے تو اسے اطمینان ہوتا ہے اور اگر کسی امتحان و آزمائش سے گذرتا ہے تو روگردانی کرتا ہے اور دنیا و آخرت میں خسارہ اٹھاتا ہے اور یہ کھلا نقصان ہے۔

قوی احتمال یہ ہے کہ آخری دو آیتوں میں لفظ عبد مطیع و فرمانبردار کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عبادت کے ایک معنی اس تذلل کے ہیں جس کے ساتھ تقدس ہوتا ہے یعنی بندہ خدا کے حضور میں بے پناہ خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اسے ہر نقص و عیب سے پاک سمجھتا ہے اور اسے تمام کمالات کا مالک جانتا ہے چنانچہ جب اسلام میں عبادت خدا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسلام انسان کو خدا کے علاوہ ہر موجود کی عبودیت و بندگی سے روکتا ہے خصوصاً مالداروں، بادشاہوں اور سرکشوں کی بندگی سے منع کرتا ہے اسلام کہتا ہے نفع و ضرر خدا کے ہاتھ میں ہے اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر نہیں ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

اے رسول کہدیجئے کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے نفع و ضرر کا مالک نہیں ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تم لوگ خدا کے غیر کی عبادت کرتے ہو وہ تمہارے رزق کے مالک نہیں ہیں تم اپنا رزق خدا سے طلب کرو۔

اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو کہ جس نے تم کو اور تم سے پہلے والوں کو پیدا کیا ہے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔

## عبادت اسلام کی نظر میں

اسلام میں کس چیز کو عبادت کہا جاتا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں کسی مخصوص چیز کوعبادت نہیں کہا جاتا بلکہ عبادت ایسا تناور درخت ہے کہ جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ مختلف قسم کے اعمال کو عبادت کہا گیا ہے ان میں سے بعض درج ذیل ہیں :

## ۱۔ شکر عبادت ہے

قرآن کی بہت سی آیتوں میں شکر کو عبادت کہا گیا ہے لیکن پہلے یہ بیان کردیا جائے کہ شکر کی تعریف کیا ہے اس کے بعد ان آیات کو بیان کیا جائے گا جن میں شکر کو عبادت کہا گیاہے، علماء کہتے ہیں : شکر ایک فعل ہے کہ جس نے نعمت دینے والے کی تعظیم و تکریم آشکار ہوتی ہے یہ خواہ زبان سے ہو یا دلی محبت سے۔

کسی نعمت کو اس موقع محل پر صرف کرنا بھی شکر ہے۔ اگر انسان ہر نعمت کو اس کے موقع محل پر خرچ کرے تو اس نے اس کا شکرادا کردیا مثلاً آنکھ نعمت ہے اور اس کا شکریہ ہے کہ اس سے خدا کی نشانیوں کو دیکھا جائے۔ قرآن کہتا ہے: اے رسول آپ کہدیجئے : دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیسی نشانیاں ہیں۔

حضرت علی ؑ نہج البلاغہ کے خطبۂ متقین میں فرماتے ہیں : متقین اور پرہیز گاروں نے خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے آنکھیں بند کرلی ہیں اوراپنے کانوں کو مفید علم (کو سننے) کے لئے وقف کردیا ہے۔

دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں :ہر نعمت کا شکر، ورع و پاکدامنی اور خدا کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب ہے۔

انسان کو جو نعمتیں عطا کی گئی ہیں انھیں گناہوں میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

## راہنمائی اور تربیت میں شکر کا اثر:

آج کے دانشوروسائنسداں شکر وسپاس تربیت و راہنمائی کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں ذمہ دار اور زحمت کش و محنتی افراد کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے کیونکہ اگر ذمہ دار افراد کی زحمتوں کی قدر نہیں کی جائے گی تو ان کا حوصلہ پست ہوجائے گا اور پھر وہ ذمہ دای اور دلچسپی کے ساتھ کوئی کام انجام نہیں دیں گے۔

اس سلسلہ میں حضرت علی ؑ فرماتے ہیں :

اے مالک! نیک و بد کو تمہاری نظر میں یکساں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اگر ایسا کروگے تو نیک منش افراد نیکی سے بے رغبت ہوجائیں گے اور گناہگاروں کی گناہ کرنے میں جرأت بڑھ جائے گی۔

خدا وند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی مانند قرار دیدیں ؟ تمہیں کیا ہوگیا؟ تم کیسا فیصلہ کررہے ہو۔

یہ استفہام انکاری ہے یعنی ہم کبھی ایسا نہیں کریں گے۔

## شکر، علمائے اخلاق کی نظر میں

علمائے اخلاق کہتے ہیں :

شکر کے تین اجزا ہیں :

۱۔ نعمت اور نعمت دینے والے کی معرفت

۲۔ انفعال نفسانی یعنی نیکی کرنے والے کے سامنے جھکا جاتا ہے اور نعمت ملنے پر خوشی ہوتی ہے۔

۳۔ نعمت دینے والے کے مقصد کو پورا کرنا۔

نعمت کی معرفت کے سلسلہ میں جعفر صادق ؑ فرماتے ہیں :

جس شخص کو خدا نے کوئی نعمت عطا کی اور اس نے اس کو تہہ دل سے پہچان لیا تو اس نے اس کا شکر ادا کردیا۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں : شکر کا آخری زینہ یہ ہے کہ نعمت پانے والا یہ سمجھ لے کہ یہ نعمت خدا کی طرف سے ہے۔

نعمت اور چاپلوسی کے بارے میں حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : کسی شخص کی لیاقت و شائستگی سے زیادہ تعریف کرنا چاپلوسی ہے اور شائستگی کی تعریف نہ کرنا عجز یا حسد ہے۔

خدا نے اپنی نعمتوں کے شکر کو عبادت قرار دیا ہے۔

اگر تم خدا کی عبادت کرنا چاہتے ہو تو اس کا شکر ادا کرو۔

بلکہ خدا کی عبادت کرو اور اس کے شکر گذار بندوں میں ہوجاؤ۔

مذکورہ دونوں آیتوں میں خدا یہ فرماتا ہے کہ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا عبادت ہے، اور خدا کو ماننے والے عظیم لوگ ایسا ہی کرتے ہیں چنانچہ فرماتا ہے:

جب تم سواری پر سوار ہوتو اپنے پروردگار کی نعمتوں کو یاد کرو اور یہ کہو۔ پاک ہے وہ خدا کہ جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کردیا حالانکہ ہم اس پر قادر نہ تھے۔

حضرت سلیمان خدا سے شکر ادا کرنے کی توفیق طلب کرتے ہیں :

اے اللہ جو نعمتیں تو نے مجھے اور میرے والد کو دی ہیں مجھے ان کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔

## ۲۔ رزق فراہم کرنا بھی عبادت ہے

جن چیزوں کو اسلام میں عبادت قرار دیا گیا ہے ان میں سے حلال کمائی بھی ہے اور نیت سے روزی تلاش کرنا بھی عبادت ہے کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

جب تم نماز(جمعہ) سے فارغ ہوجاؤ تو روئے زمین پر پھیل جاؤ اورخدا کے فضل سے روزی تلاش کرو اور خدا کا ذکر زیادہ کرو ہوسکتا ہے اس طرح تم کامیاب ہوجاؤ۔

’’فضل خدا طلب کرو‘‘یہ قرآن مجید میں زیادہ تر روزی طلب کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مفہوم اس سے وسیع ہے اور کمائی و کوشش بھی اسی کا مصداق ہے چنانچہ بعض لوگوں نے اس جمعہ کے بارے میں لکھا ہے:

نماز جمعہ کے بعد روزی تلاش کرنے میں برکت ہے: روایت میں بیان ہوا ہے کہ رسول نماز جمعہ کے بعد بازار تشریف لے جاتے تھے۔

درج ذیل روایات بھی رزق حاصل کرنے کو عبادت قراز دیتی ہیں :

امام محمد باقر ؑ نے رسول ؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: عبادت کے ستر جز ہیں ان میں سب سے افضل حلال رزق حاصل کرنا ہے۔

اسی سلسلہ میں ابو حمزہ نے امام محمد باقر ؑ سے روایت نقل کی ہے:

جو شخص لوگوں سے بے نیاز ہونے اور ان کی نظر میں معزز ہونے کے لئے دنیا طلب کرتا ہے اور اس طلب دنیا کو وہ اپنے اہل و عیال کے لئے وسعت و فراخی کی کوشش اور ہمسایوں کے لئے مدد سمجھتا ہے تو روز قیامت وہ خدا سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودہویں کے چاند کی مانند درخشاں ہوگا۔

## محنت کرتے ہوئے مرجانا:

جناب محمد بن یعقوب کلینی نے ایک روایت میں علی بن ابراہیم سے اور انھوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے اور دوسری سند سے محمد بن اسمعیل سے انھوں نے فضل بن شاذان سے اور انھوں نے ابن ابی عمیر سے اور انھوں نے عبداللہ بن حجاج سے انھوں نے امام جعفر صادق ؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: محمد بن منکدر کہتا تھا : میں یہ نہیں سوچتا تھا کہ علی بن الحسین نے محمد بن علی کو صحیح جانشین مقرر کیا ہے۔ایک روز میں نے یہ طے کیا کہ میں اس سلسلہ میں انھیں نصیحت کرونگا لیکن انھوں نے ہی مجھے نصیحت کردی، محمد بن منکدر کے دوستوں نے معلوم کیا ! انھوں نے تمہیں کیا نصیحت کی ہے؟ اس نے کہا : میں گرمی کے موسم میں دوپہر کے وقت مدینہ کی گلی کوچوں سے گذرتا ہوا مدینہ سے باہر نکل گیا، یہاں تک کہ میری ملاقات محمد باقر ؑ سے ہوگئی فربہ بدن تھے دو غلاموں کے ساتھ کام میں مشغول تھے، میں نے سوچا کوئی قریش کا بزرگ کام کررہا ہے، یہ ایسی گرمی ہیں دنیا کی حرص میں نکلا ہے، ابھی میں اسے نصیحت کرتا ہوں۔

میں نزدیک گیا، سلام کیا، آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا، میں نے عرض کیا: ایسی گرمی میں قریش کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ دنیا طلبی میں مشغول ہے ؟ ! اگر آپ کو اس حال میں موت آجائے تو کیا ہوگا؟!

آپ نے جواب دیا : اگر ملک الموت اس وقت میری روح قبض کرنے کے لئے آئے گا تو مجھے خدا کی اطاعت میں پائے گا میں اپنے اہل و عیال کے اخراجات پورا کرنے اور لوگوں سے بے نیاز ہون یککے لئے کام کررہا ہوں، ہاں اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ گناہ و معصیت کی حالت میں موت نہ آئے، میں نے عرض کی : اے فرزند رسول ؐ : آپ نے سچ فرمایا میں آپ کو نصیحت کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے مجھی کو نصیحت فرما دی۔

اس حدیث میں امام محمد باقر ؑ نے زندگی کو چلانے کے لئے جدو جہد کرنے کو خدا کی عبادت قرار دیا ہے۔ ایک روایت میں موسیٰ بن بکیر کہتے ہیں : حضرت ابوالحسن موسیٰ بن جعفر ؑ نے فرمایا: جو شخص اپنے اور اپنی اولاد کے لئے حلال طریقہ سے روزی فراہم کرتا ہے اس کی مثال اس مجاہد کی سی ہے جو راہ خدا میں جہاد کرتا ہے۔

## کوشش و کام کے ذریعہ خدا سے رزق طلب کرو۔

محمد بن علی بن الحسین نے اپنی سند سے فضیل بن یسار سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام صادق ؑ کی خدمت میں عرض کیا: فرزند رسول ؐ میں نے اب کوشش و کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آپنے فرمایا: ایسا نہ کرو بلکہ دوکان کھولو اور کاروبار شروع کرو اور خدا سے اپنی روزی و رزق طلب کرو۔

## محبت کرنے والے عابدوں کا درجہ:

روح بن عبدالرحیم نے امام صادق ؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے اس آیت ’’ رجال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ذکر اللہ ‘‘ ایسے مرد ہیں کہ انھیں تجارت اور خرید و فروخت یاد خدا سے باز نہیں رکھ سکتی ‘‘کے ذیل میں فرمایا: یہ لوگ کاروبار کرنے والے تھے لیکن نماز کے وقت کاروبار بند کردیتے تھے اور نماز کے لئے (مسجد) چلے جاتے تھے یہ لوگ ان عبادت گزاروں سے بہتر ہیں جو بیکار رہتے ہیں۔ ایسی روایات بہت زیادہ ہیں جو کام اور کوشش سے متعلق ہیں لیکن یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ واضح رہے کوئی بھی کام عبادت کے منافی نہیں ہے بلکہ اگر کام روزی و رزق سے متعلق ہو اور زندگی کے اخراجات چلانے کی غرض سے انجام دیا جارہا ہو تو وہ بجائے خود بہت بڑی عبادت ہے بلکہ بغیر کام کے عبادت کی کوئی قدروقیمت نہیں ہے پہلے انسان کی اقتصادی حالت صحیح ہونی چاہیے تاکہ وہ خلوص کے ساتھ عبادت کرسکے۔ امیر المومنین ؑ فرماتے ہیں : جس کے پاس زمین اور پانی ہے یعنی سینچائی کے اسباب ہیں اور وہ پھر اقتصادی پریشانی میں مبتلا ہوجاتا ہے تو خدا ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دور کردیتا ہے۔

رسول ؐ کے سامنے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا گیا جو زہد و تقویٰ میں شہرت یافتہ تھا اور ہر وقت نماز، روزہ میں مشغول رہتا تھا۔ اصحاب نے عرض کیا : اے اللہ کے رسول ؐ ہم نے اس سے بڑا عبادت گذار نہیں دیکھا۔ رسول ؐ نے فرمایا: اس کا کام کیا ہے ؟ عرض کیا : کوئی کام نہیں کرتا۔ رسول ؐ نے فرمایا : اس کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں۔ عرض کیا : اس کے اخراجات کو ہم پورا کرتے ہیں۔ آنحضرت ؐ نے فرمایا : تم ان سے بڑے عابد ہو۔

## ۳۔ دعا بھی عبادت کا مصداق ہے

دعا کے معنی پکارنے اور بلانے کے ہیں اور عبادت کے لوازم میں سے ہے کیونکہ دعا ہی خدا سے بندے کے رابطہ کا وسیلہ ہے اور چونکہ انسان کے راستے میں بے شمار حوادث ہیں اور وہ تمام مشکلوں کو حل کرنے پر قادر نہیں ہے لہٰذا اسے ایک سہارے کی ضرورت ہے اور وہ سہارا خدا ہے پھر دعا خدا کے تقرب کا وسیلہ ہے۔ خدا فرماتا ہے:

تمہارا پروردگار کہتا ہے تم مجھ سے دعا کرو میں قبول کرونگا جو لوگ میری عبادت سے رو گردانی کرتے ہیں۔ وہ ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہونگے۔

اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے ہ دعا مانگنا خدا کو پسند ہے وہ چاہتا ہے کہ اس سے دعا کی جائے اس نے دعا قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن وعدہ مشروط ہے مطلق نہیں ہے وہی دعا قبول ہوتی ہے جس میں ضروری شرائط پائے جاتے ہیں۔

دعا ایک قسم کی عبادت ہے کیونکہ آیت میں اس کے لئے عبادت ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو ان سے کہدیں کہ میں ان کے قریب ہی ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں ہوسکتا ہے وہ راہ راست پر آجائیں۔

اس آیت میں خداوند عالم نے سات مرتبہ اپنی طرف اور سات مرتبہ بندوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان سے اپنے قرب و ارتباط کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ دعا ایک قسم کا خضوع اور بندگی ہے اور جس طرح عبادتوں میں تربیتی اثر ہے ایسا ہی اثر دعا میں بھی ہے۔ اس آیت کی شان نزول کے بارے میں منقول ہے کہ ایک عرب رسول ؐ کی خدمت میں شرف یاب ہوا اور سوال کیا: کیا ہمارا خدا نزدیک ہے تاکہ ہم اس سے مناجات کریں یاد ور ہے کہ اسے پکاریں ؟رسول ؐ نے سکوت اختیار کیا جبریل نازل ہوئے اور مذکورہ آیت لائے۔

## دعا روحانی بیماریوں کا علاج ہے

مشکلوں میں مبتلا انسان کو آرام کہاں میسر آتا ہے اس کے لئے الجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں جن کو وہ درد دل کے ساتھ حل کر کے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے دعا ایک ایسا راستہ ہے کہ جس کے ضمن میں وہ اپنا درد نہاں مانگ کر کے شفا مانگ سکتا ہے۔

## شدائد میں خدا کی طرف متوجہ ہونے کا وسیلہ

انسان کی طبعیت کی افتاد یہ ہے کہ وہ خوش حال کی زندگی اور نعمتوں کی بہتات کے وقت خدا کو بھول جاتا ہے لیکن جب خود کو پریشانیوں میں گھرا ہوا دیکھتا ہ یتو اسے خدا یاد آجاتا ہے اور وہ خدا کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے : خدا فرماتا ہے:

جب ہم انسان پر نعمت نازل کرتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور ہم سے اپنی توجہ ہٹا لیتا ہے مگر جب اسے کوئی برائی چھو لیتی ہے تو اس سے نجات پانے کے لئے لمبی چوڑی دعا کرنے لگتا ہے۔

## دعا روایات کے آئینہ میں :

ایک حدیث میں رسول ؐ سے منقول ہے ’’ دعا عبادت ہے ‘‘ دوسری حدیث میں امام صادق ؑ سے مروی ہے کہ آپ ؐ کے ایک صحابی نے آپ ؐ سے سوال کیا: مولا دو آدمی ایک ساتھ مسجد میں آئے ایک نے زیادہ نماز پڑھی اور دوسرے نے زیادہ دعا کی ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ فرمایا: دونوں بہترین ہیں، اس نے عرض کیا :کون افضل ہے؟ امام نے فرمایا: جس نے زیادہ دعا کی ہے کیونکہ یہ بہت بڑی عبادت ہے۔

## ۴۔ بعض نظریں عبادت ہیں :

جو نگاہ انسان کی معرفت کا باعث ہوتی ہے یا جس سے عبرت حاصل ہوتی ہے وہ اسلام کے نقطۂ نظر سے عبادت ہے حضرت علی ؑ فرماتے ہیں :

محبت و عقیدت سے عالم، عادل حاکم اور والدین کے چہرہ کے طرف دیکھنا عبادت ہے اسی طرح اس بھائی کے چہرہ کو دیکھنا بھی عبادت ہے جس سے خدا کے لئے محبت کی ہے۔ واضح رہے کہ جب خدا کی رضا کے تحت دیکھا جائے گا تو وہ دیکھنا بھی عبادت ہوگا اور خدا اس عبادت کا ثواب عطا کرے گا۔

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : خدا کا حق یہ ہے کہ تم اس کی عبادت کرو یہ ساری عبادتوں کو شامل ہے اور خدا کے حق میں اس کا بڑا اثر ہے۔

## ہر حال میں عبادت

دین ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم ہر حال میں خدا کی عبادت کریں اور ہمیشہ خود کو خدا کے سامنے حاضر سمجیں غم و مسرت ناداری و مالداری اور صحت و تندرستی میں مختص یہ کہ بدلتے ہوئے حالات کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے چاہیے خدا کے بعض بندے صرف ایک لحاظ سے عبادت کرتے ہیں خدا نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے فرماتا ہے:

بعض لوگ صرف زبان سے خدا کی عبادت کرتے ہیں (ان کے دل میں محکم طریقہ سے ایمان راسخ نہیں ہوا ہے) جب دنیا ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور نفع مل جاتا ہے تو انھیں اطمینان حاصل ہوجاتا ہے اور اگر آزمانے کے لحاظ سے کبھیان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ بدل جاتے ہیں اور کفر اختیار کرلیتے ہیں اس طرح وہ دنیا کو گنوا دیتے ہیں اور آخرت میں بھی نقصان اٹھائیں گے یہی آشکار و واضح نقصان ہے۔

آیت میں ’’ حرف علی ‘‘ استعمال ہوا ہے ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ان کے ایمان کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کے دل میں نور ایمان کی تابش نہ ہونے کے برابر ہے اور ممکن ہے یہ سمجھایا گیا ہو کہ وہ ایمان واسلام کے مرکز سے دور اس کے کنارے پر ہیں، ثبات قدم نہیں رکھتے ہیں معمولی جھٹکا لگتے ہی وہ اس سے جدا ہوجائیں گے۔

اس آیت کے ذیل میں زرارہ نے امام محمد باقر ؑ سے نقل کیا ہے :جو لوگ شرک کو چھوڑ کر خدا کی عبادت کرتے ہیں اور رسول ؐ کی معرفت نہیں رکھتے ہیں تو وہ شک و تردد کی حالت میں عبادت کرتے ہیں اور کہتے ہیں :اگر خدا ہماے مال و اولاد میں اضافہ کردے تو ہم سمجھیں کہ وہ اللہ کا رسول ؐ ہے ورنہ ہم انھیں رسول نہیں مانیں گے۔ ارشاد ہے ان کی عبادت ایک طرف (زبانی ) ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

عبادت میں نشاط و فرحت

محمد بن یحییٰ نے احمد بن محمد عیسیٰ سے انھوں نے دو واسطوں سے امام محمد باقر ؑ سے روایت کی ہے کہ رسول ؐ نے فرمایا: ہر عبادت کے لئے ایک فرحت و رغبت ہوتی ہے پھر سستی آجاتی ہے پس جو شخص اپنی عبادت کو میری پیروی میں نشاط کیساتھ بجالاتا ہے وہ ہدایت یافتہ ہے اور جو شخص میری سنت کی مخالفت کرتا ہے وہ گمراہ ہوجاتا ہے اور اس کا عمل خسارہ ہی خسارہ ہے۔ جان لو کہ میری روش و طریقہ یہ ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں، سوتا ہوں روزہ رکھتا ہوں اور افطار کرتا ہوں، ہنستا ہوں اور روتا ہوں جو میری سنت سے روگردانی کرتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے پھر فرمایا: نصیحت و وعظ کے لئے موت ہی کافی ہے اور یقین کے لئے بے نیازی اور مشغول رہنے ک یلئے عبادت کافی ہے۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : ہر شخص کا کوئی میلان ہوتا ہے اور ہر رغبت سے کبھی دل اچاٹ ہو جاتا ہے خوش نصیب ہے وہ شخص جو بے رغبتی میں بھی خیر کی طرف ہو۔

حفص بن بختری امام صادق ؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: سستی و بے رغبتی کی حالت میں عبادت نہ کرو۔

## عبادت میں اعتدال:

جس طرح مذکورہ روایات میں ہمیں یہ تاکید کی گئی ہے کہ فرحت و نشاط کے ساتھ عبادت کریں، شوق و عشق کے ساتھ عبادت کریں تاکہ اس کا کچھ فائدہ حاصل ہو اور عبادت میں سستی و بے رغبتی سے پرہیز کریں کیونکہ سست انسان نے خدا سے مناجات کے میلان اور رغبت و نشاط کو گنوا دیا ہے چنانچہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بغیر روح کا بدن۔ عبادت میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے۔ عبادت میں میانہ روی اختیار کرو۔ رسول ؐ نے تاکید فرمائی ہے کہ عبادت میں زیادہ نہ تھکو۔

عمرو بن جمیع نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ رسول ؐ نے فرمایا: اے علی ! یہ محکم و متین دین ہے لہٰذا اس میں نرمی کے ساتھ داخل ہونا چاہئے تھکان و خستگی کی حالت میں عبادت نہیں کرنا چاہئے۔کیونکہ افراط کرنے والے کا کوئی سہارا باقی رہتا ہے اور نہ وہ کسی منزل پر پہنچتا ہے پس اس شخص کی طرح عبادت کرو جو بوڑھا ہے اور اس کے بعد مرنے کی امید رکھتا ہے۔

دوسری حدیث میں امام صادق ؑ سے اس طرح نقل ہوا ہے:

فرمایا: میں بچپنے میں طواف کررہا تھا کہ میرے والد میرے پاس سے گذرے اورمجھے دیکھا کہ میں عبادت میں سخت محنت کررہا ہوں میرے رخساروں سے پسینہ بہہ رہا ہے، فرمایا :جعفر ! بیٹے ! بیشک جب خدا کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے جنت میں داخل کرتا ہے اور اس کی کم عبادت سے بھی خوش ہوجاتا ہے۔

مختصر یہ کہ جس طرح ہر کام میں میانہ روی اختیار کرنا چاہئے اسی طرح عبادت میں اعتدال سے کام لینا چاہئے۔ اسلام کے تصور کائنات میں اور خدا شناس فلاسفہ کے مسلک میں علت اول خداوند عالم ہے دوسرے علل اس جیسے نہیں ہیں بلکہ ان کا اثر بھی خدا ہی کی طرف سے ہے چنانچہ خداپرست اور مادہ پرست آدمی کے تصور کائنات میں یہ فرق ہے۔ مادہ پرست ماد ہ ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور ہر چیز کو اپنے وجود میں آنے کے لحاظ سے مستقل سمجھتا ہے جب کہ موحد و خدا پرست علت و معلول کے نظام کا عقیدہ رکھتا ہے لیکن اس کو خدا سے متعلق جانتا ہے۔

مادی و طبیعی علل کے استقلال و عدم استقلال کا مسئلہ توحید و شرک کی سرحد ہے اس سرحد کو نظر میں رکھ کر موحد کو باآسانی سمجھا جاسکتا ہے آیات قرآنی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کائنات میں کوئی طاقت بھی خدا کی طاقت کے برابر نہیں ہے اور کسی بھی سبب کا اثر مسبب کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے:

کون ہے جو خشکی و تری کی تاریکیوں میں تمہاری ہدایت کرتا ہے اور کون ہے جو بشارت دینے والی ہواؤں کو اپنی رحمت سے آگے آگے بھیجتا ہے ؟ کیا خدا کے علاوہ کوئی معبود ہے؟ خدا اس سے بلند ہے کہ جس کو تم اس کا شریک قرار دیتے ہو۔

ان کے مایوس ہوجانے کے بعد وہی ہے جو بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے۔

جو لوگ توحید اور یقین و خلوص سے وابستہ نہیں ہوئے ہیں ان کے حالات اس طرح بیان کرتا ہے:

جب لوگ بے بس ہوجاتے ہیں تو لو لگا کر خدا کو پکارتے ہیں لیکن جب خدا انھیں اپنی رحمت ا مزہ چکھا دیتا ہے تو وہ اپنے پروردگار کا شریک قرار دیتے ہیں۔

جب و ہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو پورے خلوص کے ساتھ خدا کو یاد کرتے ہیں لیکن جب ساحل پر پہنچ جاتے ہیں تو یکبارگی مشرک ہوجاتے ہیں۔

رسول ؐ ان سے کہدیجئے کہ جو خدا تمہیں اس اور دوسری بلاؤں سے نجات دیتا ہے پھر بھی تم اس کا شریک قرار دیتے ہو۔

تثلیث از نظر قرآن:

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں کہ خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دو۔ عبادت کے معنی اور اس کے مصداق کو ہم بیان کرچکے ہیں اب ہم اس کے بعد والے جملے ’’ کہ کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دو ‘‘ کی وضاحت کرتے ہیں : جس طرح توحید کے مختلف مراتب و درجات ہیں اسی طرح شرک کے بھی مختلف اقسام و درجات ہیں : ذات میں توحید، صفات میں توحید، افعال میں توحید عبادت میں توحید اور اس کے دوسرے مراتب ہیں ایسے ہی ذات میں شرک، صفات میں شرک، افعال میں شرک، عبادت میں شرک اور اس کے دیگر اقسام۔

## ذات میں شرک

قرآن کے نزول کے وقت مسیحی، عیسیٰ بن مریم کو معبود سمجھتے تھے قرآن نے انھیں کافر قرار دیا ہے:

جو لوگ عیسیٰ بن مریم کو خدا کہتے ہیں وہ کافر ہوگئے ہیں اے رسول ؐ ان سے کہدیجئے کہ جب خدا چاہے گا مسیح بن مریم، ان کی ماں اور روئے زمین پر رہنے والوں کو نابود کردے گا تو اسے اس سے کون روک سکتا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا تین میں سے ایک ہے وہ کافر ہوگئے ہیں ایک خدا کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔

پہلی آیت میں واضح برہان کے ذریعہ فرماتا ہے:خدا عیسیٰ کو نابود کرسکتا ہے، صرف عیسیٰ ہی کو نہیں بلکہ تمام لوگوں کو ہلاک کرسکتا ہے اس میں شک نہیں ہے کہ مسیحی، حضرت عیسیٰ کو مریم کا فرزند مانتے ہیں اور کہتے ہیں : مسیح مریم کے پسر ہیں، اگر وہ مریم کے بیٹے ہیں تو دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی بشر ہیں اور ان کی موت و حیات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس صورت میں وہ انھیں کیسے خدا مانتے ہیں جب کہ وہ اپنی موت و حیات کے مالک نہیں ہیں ؟ اس آیت میں ان کے بشر ہونے پر زور دیا گیا ہے اور انھیں مریم کا بیٹا قرار دیا ہے۔

دوسری آیت میں ان کے کھانا کھانے کو اور اس بات کو بیان کیا ہے کہ ان کو کھانے کی احتیاج ہوتی تھی، ارشاد ہے: مسیح اور ان کی ماں کھاتی ہیں۔ یعنی مسیح اور ان کی والدہ دوسرے انبیاء سے مختلف نہیں ہیں۔ مسیح کا فرزند ہونا بھی ذات میں شرک کے مظاہر میں سے ایک ہے کہ ایک خدا کو تین خداؤں کی صورت میں دکھایا جاتا ہے قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ جس چیز کو انھوں نے معبود بنا رکھا ہے وہ مخلوق ہے۔

خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ بھی تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔

اے لوگو! جو کہ خدا کے غیر کو پکارتے ہیں وہ تمہاری مدد کرنے پر قادر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی مدد بھی نہیں کرسکتے اگر تم انھیں ہدایت کی طرف بلاؤ گے تو وہ تمہاری بات نہیں سنیں گے تمہیں یہ محسوس ہوگا کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ دیکھتے نہیں ہیں۔

قرآن اہل کتاب کو مخاطب کرکے کہتا ہے:

اے رسول! اہل کتاب سے کہدیجئے کہ اس بات کو قبول کرلو جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کے غیر کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں پھر اگر وہ روگردانی کریں تو کہدیجئے کہ گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔

مذکورہ آیت ہر قسم کے شرک کو شامل ہے یعنی کسی بھی قسم کا شرک نہ کیا جائے۔

## عبادت میں شرک

اے رسول !ان لوگوں سے کہدیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں (لیکن میرا امتیاز یہ ہے کہ )مجھ پر مسلسل یہ وحی ہوتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے،پھر جو شخص خدا سے ملاقات کا امیدوا ہے اسے چاہیے کہ نیک وصالح عمل انجام دے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

یہ آیت خدا کی عبادت میں شرک کرنے سے منع کرتی ہے اور اس بات کو بیان کرتی ہے کہ اپنی عبادت کو صرف خدا کے لئے قرار د۔ مذکورہ آیت کے سلسلہ میں ابوالجارود نے امام محمد باقر ؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول ؐ سے اس آیت کی تفسیر معلوم کی گئی تو آپ نے فرمایا: جو لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتا ہے وہ مشرک ہے اور جو لوگوں کو دکھانے کے لئے زکوات دیتا ہے وہ مشرک ہے اور جو لوگوں کو دکھانے کے لئے روزہ رکھتا ہے وہ مشرک ہے اور جو لوگوں کو دکھانے کے لئے حج کرتا ہے وہ مشرک ہے اور جو اس کام کو لوگوں کو دکھانے کے لئے انجام دیتا ہے کہ جس کا خدا نے اسے حکم دیا ہے، وہ مشرک ہے اور خداوند عالم ریا کاری قبول نہیں کرتا ہے۔

اسی آیت کے ذیل میں جراح مداینی نے امام محمد باقر سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: انسان کوئی ثواب کا کام انجام دیتاہے لیکن خدا کی رضا کو مد نظر نہیں رکھتا ہے بلکہ لوگوں کو دکھانے کے لئے انجام دیتا ہے تاکہ لوگ اس کے عمل کی تعریف کریں۔ یہ شخص خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے پھر فرمایا: جس شخص نے بھی کوئی نیک کام انجام دیا اور اسے مخفی رکھا خدامرور زمانہ کے ساتھ اس کو ظاہر کردے گا، اور جو بندہ اپنے برے کام کو مخفی رکھتا ہے خدا اسے شر کے عنوان سے ظاہر کردے گا۔

ایک حدیث میں زرارہ نے امام محمد باقر ؑ اور امام جعفر صادق ؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اگر بندہ کوئی کام خدا کی رضا اور آخرت طلب کرنے کے لئے انجام دیتا ہے اور خدا کے غیر کو بھی اس میں شریک قرار دیتا ہے تو وہ مشرک ہے۔

قرآن میں مشرکوں کے اعمال کی عکاسی:

قرآن مجید مشرکوں کے شرک آلود اعمال کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے :

حج کے مناسک کو انجام دیجئے اس حال میں کہ وہ خالص خدا کے لئے ہوں، اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیجئے دیکھو جو خدا کا شریک قرار دیتا ہے گویا وہ آسمان سے گر پڑتا ہے اور درمیان سے اسے پرندہ اچک لیتا ہے یا تیز ہوا اسے کہیں بہت دور پھینک دیتی ہے۔

اس آیت میں آسمان سے مراد توحید ہے اور شر سقوط کا سبب ہے اس رفعت و بلندی سے جب انسان گرے گا تو وہ دو دردناک بلاؤں میں سے ایک میں لازمی طور پر مبتلا ہوگا یہ وہ زمین پر آنے سے پہلے ہی پرندوں کا لقمہ بن جائے گا بعبارت دیگر وہ مرکز توحید سے جدا ہوکر بپھری ہوئی ہوس میں پھنس جائے گا جو اس کی ہستی کو نابود کردے گی اور اگر اس سے بچ جائے گا تو ہلاکت خیز طوفانوں میں گھر جائے گا جو اسے زمین پر پٹک دیں گے جس سے اس کے پرخچے اڑ جائیں گے اس طوفان سے مراد شیطان ہے جو اس کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شرک کی تشبیہ اس سے بہتر نہیں ملے گی۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے، جو کہ آج ثابت ہو چکی ہے،کہ سقوط کے وقت انسان کا کوئی وزن و بھرم نہیں رہتا ہے اور سقوط کے وقت انسان کے اندر جو اضطراب ہوتا ہے وہ اسی سبکی بے وقعتی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بیشک جو شخص ایمان سے شرک کی طرف بڑھتا ہے وہ مضبوط و استوارسہارے کو گنوا دیتا ہے اور ایسے ہی حالات سے دو چار ہوتا ہے اس کے اوپر عجیب قسم کا اضطراب طاری ہوجاتا ہے۔

بنی امیہ شرک شناسی میں مانع:

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : بنی امیہ نے ایمان شناسی کے لئے تو لوگوں کو آزد چھوڑ رکھا تھا لیکن شرک کو پہچاننے کے لئے انھیں آزادی نہیں دی تھی تاہ اگر انھیں شرک یک طرف بلایا جائے تو وہ یہ نہ سمجھ پائیں کہ انھیں شرک ی طرف ہنکایا گیا ہے۔

اس حدیث کی شرح میں مرحوم فیض ؛ شافی میں اس طرح رقم طراز ہیں :

بنی امیہ کا سارا زور اس بات پر صرف ہوتا تھا کہ لوگ بے چون و چرا ان کی اطاعت کریں اسی لئے انھوں نے ایمان و توحید شناسی کے راستے کھلے چھوڑ رکھے تھے اور شرک کو پہچاننے کے راستے بند کررکھے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر لوگ شرک کے مفہوم و مصداق کو نہیں سمجھیں گے تو آسانی سے شرک کو قبول کرلیں گے لیکن اگر اس کے معنی کو سمجھ لیں گے تو ہرگز بنی امیہ کی پیروی نہیں کریں گے۔

بنی امیہ ہی نہیں بلکہ تمام طاغوتی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ لوگ علوم و معرفت کے میدان میں قدم نہ رکھیں کیونکہ جتنا و ہ علوم سے دور رہیں گے اتنے ہی بہتر طریقہ سے اطاعت کریں گے لہٰذا اسلامی تہذیب میں علم حاصل کرنے کو بہترین عبادت اور اہم ترین فریضہ قرار دیا گیا ہے اور جہالت و نادانی کے خلاف جنگ کہا گیا ہے۔

## شرک خفی

شرک خفی کے بارے میں امام صادق ؑ نے رسول ؐ کی یہ حیدث بیان فرمائی ہے: مسعدہ بن صدقہ نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ سے رسول ؐ کی اس حدیث ’’ شرک اس چیونٹی سے بھی زیادہ خفی چلتا ہے جو تاریک رات میں کالے پتھر پر چلتی ہے‘‘ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مومنین مشرکوں کے خداؤں کو برا کہتے تھے نتیجہ میں مشریکن بھی مومنوں کے مبود ککو برا ہتے تھے لہٰذا خدا نے مومنوں کو اس سے منع کیا تاکہ مشرک ایسا نہ کریں کہ اس کے علاوہ نہ دانستہ طور پر مومنین شرک نہ کریں، سورۂ انعام میں ارشاد ہے: ان چیزوں کو برا نہ ہو کہ جن کو مشرکین پکارتے ہیں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خفی شرک کتنا خطرناک ہے اس سے خدا کی پناہ طلب کرنا چاہئے۔ امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : تمہارے اوپر خدا کا حق یہ ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دواگر یہ عمل تم خلوص کے ساتھ انجام دو گے تو خدا نے بھی اپنے اوپر یہ فرض کیا ہے کہ وہ تمہارے دنیا و آخرت کے امور میں کفایت کرے گا اور تمہاری محبوب چیزوں کی حفاظت کرے گا۔ میں خداوند عالم سے اس حق کی توفیق کا طلب گار ہوں۔

## نفس کا حق

؟؟؟

تمہارے نفس کا تم پر یہ حق ہے کہ اسے بھر پور طریقہ سے راہ خدا میں مشغول رکھو اگر تم نے ایسا کیا تو گویا تم نے اپنی زبان کا حق، اپنے کان کا حق، اپنی آنکھ، ہاتھ، پاؤں اور شکم و شرم گاہ کا حق اداكردیا اور دیکھو ان کے حقوق کی ادائیگی میں خدا سے مدد طلب کرتے رہو۔

آپ کے اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے حقوق کو ادا کرنا گویا اپنے ان اعضاء و جوارح کے حقوق کو ادا کرنا ہے جو کہ خدا کی عطا ہیں لہٰذا اس سلسلہ میں خدا ہی سے مدد طلب کرنا چاہیے۔

## نفس کے معنی:

ابتداء میں اس بات ی طرف اشارہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نفس کے لغوی معنی کیا ہیں اور اس کا محل استعمال کیا ہے۔ مشہور لغت شناس راغب لکھتے ہیں : نفس کے معنی وح کے ہیں اس سلسلہ میں موصوف نے قرآن کی آیات کو بھی ثبوت میں پیش کیا ہے۔

مثلاً:

ان آیتوں میں نفس روح کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن ’’ یحذر کم اللہ نفسہ ‘‘ میں نفس سے مراد ذات ہے۔ راغب نے نفس کے دوسرے معنی بیان کئے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں : درحقیقت نفس وہ ہوا ہے جس کو انسان منھ یا ناک کے ذریعہ بدن میں داخل کرتا ہے اور بدن سے کاربن گیس کو نکالتا ہے،اس میں بدن کے لئے غذا ہوتی ہے چنانچہ سانس کا سلسلہ منقطع ہوجانے سے موت واقع ہوجاتی ہے۔

شیخ طبرسی مرحوم نے اس آیت ’’ وما یخدعون الا انفسھم ‘‘ کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ نفس کے تین معنی ہیں :

۱۔ روح

۲۔ تاکید مثلاً ’’ جائنی زید نفسہ ‘‘

۳۔ ذات، اصل یہی معنی ہیں۔

## قرآن میں نفس کے معنی:

طبرسی نے تحریر کیا ہے کہ نفس روح کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً اس آیت میں ارشاد ہے:

؟؟؟

خداوند عالم روحوں کو موت کے وقت جب وہ کمال کو پہنچ جاتی ہیں لے لیتا ہے یا قبض کرلیتا ہے اور جس روح کا بدن ابھی نہیں مرا ہے اور اس کی موت کا وقت آگیا ہے تو اسے سوتے ہی میں روک لیتا ہے اور دیگر ارواح کو معین وقت تک کے لئے ان کے بدن میں بھیج دیتا ہے۔

۲۔ نفس ذات کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً ارشاد ہے:

؟؟؟

اس دن سے ڈرو! جس دن کوئی نفس کسی دوسرے نفس کا فدیہ نہیں دیا جائے گا۔

۳۔ نفس قلب اور باطن کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً :

؟؟؟

اپنے پروردگار کو اپنے دل میں تضرع و زاری کے ساتھ یاد کرو اور یوسف اسے اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے اور تمہارا پروردگار ان چیزوں کو اچھی طرح جانتا ہے جن کو تم چھپائے ہوئے ہو۔

## نفس کے اقسام کے بارے میں حکماء کا نظریہ

صدر المتألہین شیرازی نے شیخ الرئیس بو علی سینا سے نقل کیا ہے کہ قوائے نفس کی تین قسمیں ہیں :

۱۔ نفس نباتی : یہ جسم طبیعی و آلی کا اولین کمال ہے اس میں فقط رشد و نمو پایا جاتا ہے۔

۲۔ نفس حیوانی: یہ جسم طبیعی وآلی کے لئے اولین کمال ہے کہ اس میں ارادہ کے ساتھ حس و حرکت پائی جاتی ہے۔

۳۔ نفس انسانی : یہ جسم طبیعی و آلی کا کمال ہے کہ اس میں تعقل اور کلیات کو سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور یہ مختلف رایوں کا استنباط کرتا ہے اس کے بعد موصوف ان تینوں قسموں کے خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

ابو نصر فارابی- معلم ثانی- رسالہ فصوص الحکم کی بائیسویں فصل میں نفس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں : نفس مطمئنہ کا کمال اپنے ادراک کے ذریعہ حق اول کا عرفان ہے پس اس کا عرفان حق اول ہے اس کی وضاحت الٰہی قمشہ ای نے اس طرح کی ہے: نفس ناطقہ کے بہت سے پہلو ہیں اگر وہ لذتوں او ر حیوانی شہوتوں پر مرا جاتا ہے تو اسے نفس امارہ کہتے ہیں اور اگر شہوت کے غلبہ کی وجہ سے اس کی نظر میں بد اعمال سنور جاتے ہیں تو اسے مزینہ کہتے ہیں۔ اور اگر حیوانی مقاصد کو انجام دینے کے لئے حیلے بہانے سے کام لیتا ہے تو اسے ’’ مسولہ ‘‘ کہتے ہیں۔ اگر وہ کسی برے کام کی انجام دہی کے بعد اصلی فطرت کی طرف رجوع کرتا ہے اور خود کو لعنت ملامت کرتا ہے تو اسے ’’ لوّامہ‘‘ کہتے ہیں۔ اور اگر حیوانی لذتوں سے چھٹکارا پالیتا ہے اور اس کی شہوت اور غضب کی قوت میں آرام و سکون پیدا ہوجاتا ہے اور وہ عقلی لذتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے تو اسے نفس مطمئنہ کہتے ہیں اور اگر تسلیم و رضا کی منزل میں وہ خدا کی رضا کے لئے اپنی مرضی کو ختم کردیتا ہے تو اسے نفس راضیہ و مرضیہ کہتے ہیں۔ موصوف نے ان باتوں کو قرآن سے اقتباس کیا ہے جس منزل پر اسے نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے وہاں اسے حق اول کی معرفت ہی میں لذت محسوس ہوتی ہے، پس نفس مطمئنہ (یعنی روح) اسے اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ آلودگیوں اور تن کی کدورتوں سے پاک ہوجاتا ہے۔

اب ہم خدا کی مدد کے ساتھ نفس کے اِن مراتب کو قرآن کی روشنی میں بیان کریں گے ار ان آیتوں کو بھی بیان کریں گے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔

## نفس کے مراتب قرآن کی نظر میں

نفس کے بعض مراتب قرآن مجید میں بھی بیان ہوئے ہیں ان کو ہم اختصار کے ساتھ سپر د قلم کرتے ہیں۔

### ۱۔ نفس امّارہ:

جو نفس لذتوں پر مرا جاتا ہے اسے نفس امارہ کہتے ہیں یعنی وہ انسان کو ہمیشہ اس بات پر ابھارتا ہے کہ اس کی خواہش پوری کرے نفس کا یہ مرحلہ کہ جس کو قرآن کی زبان میں نفس امارہ کہا گیا ہے انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے اور خدا کے عظیم بندوں نے اس سے خدا کیپناہ طلب کی ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یوسف کی زبانی اس طرح بیان ہوا ہے: میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا کیونکہ وہ ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے مگر یہ کہ میرا پروردگار مجھے گناہوں سے بچے رہنے کی توفیق دیتا رہے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے جو اپنے پروردگار کے مقام و مرتبہ سے ڈرا اور اس نے ہوا و ہوس سے اپنے نفس کو روک کر رکھا تو بہشت اس کی منزل ہے۔ نفس کے اس مرتبہ کے سلسلہ میں حضرت امیر المومنین ؑ فرماتے ہیں :

نفس کی طبیعت میں ہی سرکشی اور بے ادبی ہے بندہ پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اسے با ادب و مؤدب بنائے۔ نفس تو میدان مخالفت میں چوکڑیاں بھرتا پھرتا ہے بندہ کو چاہیے کہ وہ اس کی خواہشوں کو پورا نہ کرے بلکہ اسے قابو میں رکھے اگر اسے آزاد چھوڑ دے گا تو وہ اس کی تباہی میں ایسا شریک ہوگا، جو نفس کی خواہشوں کو پورا کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے گویا وہ اپنے قتل میں اپنے نفس کے ساتھ شریک ہوا۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : نفس کو چھوڑنے سے پہلے اسے ضرر رسانی سے روک دو اور اس کی زبان کو لگا م چڑھا دو اور اسے ناجائز خواہشوں کی زنجیر سے آزاد کرنے کے لئے اسی طرح کوشش کرو جس طرح تم اپنا روز گار تلاش کرنے میں کوشش کرتے ہو کیونکہ نفس تمہارے عمل کا مرہون ہے۔

## نفس سے جہاد:

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : مرد کا اپنے نفس سے جہاد کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔

رسول خدا ؐ فرماتے ہیں : وہ آدمی شجاع اور طاقتور نہیں ہے جو لوگوں پر غالب آجاتا ہے بلکہ طاقتور اور مضبوط آدمی وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : اپنے نفس کی مخالفت کرو تاکہ تم سیدھی سچی زندگی بسر کرسکو اور صاحبان علم کے ساتھ گھل مل جاؤ کہ اس طرح تم بھی عالم بن جاؤ گے اور جہالت سے نجات پاجاؤ گے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں : جو اپنے نفس پر غلبہ پا لیتا ہے وہ مکمل طور پر طاقت حاصل کرلیتا ہے۔

## پہلوان سے بھی زیادہ طاقتور:

رسول ؐ ایک جماعت کے پاس سے گزرے ان میں سے ایک آدمی بہت وزنی اور بھاری پتھر اٹھائے ہوئے تھا اس کے بارے میں لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ وہ بہت وزنی پتھروں کا اٹھانے والا ہے اس کی وزن برداری سے لوگ حیرت زدہ تھے۔ رسول ؐ ان کے قریب تشریف لے گئے اور معلوم کیا : کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے بتایا: اے اللہ کے رسول ؐ ! ایک شخص پتھر اٹھاتا ہے اسے سب سے بھاری اور وزنی پتھراٹھانے والا کہتے ہیں، آپ نے فرمایا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس سے زیادہ طاقتور آدمی کی خبر دوں ؟ وہ شخص ہے کہ جس کو دوسرا برا کہتا ہے اور وہ برداشت کرتا ہے، اپنے اوپر قابو رکھتا ہے اپنے اور اپنے ساتھی کے شیطان پر غالب آجاتا ہے۔

### ۲۔ نفس لوّامہ:

ابھی تک جو آیات و روایات بیان ہوئی ہیں ان کا تعلق نفس امارہ سے تھا کہ جو ہمیشہ انسان کو برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ نفس امارہ کے مقابلہ میں نفس لوامہ ہے یعنی جو ملامت کرتا ہے۔ انسان سے اگر کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو یہ نفس اس کو سرزنش کرتا ہے قرآن مجید نے اسی نفس کی قسم کھائی ہے۔ ارشاد ہے: لا اقسم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

روز قیامت کی قسم اور نفس لوامہ کی قسم۔

علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں امام ؑ سے نقل کیا ہے کہ نفس لوامہ سے مراد، آدم کا نفس ہے جس نے عصیان و نافرمانی کی اور ملامت کا نشانہ بنا۔

جو انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنے باطن سے ملامت و سرزنش کی آواز سنتا ہے۔ یہ آواز اس کو تکلیف دیتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے ملامت کرنے والی طاقت کا نام ’’ وجدان اخلاقی ‘‘ رکھا ہے جب کہ قرآن نے اسے نفس لوامہ کہا ہے، لفظ نفس کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ ملامت کرنے والی طاقت روح بشر ہے جو انسان کے وجود کا جز ہے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ یہ روحانی طاقت شروع سے ہی آدم کے وجود میں تھی۔

مایوس بیمار اور اس کا علاج:

حضرت امام زین العابدین ؑ طواف میں مشغول تھے اچانک آپ کی نگاہ ان لوگوں پر پڑی جو مسجد کے گوشہ میں جمع تھے۔ آپ نے دریافت کیا : کیا بات ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ محمد بن شہاب زہری نفسیاتی مرض میں مبتلا ہوگئے ہیں گویا پاگل ہوگئے ہیں ؛ خاموش رہتے ہیں، کچھ بولتے ہی نہیں ہیں۔ ان کے خاندان والے ان کو اس لئے مکہ لائے ہیں کہ ہوسکتا ہے لوگوں کے اژدہام کو دیکھ کر یہ بولنے لگیں طواف مکمل کرنے کے بعد امام زین العابدین ؑ محمد بن شہاب زہری کے پاس گئے۔ اس نے امام زین العابدین ؑ کو پہچان لیا۔ آپ نے دریافت کیا : تمہیں کیا ہوتا ہے ؟ اس نے کہا: میں ایک شہر کا حاکم تھا۔ مجھ سے ایک بے گناہ کا خون ہوگیا۔ اس بے گناہ کے خون نے مجھے یہ دن دکھایا ہے۔ ایک بے گناہ کے خون نے ایک حاکم کا یہ حال کردیا ہے اور اس کے ضمیر کی پھٹکار نے نفسیاتی مرض میں مبتلا کردیا ہے وہ اس گناہ پر اتنا پشیمان ہے کہ بولنے کی جرأت بھی نہیں کر پا رہا ہے بلکہ پاگلوں جیسا بن گیا ہے، امام زین العابدین ؑ نے اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ اپنے گناہ کی بخشش سے مایوس ہوگیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تمہارا رحمت خدا سے مایوس ہوجانا اس گناہ سے زیادہ خطرناک ہے جو تم نے بے گناہ کا خون بہا کر کیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: مقتول کے وارثوں کو اس کی دیت دیدو۔ اس نے کہا: انھوں نے دیت لینے سے انکار کردیا ہے۔ آپ نے فرمایا: دیکھتے رہو جب وہ نماز کے لئے گھر سے باہر جائیں تو دیوار کے اوپر سے ان کے گھر میں تھیلیاں ڈال دینا اس طرح امام نے اس کا علاج کردیا۔ یہ تھا نفس لوامہ کا اثر۔

۳۔ نفس مسولہ:

ایک لحاظ سے نفس کو مسولہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ انسان کی نظر میں غلط اور برے کام کو اچھا بنا دیتا ہے اور ان کے انجام دینے کی طرف راغب کرتا ہے، قرآن مجید میں اس کے د و نمونے بیان ہوئے ہیں :

یوسف اور ان کے بھائی:

جب یوسف کے بھائیوں نے انھیں باپ سے جدا کرکے کنویں میں ڈال دیا تو نفس نے انھیں فریب دیا جیسا کہ قرآن میں ارشادہ ہے’’ یوسف کے پیراہن کو جھوٹے خون میں رنگ کر اپنے والد کے پاس لائے۔ باپ نے کہا: تمہارے نفس کی خواہش نے یہ چیز تمہاے لئے سنوار دی ہے جو تم کہتے ہو میں اس پر بہترین طریقہ سے صبر کرونگا اور خدا ہی سے مدد طلب کرونگا۔

اس آیت میں تسویل سے ’’ سوّلت ‘‘ آیا ہے جس کے معنی تزئین اور سنوارنے کے ہیں علماء نے کہیں اس کے معنی ترغیب اور کہیں وسوسہ بیان کئے ہیں کہ سب کا مفہوم ایک ہی ہے اور یہ کہ جب بپھری ہوئی خواہشیں انسان کی روح اور خیال پر غالب آجاتی ہیں تو وہ انسان کی نظر میں کسی کے قتل اور کسی کے جلا وطن کرنے کو سنوار دیتی ہیں کہ وہ اس فعل کو مقدس اور اس کی انجام دہی کو لازمی و ضروری سمجھنے لگتا ہے اور یہ نفسیات کے مسائل کی طرف ایک دریچہ ہے کیونکہ جب انسان کسی چیز کو شدت کے ساتھ چاہتا ہے خصوصا جب یہ خواہش اخلاقی پستیوں کے ساتھ ہوتی ہے تو یہ چیز انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اور انسان کی نظر میں حقائق کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب نفس کے بغیر صحیح فیصلہ اور حقائق کا صحیح ادراک نہیں ہوپاتا ہے۔ اس داستان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نفس مسولہ کی کارستانی کے سبب یوسف کے بھائیوں نے کتنی بڑی خیانت کی تھی اور جھوٹے خون سے یوسف کا پیراہن رنگ کر اپنے جھوٹ کو ثابت کیا تھا، اسی داستان میں یہ بھی ہے کہ جب یہ لوگ مصر سے واپس لوٹے اور بھائی کی چوری کی خبر یعقوب کو دی تو یعقوب نے فرمایا:

کہا: تمہارے نفس نے اس کو تمہاری نظر میں سنوار دیا ہے میں بہترین صبر سے کام لوں گا امید ہے کہ خدا ان سب کو میری طرف پلٹائے گا۔ بے شک وہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

سامری:

قرآن کہتا ہے: موسیٰ توریت کی تختیوں کو لینے کوہ طور پر گئے اور لوگوں سے فرمایا:یہ سلسلہ تیس دن تک جای رہے گا لیکن اس میں خدا نے دس روز کا اضافہ کردیا۔ اب چالیس دن کی مدت ہوگئی، انھیں دس دن کے عرصے میں سامری نے بنی اسرائیل کو بہکا دیا اور انھیں بچھڑے کی پرستش پر اکسایا۔ حضرت موسیٰ واپس آئے تو یہ افسوس ناک صورت حال دیکھی۔ پہلے تو آپ نے اپنے بھائی ہارون کو سرزنش کی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ اس میں ہارون کا کوئی قصور نہیں ہے تو سامری سے مخاطب ہوئے :

فرمایا: اے سامری کیا یہ غلط کام تم نے انجام دیا ہے؟ اس نے کہا : جو چیز میں نے دیکھی وہ انھوں نے نہیں دیکھی۔ میں نے رسول (یعنی خدا کے بھیجے ہوئے نمائندہ ) کے قدم کی خاک اٹھائی اور اس کو میں نے (اس کے اندر ) ڈال دیا یہی میرے نفس نے میر نظر میں سج دیا تھا۔

سامری ایک خودپسند اور منحرف آدمی تھا۔ اس نے ہوشیاری، جرأت مندی اور ماہرانہ چال چلی اور بنی اسرائیل کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ایک بڑا فتنہ کھڑا کردیا اور موسیٰ کی کوششوں کا کوئی پاس و لحاظ نہ رکھا اور موقعہ ملتے ہی لوگوں کو بچھڑا پرستی کی دعوت دیدی۔

اس آیت میں سامری نے اپنے منفور عمل کی، کہ جس سے اس نے بنی اسرائیل کو گمراہ کیا تھا، اپنے نفس مسولہ کی طرف نسبت دی ہے اور کہا ہے: اس طرح میرے نفس نے اس چیز کو میری نظر میں سجا دیا ’’ قبضت۔۔۔۔۔ الرسول‘‘ اثر کے معنی قدم کے نیچے کی مٹی کے ہیں اور ’’ نبذ ‘‘ کے معنی بچھڑے کے اندر (اس مٹی کو) ڈالنے کے ہیں یا اثر سے مراد حضرت موسیٰ کی بعض تعلیمات اور نبذ سے مراد انھیں نظر انداز کرنا ہے دونوں کا مفہوم یہ ہے کہ سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے سلسلہ میں اپنے نفس سے دھوکا کھایا اور نتیجہ میں اتنی بڑی خیانت کی۔

حسن بصری امت کا سامری:

احتجاج طبرسی میں منقول ہے کہ جب حضرت علی ؑ بصرہ کو فتح کرچکے تو اہل بصرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں حسن بصری بھی تھا اس کے ہاتھ میں قلم کاغذ بھی تھا اور حضرت علی ؑ کی ہر بات کو لکھ لیتا تھا۔ حضرت علی ؑ نے اس کو سب کے درمیان بلند آواز سے مخاطب کیا اور فرمایا: یہ تم کیا کررہے ہو؟ اس نے عرض کی : آپ کی باتوں کو لکھ رہا ہوں تاکہ آئندہ کام آئیں۔

حضرت علی ؑ نے فرمایا: دیکھو! ہر قوم میں ایک سامری ہوتا ہے اور اس قوم کا سامری حسن بصری ہے ہاں اس کے اور موسیٰ کے زمانہ والے سامری کے درمیان یہ فرق ہے کہ وہ اپنے پاس آنے والے سے کہتا تھا میرے پاس نہ آؤ لیکن یہ کہتا ہے کہ جنگ نہ کرو یہاں تک گمراہ و منحرف لوگوں سے بھی جنگ نہ کرو حسن بصری نے لوگوں کو جنگ جمل میں حضرت علی ؑ کا ساتھ دینے سے منع کیا تھا۔

۴۔ نفس مطمئنہ:

نفس کا ایک رخ اطمینان بھی ہے اور یہ نفس کا بلند ترین رخ ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف پلٹ آ جب کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے راضی ہے اور میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہوجا۔

کتنی اچھی بات ہے کہ خداوند عالم براہ راست ان نفوس کو بلا رہا ہے جو ایمان کی روشنی میں اطمینان کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں، یہ ایسی دعوت ہے کہ جس میں طرفین کی رضا ہے، عاشق کی رضا بھی ہے اور محبوب و معبود حقیقی کی رضا بھی، پھر اس کے سر پر عبودیت کا با افتخار تاج رکھنا اور اسے بندگی کے خلعت سر سرفراز کرنا، خاص بندوں میں شامل کرنا ار پھر اسے جنت میں آنے کی دعوت دینا کتنی اہم بات ہے۔

اطمینان و سکون انقلاب کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ نفس کو اس وقت سکون ملتا ہے جب وہ یقین اور معرفت و شہود کی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ کاشفی کہتے ہیں : اے وہ نفس کہ جس کو میرے ذکر سے آرام ملا ہے جس نے میری نعمت کا شکر ادا کیا ہے اور بلا پر صبر کیا ہے۔ پس جس کرامت کا خدا نے وعدہ کیا ہے اس کی طرف پلٹ آ جب کہ تو ان نعمتوں سے راضی ہے جو میں نے تجھے دی ہیں۔

موت کے وقت نفس مطمئنہ کی حالت:

نفس مطمئنہ کا بہترین جلوہ مرتے وقت اور اس عالم مادہ سے جدائی کے وقت نظر آتا ہے وہ اس دنیا کو اطمینان و سکون کے ساتھ چھوڑتا ہے اور عالم ابدیت سے متصل ہوجاتا ہے۔ اس کیفیت کو سدیر صیرفی نے امام جعفر صادق ؑ سے اس طرح نقل کیا ہے: سدیر کہتے ہیں :

میں نے امام صادق ؑ کی خدمت میں عرض کیا : فرزند رسول ؐ ! میں قربان ! کیا مومن روح قبض ہونے کو اچھا نہیں سمجھتا ہے ؟ فرمایا: نہیں خدا کی قسم جب ملک روح قبض کرنے کے لئے آتا ہے تو وہ جزع و فزع کرتا ہے ملک الموت اس سے کہتا ہے : اے خدا کے محبوب تم مطمئن رہو، اس خدا کی قسم کہ جس نے رسول ؐ کو مبعوث کیا ہے، میں تم پر باپ سے زیادہ مہربان ہوں اپنی آنکھ کھولو اور دیکھو۔

پھر فرماتے ہیں کہ رسول ؐ، علی ؑ، فاطمہ ؐ اور حسن ؑ وحسین ؑ اورباقی ائمہ اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اے نفس مطمئنہ محمد ؐ ار ان کی آل کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ کہ تو علی ؑ کی ولایت سے راضی اور اپنے پروردگار کے ثواب سے خوش ہے، میرے بندے محمد ؐ ار ان کی آل کی زمرہ میں شامل ہو جا اور میری جنت میں آجا، اس کی روح کے نزدیک اس آواز سے بہتر اور اس کے مندی تک پہنچنے سے بہتر اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔

خواہش نفس سے جنگ:

منزل کمال پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان پہلے مرحلہ میں اپنے نفس کو پہچانے اور اس کی ہر خواہش کو پورا نہ کرے اس مفہوم کو ’د مجاشع‘ذ نے انسان کامل پیغمبر اسلا م سے نقل کیا ہے صاحب کتاب غوالی الئالی لکھتے ہیں : مجاشع نام کا ایک شخص رسول ؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور درج ذیل سوال کئے اور ان کا جواب پایا۔

اس نے پوچھا : اے اللہ کے رسول ؐ حق کو پہچاننے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: معرفت نفس، اس نے کہا: حق کی موافقت کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: نفس کی مخالفت، اس نے کہا: حق کی رضا حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: نفس کو ناراض کرنا۔ اس نے کہا حق تک رسائی کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: اپنے نفس کی خواہشوں سے منھ موڑنا، اس نے کہا حق کی اطاعت کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: نفس کی خواہشوں کے مقابلہ میں سرکشی کرنا، اس نے کہا حق کی راہ یاد کرنے کا کیا طریقہ ہے ؟ فرمایا: نفس کو فراموش کرنا۔ اس نے کہا : حق سے نزدیک ہونے کا کون سا راستہ ہے ؟ فرمایا: نفس سے دوری اختیار کرنا، اس نے کہا حق سے انس کا کیا طریقہ ہے ؟ فرمایا: اپنے نفس سے ڈرنا، اس نے کہا: ان سب تک پہنچنے کا کیاطریقہ ہے؟ فرمایا : حق سے اس کے خلاف مدد طلب کرنا۔

اس دلچسپ حدیث میں آدمی کے بلند منزل پر پہنچنے اور نفس کی مخالفت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس میں چند چیزیں قابل غور ہیں : حق و نفس کی معرفت، حق کی موافقت اور نفس کی مخالفت، حق کو خوشنود کرنا ار نفس کو ناراض کرنا، حق سے متصل ہونا اور نفس کی پروا نہ کرنا، حق کی پیروی کرنا اور نفس کی نافرمانی کرنا، حق کو یاد رکھنا اور نفس کو بھلا دینا، حق سے نزدیک ہونا اور نفس سے دور ہونا، اگر اس حدیث پر عمل کرلیا جائے تو واقعاً انسان حقیقی عرفان کی منزل تک پہنچ جائے۔

فقہی لحاظ سے نفس کا حق :

اس بحث کے آخر میں نفس کے فقہی حق کی طرف اشارہ کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں نفس، انسان کی حیات کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے حیات و زندگی بڑی قیمتی چیز ہے کوئی چیزبھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، انسان کی جانکیباریمیں قرآن اس طرح فرماتا ہے:اگر کسی نے انسان کوناحق یا اس کے زمین میں فساد پھیلائے بغیر قتل کردیا گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کردیا اور جو کسی ایکانسان کو زندہ رکھنے کا سبب بنا گویا اس نے سارے انسانوں کو زندگی دی۔

بے گناہمومن کیقاتل کو قرآن مجید بد عاقبت قرار دیتا ہیار اس جرم کوہر جرم سے سنگین سمجھتا ہے:

جوجانبوجھ کر کسی مومن کو قتل کرتا ہے اس کی سزا ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے اوراس پر خدا کا غضب و لعنت ہے اور اس نے اس کے لئے درد ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

قرآن کہتا ہے: جو مظلوم مارا جائے ہم نے اس کے ولی و سرپرست کے لئے قصاص کی سلطنت رکھی ہے لیکن اسے قتل کرنے میں حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ حکم قصاص قرآن مجید کا اصلی منشور ہے، اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔

قتل کی تین قسمیں ہیں :قتل عمد، قتل شبہہ اورقتل خطا، قتل مد میں مقتول کے سر پرست کو اختیار حاصل ہے کہ وہ قصاص میں قاتل کو قتل کرے یا اس سے دیت و خوں بہا لے یا اسے معاف کردے لیکن قتل شبہۂعمد اورقتل خطا میں دیت لے گا۔ قتل شبہۂ عمد یہ ہے کہ انسان کسی کو کسی وجہ سے مارے اور اس پٹائی سے وہ مر جائے، ظاہر ہے اس کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا اور نہ ہی اس نے تلوار و گولی چلائی تھی۔

قرآن کے زاویۂ نگاہ سے قصاص میں معاشرہ کی حیات ہے اور قصاص کو حرام قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ ظالموں کو چھوٹ دیدے گی۔ لیکن قرآن قصاص میں قتل کرنے کے سلسلہ میں زیادتی کرنے سے بھی منع کرتا ہے۔

ایک آزاد انسان کی دیت (قیمت ) درج ذیل چیزوں میں سے ایک ہے:

۱۔ ایسے سو اونٹ ہیں جو چھٹے سال میں داخل ہوگئے ہوں۔

۲۔ دو سو گائے۔

۳۔ ہزار گوسفند۔

۴۔ دو سو حلے (یمنی کپڑا)۔

۵۔ ہزار مثقال شرعی سونا ہر مثقال ۱۸ نخود کا ہوتا ہے۔

۶۔ دس ہزا درہم۔

اعضائے بدن کے حقوق

زبان کا حق

زبان کا حق یہ ہے کہ اسے گالی گلوچ سے محفوظ رکھو اور اسے نیک و شائستہ بات کہنے کا عادی بناؤ اسے با ادب بناؤ اسے ضرورت اور دین و دنیاکے فائدہ کے علاوہ بن ہی رکھو اور زیادہ چلنے، بے فائدہ بولنے سے روکو کہ تم اس کے نقصان سے محفوظ نہیں ہو اور اس کا فائدہ کم ہے، زبان عقل کا گواہاور اس کی دلیل سمجھی جاتی ہے اور عقلمند کا عقل کے زیور سے آراستہ ہونا اس کی خوش بیانی ہے، مدد تو بس خدائے بزرگ و برتر ہی کی طرف سے ہے۔

امام زین العابدین ؑ نے نفس کے حق کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ اسے پورے طریقہ سے خدا کی طاعت میں لگا دو اور اپنے ساتوں اعضاء کا بھی خیال رکھو، آپ ساتوں اعضاء کے حقوق کوتفصیل سے بیان فرماتے ہیں آغاز، زبان سے کرتے ہیں اور اس کی حفاظت کا طریقہ بتاتے ہیں :

زبان عظیم ترین نعمت

بیشک خدا نے اس دنیا میں عظیم نعمتوں سے ایک بڑی نعمت جو انسان سے مخصوص کی ہے وہ زبان ہے، سورۂ رحمان میں اس کی عظمت کی تصریح ہوئی ہے،’’ ‘‘انسان کو پیدا کیا اور اس کو بولنا سکھایا، بیان کے معنی کسی چیز سے پردہ ہٹانے کے ہیں۔ زبان انسان کے باطن کی خبر دیتی ہے، اس کے دل کی ترجمان ہے وہ سارے پردوں کو ہٹا کر اس کے دل کے حالات کو ظاہر کردیتی ہے،اگر زبان نہ ہوتی تو انسان دوسرے حیوانات کی مانند صامت ہوتا نہ اپنی بات سمجھا سکتا اور نہ دوسرے کی بات سمجھ پاتا۔

زبانوں کا اختلاف خدا کی نشانی ہے:

قرآن مجید میں خدا کا ارشاد ہے، خدا کی نشانیوں میں سے، آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا، اور تمہاری زبانوں اوررنگوں کا اختلاف ہے بیشک اس میں انسانوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

زبان تعارف کا ذریعہ:

کسی کو پہچاننے کے مختلف طریقیہوتے ہیں ان میں سے ایک زبان بھی ہے، ہرانسان اپنی زبان کے ذریعہ اپنا تعارف کراتا ہے۔ زبان ہی ہے جو انسان کے باطن کے اچھا یا برا ہونے کی خبر دیتی ہے، ہرآدمی کی زبان سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ نیک ہے یا بد، امام محمد تقی ؑ فرماتے ہیں، انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ زبان ہی ہے کہ پردہ ہٹا کرحقیقت کو عیاں کردیتی ہے۔

زبان کی ماہیت:

زبان کے سلسلہ میں حضرت علی ؑ نے ایک چھوٹا سا جملہ فرمایا اور اس کی حقیقت کو واضح کردیا:زبان کا وزن و جرم کم ہے لیکن اس کا گناہ بہت سنگین ہے۔

خدا نے جو اعضاء و جوارح عطا کئے ہیں ان میں سے ہر ایک کا کام جدا اور ہر ایک کی خصوصیت ہے مثلا آنکھ رنگوں اور شکلوں کو دیکھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتی اسی طرح کان آوازوں کو سنتے ہیں اور بس ہاتھ چیزوں کوچھوتے ہیں اور ان کی کیفیت کا پتہ لگاتے ہیں لیکن زبان کے بہت سے کام ہیں زبان خیر و شر اور کامیابی و ناکامی کا سبب بنتی ہے نیک بات کہتی ہے کامیابی کا باعث ہوتی ہے اور غلط بات کہتی ہے تو ناکامی کا سبب ہوتی ہے انسان کو گمراہ کرنے کے لئے یہی شیطان کا آلۂ کار بن سکتی ہے۔

معاشرہ کی بہبود اور تباہی میں زبان کا کردار:

معاشرہ کو سنوارنے اور برباد کرنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک نہایت ہی مؤ ثر طریقہ موزوں بات کہنا ہے ایک زبردست اور قادر الکلام خطیب معاشرہ کی اصلاح کرسکتا ہے اسے انسانی اقدار اور اخلاقی فضائل کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے برخلاف اسے راہ راست سے ہٹا کر غلط راستہ پر لگا سکتا ہے۔

ایک ماہر خطیب پچھڑے ہوئے اور سست معاشرہ کو ترقی کی راہ پر لگا سکتا ہے اور اس کی زندگی کی ڈگر کو بدل سکتا ہے اس کے برخلاف و ہ معاشرہ کی امنگوں اور حوصلوں کو سرد کرسکتا ہے اور حق پسند معاشرہ کو باطل پرستی کی طرف موڑ سکتا ہے اور باطل پرست معاشرہ کو راہ حق پر لگا سکتا ہے۔ مثلاً:

جب اسلامی شہروں میں حضرت علی ؑ کی شہادت کی خبر پہنچی تو شام والوں نے بھی یہ سنا کہ علی ؑ نے محراب عبادت میں شہادت پائی ہے تو اہل شام کی اس کثیر تعداد نے جو حضرت علی ؑ کے خلاف معاویہ کے زر خرید خطیبوں کی تقریر سنتی تھی یہ سوال کیا: کیا علی نماز پڑھتے تھے؟

سب سے بڑا عبادت گزار کہ جس نے نماز قائم کرنے کے لئے جنگ کی، جس کے پاؤں سے حالت نماز میں تیر کھینچ لیا گیا اور اسے مطلق خبر نہ ہوئی شام والوں کی نظر میں وہی غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے نماز مخالف قرار پاتا ہے اور اہل شام اس کے مسجد میں جانے پر تعجب کرتے ہیں، یہ ہے زبان کا اثر کہ وہ حق کو باطل کی صورت میں پیش کرتی ہے۔

بسر بن ارطاۃ اور بنی ہمدان:

معاویہ نے بسر بن ارطاۃ کو بنی ہمدان کا حاکم بنا کر بھیجا تو اس نے ظلم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، کسی میں بولنے کی جرأت نہیں تھی ہر بات دل میں گھٹ کر رہ جاتی تھی، اسی نازک اور خطرناک زمانہ میں سودہ نام کی ایک عورت دین اور لوگوں کو دفاع کرنے شام گئی، معاویہ کے کارندوں نے معاویہ کو خبر دی کہ سودہ نام کی ایک عورت آپ سے ملنے کے لئے آئی ہے، معاویہ کو بہت تعجب ہوا اور کہنے لگا جس کو تلاش کرکے میں تھک گیا وہ خود اپنے پیروں سے میرے دربار میں آگئی، حاضر ہونے کی اجازت دی، سودہ دربار میں داخل ہوئی اور تند و کرخت لہجہ میں معاویہ کو سلام کیا۔

معاویہ نے کہا: دیکھا !تم نے مجبور ہو کر میری خلافت کو سلام کیا! سودہ نے کہا: معاویہ گھمنڈ نہ کروہر ایک کا ایک دور ہوتا ہے جو ختم ہوجاتا ہے۔ یہ منصب کب تک رہے گا ایک روز ختم ہوجائے گا، معاویہ نے کہا: سودہ تمہیں جنگ کا زمانہ یاد ہے کہ جب تم علی کے لشکر میں رزمیہ شعر پڑھ رہی تھی؟ بتاؤ اس سے تمہارا کیا مقصد تھا؟ میری ہلاکت و نابودی ہی تھا؟ وہ اشعار اب پڑھو!

سودہ نے کہا: تمہارے ظلم وستم نے میرے ذہن سے ہر چیز کو محو کردیا ہے، اس وقت میں تمہارے پاس بسر بن ارطاۃ کی شکایت لائی ہوں، اس نے ہماے اوپر ظلم کیا ہے لوگوں کے اموال کو زبردستی چھین لیا ہے، انھیں قتل کیا ہے، معاویہ نے کہا: یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ! میں تمہیں اسی کے پاس بھیجتا ہوں تاکہ جو وہ چاہے تمہارے حق میں فیصلہ کرے۔ سودہ نے یہ شعر پڑھا۔

درود ہو اس جسم پر کہ جو قبر میں ہے اس کے دفن ہوجانے سے عدل بھی دفن ہوگیا۔

معاویہ نے کہا: اس سے تمہاری مراد کون ہے؟ سودہ نے کہا: میرے آقا علی ؑ، اے معاویہ ! جس طرح آج میں تمہارے پاس شکایت لے کر آئی ہوں ایک دن علی ؑ کے پاس ایک شکایت لے کر گئی تھی، علی ؑ نماز پڑھنے کے لئے جارہے تھے، جب آپ نے مجھے دیکھا تو دریافت کیا۔ کس کام سے آئی ہو؟ میں نے عرض کیا: آپ کے مقرر کردہ حاکم کی شکایت لائی ہوں، اے معاویہ! یہ سن کر علی ؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، دست مبارک سے اپنی داڑھی پکڑی اور کہا: اے خدا تو گواہ ہے کہ میں نے اسے لوگوں پر ظلم کرنے کے لئے نہیں بھیجا ہے اسی وقت اس کی معزولی کا پوانہ لکھ کر میر ے سپرد کیا۔ لیکن تم شکایت سننے کے بجائے مجھے دھمکی دیتے ہو، تمہارے اور علی ؑ کے درمیان یہی فرق ہے۔ معاویہ نے مجبور ہو کر بسر بن ارطاۃ کو قتل و غارت گری سے باز آنے کے لئے لکھا۔ یقینا زبان صحیح طریقہ سے چلتی ہے تو بہت تیز کاٹتی ہے۔ یہ زبان ہی تھی جس نے معاویہ جیسے سنگدل کو اپنا موقف بدلنے پر مجبور کردیا۔ معاویہ نے اس وقت یہ بھی کہا تھا کہ علی ؑ نے تمہیں مغرور کردیا ہے، تمہاری قوم کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا ہے:

بلیغ بات کا اثر

حضرت علی بن ابی طالب ؑ اور معاویہ کے درمیان جب خط و کتابت ہوئی تھی تو اس وقت ایک خط آپ نے طرماح کے ہاتھ بھیجا تھا، طرماح، قادرالکلام، برجستہ بولنے والا اور فصیح آدمی تھا خط لے کر وہ معاویہ کی طرف روانہ ہوئے شام پہنچتے ہی انھوں نے معاویہ اور اس کے وزیر عمروعاص سے ملاقات کی اور اپنی فصاحت و بلاغت سے اسے بھی انگشت بدنداں کردیا معاویہ نے سوچا کہ اس برجستہ بولنے والے کو خرید لوں اور پھر اس سے فائدہ اٹھاؤں لہٰذا معاویہ نے کہا: اے دیہانتی ! اگر میں تمہیں کو ئی چیز دوں تو قبول کرو گے؟ طرماح نے کہا: کیوں نہیں ! اگر جان بھی دوگے تو اسے بھی لے لونگا مال کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں،معاویہ نے حکم دیا کہ ان کو دس ہزار درہم دیئے جائیں، دئیے گئے، معاویہ نے کہا اگر کم ہیں تو اور دیدوں ؟ طرماح نے کہا: اضافہ کرنے کا حکم دو! تم اپنی جیب سے تھوڑی ہی دے رہے ہو۔ معاویہ نے دس ہزار درہم مزید دینے کا حکم دیا۔ طرماح نے کہا: دس ہزار اور دو تاکہ تیس ہزار ہو جائیں۔ درہم آنے میں دیر ہوئی تو طرماح نے کہا: کیا مجھ سے مذاق کررہے ہو؟ یا تمہاری بات کو اہمیت نہیں دی جاتی، معاویہ نے جلدلانے کا حکم دیا، درہم طرماح کے سپرد کئے گئے، عمر و عاص نے کہا: امیر المومنین کی بخشش کو تم نے کیسا پایا؟ طرماح نے کہا یہ مسلمانوں کا ملا ہے، خدا کے خزانہ سے اس کے بندے کومل گیا، معاویہ سے کیا مطلب؟ ! طرماح کی گفتگو سے معاویہ کے نام میں دم تھا، اس نے اپنے کاتب کو بلا کر کہا: علی کے خط کا جواب لکھ دو طرماح نے کہا: معاویہ تم علی ؑ کو جنگ سے ڈراتے ہو؟! یہ تو ایسا ہی ہے جیسے شہباز کو ہوا سے اور شیر کو جنگل سے ڈرایا جائے۔ خدا کی قسم علی ؑ کے پاس ایک شہباز ایسا ہے کہ تمہارے سارے چوزوں کو چن کر کھا جائے گا۔ معاویہ نے کہا : ہاں۔ وہ مالک اشتر ہے۔ طرماح کے جانے کے بعد معاویہ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا: اگر میں تم سے کسی کو اپنی حکومت و ملکیت کا دسواں حصہ بھی دیدوں تو بھی وہ اتنی خدمت نہیں کرسکے گا جتنی یہ دیہاتی علی ؑ کی خدمت کرکے چلا گیا، عمروعاص نے معاویہ سے کہا: اے معاویہ! علی ؑ کورسول سے جو نسبت ہے اگر وہی نسبت رسول ؐ سے تمہیں ہوتی تو ہم اس سے زیادہ تمہاری خدمت کرتے معاویہ نے کہا: خدا تمہیں غارت کرے تمہاری یہ بات تو میرے لیے اس دیہاتی سے بھی زیادہ گراں ہے۔

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں کہ اپنی زبان کو نیکی و خوبی کے زیور سے آراستہ کرو تاکہ وہ حق کی خدمت کرکے ایسی عظمت پیدا کرسکے اور معاویہ ایسے دشمن کو عاجز کرسکے۔

فلسفۂ سکوت:

بعض روایات میں خاموش رہنے کی اتنی زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ جس سے سکوت کو بولنے پر ترجیح دی جاسکتی ہے تو سکوت کا فلسفہ کیا ہے اور خاموشی کہاں اختیار کرنا چاہیے؟!

ہم بیان کرچکے ہیں کہ زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے انسان کے ضمیرکو روشن کرنے والی اوراس کی شخصیت کو نمایاں کرنے والی سمجھی جاتی ہے۔ اسی کے ذریعہ فائدہ ونقصان بھی ہوتا ہے۔ حضرت علی ؑ زبان کے بارے میں فرماتے ہیں : زبان ایک درندہ ہے اگر آزاد ہوگا تو زخمی کردے گا۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں : تمہیں اس بات پرتعجب ہونا چاہیے کہ انسان چربی سے دیکھتا ہے، گوشت کے ٹکڑے سے بولتا ہے اور ہڈی سے سنتا ہے اور سوراخ سے سونگھتا ہے۔

زبان جنت یا جہنم میں پہنچانے کا سبب

سہل بن ساعدی رسول ؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص مجھ سے اپنی زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے میں اس سے بہشت کا وعدہ کرتا ہوں۔

رسولؐ سے دریافت کیا گیا:کس چیز کے سبب زیادہ لوگ جنت میں جئیں گے؟فرمایا: تقویٰ اور حسن خلق کے ذریعہ عرض کیا گیا کہ زیادہ تر لوگ کس چیز کے ذریعہ جہنم میں جائیں گے؟ ! فرمایا:فرج و زبان کے ذریعہ۔

معاذ بنجبل نے رسول ؐ سے دریافت کیا: کیا ہمارے بولنے کا ہم سے حساب لیا جئے گا؟ اور اس پرعقاب ہوگا؟ فرمایا:تمہاری ماں، تمہارے غم میں بیٹھے کیا زبان کیچنی ہوئی چیز کے علاوہ لوگ جہنم میں جائیں گے؟!

رسول ؐ کی ان تینوں حدیثوں میں انسان کی کامیابی کو بے جا نہ بولنے اورزبان کو گناہوں سے باز رکھنے میں قراردیا گیا ہیزبان کیحفاظت انسان کو جنت میں پہنچانے کا اہمسبب ہے۔

انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول ؐ نے فرمایا: بندے کا ایمان اس وقت استوار ہوتا ہے، جب اس کا دل استوار ہوجاتا ہے۔ اور دل استوار و صحیح نہیں ہوتا ہے مگر زبان کے استوار ہونے سے اور وہ شخص جنت میں نہیں جاسکتا جو اپنے ہمسایہ کو ستاتا ہے۔

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایمان کا توازن و تعادل، دل کے تعادل سے اور دل کا تعادل زبان کے توازن سے مربوط ہے یعنی جس شخص کی زبان ہی میں تعادل نہ ہو اس کی کسی چیز میں تعادل نہیں ہوگا۔

خاموشی آسان ترین عبادت :

صفوان بن سلیم نے رسول ؐ سے روایت کی ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا: کیا میں تمہیں آسان ترین اور بدن کے لئے ہلکی عبادت بتاؤں ؟

ایک خاموشی اور دوسرے حُسن خلق۔

برائبن عازب کہتے ہیں : ایک عرب رسول ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی : مجھے ایسا عمل اورکام سکھا دیجئے کہ جس سے میں جنت میں چلا جاؤں۔ فرمایا: بھوکے کو کھانا کھلاؤ، پیاسے کو سیراب کرو،نیک باتوں کو حکم دو، بری باتوں سے روکو اور اگر ان چیزوں کو انجام نہ دے سکو تو اپنی زبان کو نیک بات کہنے کے علاوہ بند رکھو۔

رسولؐ نے فرمایا: مومن کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہے۔ بات کہنے سے پہلے وہ اسے دل میں سوچتا ہے اگر دل اس کے اظہار کی اجازت دیتا ہے تو مومن بولتا ہے اور اگر اجازت نہیں دیتا ؛ تو وہ خاموش رہتا ہے، منافق مومن کے برخلاف ہے۔

منقول ہے کہ کچھ لوگ معاویہ کے محل میں محو گفتگو تھے احنف بن قیس ایک کنارے پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے، لوگوں نے ان سے کہا: اے ابو بحر تم کیوں خاموش بیٹھے ہو؟ انھوں نے جواب دیا : اگر جھوٹ بولوں تو خدا کا ڈر ہے اور اگر سچ بولوں تو تمہارا ڈر ہے لہٰذا خاموش رہنا بہتر ہے۔

ان روایات سے خاموش رہنے کی فضیلت آشکار ہوگئی۔ خاموشی کے وقت انسان گناہ کے خطرناک عواقب و انجام سے محفوظ رہتا ہے۔

عقل مند انسان اپنی بات کو پہلے عقل و وجدان کی کسوٹی پر کستا ہے اگر اس پر پوری نہیں اترتی تو خاموش رہتا ہے۔ جو روایات خاموش رہنے کا شوق دلاتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بے محل بات کے انجام سے محفوظ رہے۔ ورنہ بولنا انسان اور سماج کی ترقی کا باعث ہے۔

زبان کا المیہ

علم اخلاق کے ماہر کہتے ہیں : دنیا میں ہر چیز کے لئے ایک آفت ہے، زبان کے لئے بھی کچھ آفتیں ہیں، بعض نے تو زبان کے لئے بیس آفتیں لکھی ہیں ہم یہاں اختصار کے ساتھ انھیں سپرد قلم کرتے ہیں :

۱۔ بے فائدہ بات کہنا:

اس چیز کے بارے میں بولنا بھی زبان کی آفت ہے کہ جس سے کوئی فائدہ نہ ہو بلکہ وقت ضائع ہوتا ہو اس سلسلہ میں رسول ؐ کا ارشاد ہے:انسان کا بہترین اسلام یہہے کہ وہ فضول بات کہنے سے پرہیز کرتا ہو۔

۲۔ ضرورت سے زیادہ بولنا:

رسول ؐ نے فرمایا:خوش نصیب ہے وہ شخص جو زیادہ بولنے سے پرہیز کرتا ہے اور زیادہ مال ناداروں کو دیدیتا ہے۔

۳۔ باطل میں ڈوب جانا:

رسول ؐ فرماتے ہیں : جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لئے کوئی بات کہتا ہے وہ اپنی منزل و مرتبہ سے ایسے ہی گر پڑتا ہے جس طرح کوئی ثریا سے گر پڑے بلکہ اس سے بھی اوپر سے۔

نیز فرماتے ہیں : قیامت کے روز سب سے بڑے خطا کار وہ لوگ ہونگے جو باطل میں گھل مل گئے تھے اس کے بعد قرآن مجید کے اس قول کی طرف اشارہ فرمایا: جب ان سے جہنم میں جانے کا سبب معلوم کیا جائے گا تو وہ کہیں گے ہم لہو و لعب اور باطل کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ سلمان سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا:قیامت کے روز ان گناہگاروں کی تعداد زیادہ ہوگی جنھوں نے خدا کی معصیت میں زیادہ باتیں کہی ہونگی۔

۴۔ بحث و نزاع:

جھگڑنا بھی زبان کی آفتوں میں سے ایک ہے جھگڑنے اور بحث کرنے سے شارع نے منع فرمایا ہے اورجھگڑنے والوں کی مذمت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے:

اپنے بھائی سے بحث اور بیجا مذاق اور وعدہ خلافی نہ کرو، دوسری جگہ فرماتے ہیں : جو خود کو حق پر سمجھتے ہوئے بحث اور جھگڑا کرنا چھوڑ دیتا ہے اس کے لئے بہشت کے بلند ترین طبقہ میں گھر بنایا جاتا ہے اور جوشخص جھگڑا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔حالانکہ وہ جانتا ہے کہ باطل ہے اس کے لئے جنت کے نچلے طبقہ میں گھر بنایا جاتا ہے۔

۵۔ خصومت:

خصومت بھی زبان کی آفتوں میں سے ایک ہے شارع نے اس سے روکا ہے۔کسی کی بات میں اس کو شرمندہ کرنے کی غرض سے عیب نکالنے کو مراء کہتے ہیں اور خصومت، مال یا حق کو حاصل کرنے کے لئے لجاجت کرنے کو کہتے ہیں۔ ابوہریرہ رسول ؐ سے نقل کرتے ہیں :

جو شخص علم کے بغیر کسی سے خصومت کرتا ہے وہ مرتے دم تک خدا کے غضب کے نشانہ رہتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:بہشت میں ایسے محل بنے ہوئے ہیں کہ جن کے اندر سے باہر کا اور باہر سے اندر کا نظر آتا ہے، خدا نے یہ محل ان لوگوں کے لئے بنائے ہیں جو بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور اچھی اچھی باتیں کہتے ہیں، بری بات اور لجاجت سے پرہیز کرتے ہیں۔

اس حدیث کے ذریعہ رسول ؐ ہر مسلمان کو یہ حکم دیتے ہیں کہ بات کہنے میں ادب کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے اور رکیک و بیہودہ بات کہہ کر دوسروں کے سینوں میں دشمنی کی آگ نہ بھڑ کائے بلکہ نپی تلی بات کے ذریعہ دوسروں کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کرے۔

۶۔ حد سے تجاوز کرنا:

کلام کی حد سے تجاوز کرنے کے معنی یہ ہیں کہ بات کہنے میں اتنی تصنع کرے کہ متانت سے خارج ہوجائے۔ جناب فاطمہ زہراؑ اپنے پدر بزرگوار سے نقل فرماتی ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا: میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں، جو خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بہترین کھانا کھاتے

ہیں، بیش قیمت لباس پہنتے ہیں اور تصنع و تکلف کے ساتھ بات کہتے ہیں۔

رسول کی اس حدیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کو اپنی گفتگو میں ایسے سخت اور نامانوس الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہیے جن کو عام لوگ نہ سمجھ سکیں ہاں بلند مطالب کو سلیس و دلنشیں عبارت میں پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ دین کی نظر میں ممدوح ہے۔

۷۔ گالی دینا:

گالی اور فحش شریعت اسلامیہ کے نقطہ نظر سے مذموم ہے، اسے زبان کی آفات میں شمار کیا گیا ہے رسول ؐ فرماتے ہیں :خبردار گالی نہ دینا کیونکہ خدافحش کلامی اور گالی دینے کو پسند نہیں کرتا ہے۔

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں :جو گالی دینے کے مرض میں مبتلا ہے اس پر جنت حرام ہے وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

ایک روایت میں عائشہ سے فرماتے ہیں :اے عائشہ اگر گالی انسان ہوتی یا مرد کی صورت میں آگئی ہوتی تو وہ مرد بدترین ہوتا۔

گالی بکنا بد ترین عادت اور بد خلقی ہے اور جس شخص میں یہ نقص ہے اسے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے علما نے فحش کی تعریف اس طرح کی ہے : نازیبا اور بھونڈی بات کو واضح طور پر کہنا فحش ہے اور جو شخص گالی دیتا ہے یا مد مقابل کو رنجیدہ کرنا چاہتا ہے کہ دوسروں کو آزار پہنچانا قطعا حرام ہے۔ تو اس کا سبب یا بدکاوں اور پست فطرت لوگوں کی ہم نشینی و رفاقت ہے کہ جس سے شریعت نے اسی لئے منع کیا ہے کہ ان کی صحبت سے فحش کلامی اور گالی گلوچ کی عادت پڑتی ہے۔

ایک شخص حضرت رسول ؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی: مجھے نصیحتیں فرمائیے! آپ نے فرمایا: تمہارے لئے ضروری ہے کہ خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور اگر کوئی شخص تمہیں اس چیز کے بارے میں سرزنش کرے جو تمہارے اندر ہو تو تم اسے اس چیز کا طعنہ نہ دو جس کا تمہیں علم ہے کہ اس کے اندرہے۔ نتیجہ میں اس کا گناہ اور وبال اس کے ذمہ ہوگا اور تمہیں اجر و ثواب ملے گا اور خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے کسی پر سب و شتم نہ کرو، وہ شخص کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے کسی پر سب و شتم نہیں کیا۔

رسول کی اس وصیت میں جو نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کی جن برائیوں کو جانتا ہے انھیں ان کے خلاف حربہ کے طور پر استعمال نہ کرے۔

عیاض بن ضمار کہتے ہیں : میں نے رسول ؐ کی خدمت میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول ؐ ! میرے قوم و قبیلہ کا ایک شخص مجھے برا کہتا ہے حالانکہ وہ شخصیت کے لحاظ سے مجھ سے پست ہے۔ کیا میں اپنا دفاع کرتے ہوئے اس پر سب وشتم کرسکتا ہوں ؟ رسولؐ نے فرمایا: ایک دوسرے پر لعنت ملامت کرنے والے دو آدمی د وشیطان ہیں جوایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

۸۔ لعن:

زبان کی آفتوں میں سے ایک لعن ہے جو شخص دوسرے پر لعنت کرتا ہے اور اس کو خدا اور اس کی رحمت سے دور کرتا ہے ایسے لوگوں ا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہوا ہے، جن لوگوں پرخدا نے لعنت کی ہے اور ان کو اپنی رحمت سے مایوس کیا ہے ان میں سے شیطان بھی ہے خداوند عالم کا ارشاد ہے:

بیشک تا قیامت تیرے اوپر میری لعنت رہے گی او رتو ہمیشہ میری رحمت سے محروم رہے گا۔

حقائق کو چھپانے والوں پر بھی لعنت کی گئی ہے:

بیشک جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو، کہ جن کہ ہم نے کتاب (قرآن)میں لوگوں کے لئے بیان کردیا ہے، چھپاتے ہیں خدا ان پر لعنت کرتا ہے او ر تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔

مباہلہ کے واقعہ میں جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دی گئی ہے:

جب عیسیٰ کے بارے میں آپ کے پاس علم آچکا ہے تو جو آپ سے حجت اور جھگڑا کرے تو ان سے کہدیجئے کہ ہم اپنیبیٹوں کو لائیں تم اپنے بیٹوں و لاؤ، ہم اپنی عورتوں کو لائیں تم اپنی عورتوں کو لاؤ، ہم اپنے نفسوں کو لائیں تم اپنے نفسوں کو لاؤ پھر مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں۔

مباہلہ کے معنی لغت میں ’’ رہا کرنے اور قید و بند سے آزاد کرنے کے ہیں اور اسی وجہ سے اس حیوان کو بھی باہل کہا جاتا ہے جس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کے تھنوں پر تھیلا نما کپڑا اس لئے نہیں باندھا جاتا کہ بچہ آزادی سے دودھ پی سکے۔

دعا میں ابتہال کے معنی تضرع کرنا اور سی کام کو خدا کے سپرد کرنے کے ہیں اور اگر کہیں ہلاکت و لعن اور خدا سے دوری کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو اس لئے کہ بندہ کو اس کے حال پر چھوڑنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے اور مذکورہ آیت میں مفہوم کے لحاظ سے دو آدمیوں کے ایک دوسرے پر نفرین کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح اگر چند افراد کسی مذہبی مسئلہ کے بارے میں گفتگو کریں اور اختلاف کے وقت خدا سے یہ دعا کریں کہ جھوٹوں کو ذلیل فرما، مباہلہ کہتے ہیں، آیۂ مباہلہ اہل بیت کی حقانیت اور ان کی عصمت و طہارت پر دلالت کرتی ہے۔

جو کفار اور یہودی کسی پیغمبر کے ظہور کرنے اور اس کی آمد کے منتظر تھے تو جب آنحضرت ان کے پاس آئے تو انھوں نے پہچاننے کے باوجود ان کا انکار کردیا بس کافروں پر خدا کی لعنت ہے۔

بعض موقعوں پررسول ؐ اور علی ؑ بن ابی طالب نے بھی بعض افراد پر لعنت کی ہے ان میں سے دو نمونے یہاں قلم بند کئے جاتے ہیں :

رسول ؐنے ابوسفیان پر سات مرتبہ لعنت کی ہے۔

حضرت علی ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے کہا: رسول ؐ نے فرمایا: سات گروہ ایسے ہیں کہ جن پر خدا و رسول ؐ نے لعنت کی ہے:

۱۔ جنھوں نے خدا کی کتاب میں تحریف کی ہے۔ ۲۔ جنھوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا ہے، ۳۔ جنھوں نے پیغمبر کی سنت کو دوسری چیز سے بدل دیا ہے۔ ۴۔ جو لوگ میری عترت کے بارے میں اس چیز کو حلال سمجھیں جس کو خدا نے حرام کیا ہے، ۵۔ جو اپنی سلطنت و بادشاہت میں انھیں ذلیل کرے۔ ۶۔ جو خدا کی حرام کردہ چیز کو حلال کرے اور خدا کی عبادت پر تکبر کرے۔

مومن لعن نہیں کرتا:

رسول ؐ فرماتے ہیں : مومن دوسروں پرلعنت کرنے میں اپنا وقت صرف نہیں کرتا۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے حیوانات پر بھی لعنت کرنا منع ہے۔ لعنت کے بارے میں جو آیات و روایات وارد ہوئی ہیں ان سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کے لئے، حیوانات نباتات اور جمادات سب پر لعنت کرنا حرام ہے لیکن کفار، منافقین اورعلی بن ابی طالب اور ان کی اولاد کا حق غصب کرنے والوں پر لعنت کرنے کو مستثنیٰ اور ان پر نفرین کرنے کو جائز قرار دیا گیاہے۔

۹۔ غنا اور شعر خوانی:

زبان کی آفتوں میں سے ایک غنا اور شعر خوانی بھی ہے، شحام کی صحیحہ، ابن ابی عمیر کی مرسلہ اور ابو بصیر کی موثقہ میں، جو کافی میں نقل ہوئی ہیں اور عبد العلیٰ کی روایت میں جو کہ معانی الاخبار میں نقل ہوئی ہے اور ہشام کی حسنہ میں، جو کہ تفسیر قمی سے منقول ہے ان تمام روایات میں قرآن کی آیت : واجتنبو۔۔۔۔۔۔۔ الزور اور ’’ والذین۔۔۔۔۔الزور۔ وارد لفظ زور سے مراد غنا ہے اور اس آیت ’’ ومن الناس ـ۔۔۔۔۔۔ سبیل اللہ۔ لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اس لئے موسیقی کے آلات خریدتا ہے تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے منحرف و گمراہ کرے۔ لیکن اشعار سے متعلق جو احادیث آئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک میں اشعار کی مدح اور دوسری میں ان کی مذمت ہے یقینا شعر خوانی اور غنا سے مراد ان کے معنی ہیں کہ جن کو زبان کی آفتوں میں شمار کیا گیا ہے ورنہ آواز اور گنگنانے کا تعلق صرف زبان سے نہیں ہے۔

۱۰۔ بے جا مذاق و مزاح:

حد سے زیادہ مذاق و مزاح کو شریعت میں مذموم سمجھا گیا ہے۔ ایک حدیث میں رسول ؐ کا ارشاد ہے: اپنے بھائی سے مذاق نہ کرو اور نہ اس سے حد سے زیادہ مزاح کرو۔

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں : میں بھی مزاح کرتا ہوں لیکن حد سے زیادہ نہیں اور حق بات کہتا ہوں۔

رسول کا مزاح:

رسول ؐ نہایت ہی دلچسپ مزاح فرماتے تھے۔ ایک روز ایک بوڑھی عورت آپ کی خدمت میں شرف یاب ہوئی، رسولؐ نے فرمایا: بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی، (یہ سن کر) بوڑھی عورت رونے لگی، آپ نے فرمایا: اس روز تم بوڑھی نہیں رہوگی بلکہ جوان ہو جاؤ گی۔ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: ہم انھیں باکرہ اور ایسی بنا دیں گے کہ جیسے انھیں کسی نے چھوا بھی نہ ہو۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : مذاق خندہ آور ہوتا ہے اس کے نتیجہ میں عقل زائل ہوجاتی ہے اور اس سے انسان کا وقار جاتا رہتا ہے۔

۱۱۔ مذاق و ٹھٹھول:

علمائے علم اخلاق نے دوسروں سے مذاق و ٹھٹھول کرنے کو بھی زبان کی آفتوں میں شمار کیا ہے۔ خداوندعالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

اے ایمان لانے والو تم میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ سے مذاق نہ کرے ہوسکتا ہے کہ جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہ ان سے بہتر ہوں جو مذاق اڑا رہے ہیں، اور نہ عورتوں کو دوسری عورتوں کا مذاق اڑانا چاہیے ممکن ہے وہ عورتیں کہ جن کا مذاق اڑایا جارہاہے ان عورتوں سے بہتر ہوں جو مذا ق اڑا رہی ہیں اور ایک دوسرے پر لعن طعن نہ کیا کرو اور ایک دوسرے کے عیب کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارا کرو یہ بہت بری بات ہے کہ ایمان کے بعد کفر کا نام رکھیں اور جو اس پر توبہ نہ کرے وہی ظالم ہیں۔

آیت میں پہلی چیز جو بیان ہوئی ہے وہ مسلمان کی شخصیت کا احترام ہے۔مسلمانوں کو فردی اور اجتماعی روابط میں ایک دوسرے کے احترام کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ہاں مادہ پرست اور خدا شناس لوگوں کا طرز فکر کلی طور پر مختلف ہے، مادہ پرست شخصیت اور اس کے احترام کو خوبصورت چہرہ اور متناسب الاعضاء بدن میں منحصر سمجھتا ہے لیکن ایک مسلمان کا محور فکر، انسانی کمالات اور اخلاقی پہلوہوتے ہیں۔

آیت کا یہ جملہ ’’ عسیٰ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آمنھم ‘‘ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مذاق کا مخالف ہے چونکہ انسان ایک دوسرے کے باطن اور جذبات سے بے خبر ہے لہٰذا اس کی نظر میں وہ حقیقی انسان کے چہرہ اور بدن کے لحاظ سے انسان ہے کیونکہ دونوں یکساں نظر آرہے ہیں اور ممکن ہے بد شکل انسان کا مذاق اڑایا جائے حالانکہ اگر اس کے انسانی ملکات و کمالات آشکار ہوجاتے تو کبھی اس کا مذاق نہ اڑایا جاتا شخصیت کا معیار کچھ پنہاں اور غیر مرئی امور ہیں لہٰذا ظاہری اسباب کی بنا پر تمسخر کرنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے۔

تمسخر کرنے کا نفسیاتی محرک:

نفسیاتی نقطۂ نظر سے وہی لوگ تمسخر و مذاق کرتے ہیں کہ جو شخصیت کے اتبار سے ناقص ہوتے ہیں وہ دوسروں کی توہین و تحقیر کرکے اپنے نقص کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ جن لوگوں کی شخصیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی وہ کسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔

دوسروں کی امانت کرنے اور ان کے شرمندہ ہونے سے لذت اندوز ہونے والے افراد کی طبیعت میں ایک قسم کی درندگی ہوتی ہے، بس دونوں میں یہ فرق ہے کہ درندے انسان کے جسم پر حملہ کرتے ہیں اور یہ لوگوں کی عزت آبرو کو نشانہ بناتے ہیں۔

مسخروں کے بارے میں امام سجاد کا نظریہ:

ایک دن ایک مسخرہ امام زین العابدین ؑ کے دوش سے ردا اچک لے گیا۔ امام نے اپنی زبان سے کچھ نہ فرمایالیکن لوگوں نے اس کا تعاقب کیا اور اس سے ردا چھین لائے۔ امام نے معلوم کیا: یہ حرکت کس نے کی تھی ؟ عرض کیا: ایک مسخرہ تھا جو لوگوں کو ہنسانے کے لئے ایسا کرتا ہے۔ امام نے فرمایا: اس سے کہہ دینا: ’’ان اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ المبطلون ‘‘ خدا کا ایک دن ہے اس دن وہ لوگ گھاٹا اٹھائیں گے جو دوسروں کا مذاق اڑانے میں عمر گنواتے ہیں۔

ناقص الاعضاء لوگوں سے مذاق کرنا منع ہے:

بعض لوگ کسی وجہ سے ناقص الاعضاء ہوتے ہیں اور ظاہری صحت و سلامتی سے محروم ہوجاتے ہیں ایسے افراد سے اگر کوئی مذاق کرتا ہے تو انھیں بہت دکھ ہوتا ہے، ایک تو اس لئے کہ دوسرے انسان ان کی توہین کررہے ہیں دوسرے اس لئے کہ ان کے اندر ایک نقص پیدا ہوگیا ہے، حضرت علی بارگاہ خدا میں دعا فرماتے ہیں :

اللھم اجعل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عندی۔

اے اللہ ! جو عظیم نعمتیں تونے مجھے عطا کی ہیں ان میں سے اولین نعمت جو تو مجھ سے سلب کرے وہ میرا نفس وجان ہو اور جو امانتیں تو نے میرے سپرد کی ہیں ان میں سے اولین امانت جو تو مجھ سے واپس لے وہ میری حیات و زندگی ہو۔

حضرت امام حسین دعائے عرفہ میں بارگاہ خدا میں عرض پرداز ہیں :

’’ ومتعنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ظلمنی ‘‘

پروردگار مجھے میرے تمام اعضاء سے بہرہ مند فرما میرے کان اور آنکھ کو میرا وارث قرار دے یعنی مجھے آخر عمر تک اندھا اور ناقص الاعضا ہونے سے محفوظ رکھ۔

جاحظ اور مسخرے پن کانتیجہ:

جاحظ تیسری صدی ہجری کا ایک بڑا عالم تھا اس کی بہت سی کتابیں اور علمی آثار آج بھی موجود ہیں وہ بہت ہی کریہہ المنظر اور بد شکل تھا حضرت علی ؑ سے دشمنی کا اظہار کرتا تھا اور آپ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تھا اسی لئے بنی عباس کے خلفاء اس کی حمایت کرتے تھے ایک روز اس نے اپنے شاگردوں سے کہا: پوری زندگی میں مجھے سب سے زیادہ ایک عورت نے شرمندہ کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ ایک دن میں نے ایک عورت کو دیکھا، اس نے مجھ سے اصرارکیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں، میں نے منظور کرلیا وہ مجھے مجسمہ ساز کے پاس لے گئی اور اس سے کہا: اس شیطان کی مانند، یہ کہا اور چلی گئی میں حیرت زدہ رہ گیا،میں نے دوکاندار سے معلوم کیا معاملہ کیا ہے؟ اس نے بتایا: اس عورت نے مجھ سے شیطان کا مجسمہ بنانے کی فرمائش کی تھی، میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ میں نے شیطان کو نہیں دیکھا ہے، اس کا مجسمہ کیسے بناؤں ؟ آج وہ تمہیں یہاں لائی اور بزعم خود اس نے تمہیں شیطان سمجھا ہے۔

۱۲۔ راز فاش کرنا:

زبان کی ایک آفت دوسروں کے راز کو فاش کرنا بھی ہے، شریعت نے راز فاش کرنے کی مذمت کی ہے۔ رسول ؐ فرماتے ہیں :

جب کوئی شخص کوئی بات کہتا ہے اور پھر رخ موڑ لیتا ہے تو وہ سننے والے کے پاس امانت ہوتی ہے۔

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں : ایک دوسرے کی بات تمہاے پاس امانت ہے، حسن ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

خیانت یہ بھی ہے کہ تم اپنے بھائی کا رازفاش کرو۔

۱۳۔ جھوٹا وعدہ:

زبان کی آفتوں میں سے وعدہ کرکے اسے وفا نہ کرنا بھی ہے۔ وعدہ وفا کرنا اللہ والوں کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ قرآن فرماتا ہے: اے ایمان لانے والو! اپنے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرو۔

رسول نے فرمایا: وعدہ، انسان کے دین کا جز ہے، خداوند عالم نے حضرت اسمعیل کے صادق الوعد، ہونے کی تعریف کی ہے چونکہ انھوں نے اپنا وعدہ وفا کیا تھا لہٰذا انھیں قرآن مجید میں اس نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

۱۴۔ قول و قسم میں جھوٹ:

جھوٹ بڑے گناہوں میں سے ایک ہے اور اس سے انسان کی عزت و آبرو کافور ہوجاتی ہے، قرآن مجید اور حیدث میں جھوٹی بات کہنے اور جھوٹی قسم کھانے کی مذمت کی گئی ہے اس سلسلہ میں بہت سی آیات و روایات موجود ہیں ہم ان میں سے بعض کو یہاں تحریر کرتے ہیں :

ابو سعید کہتے ہیں : میں نے رسول ؐ سے سنا کہ خدا سے دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں : اے پروردگار! میرے دل کو نفاق سے اور میرے دامن کو زنا کی آلودگی سے اور میری زبان کو جھوٹ بولنے سے پاک و صاف رکھ۔

امام محمد باقر ؑ فرماتے ہیں : جھوٹ ایمان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : کوئی بھی بندہ ایمان کا مزہ نہیں چکھ سکتا یہاں تک کہ وہ جھوٹ سے پرہیز کرے خواہ جھوٹ سنجیدگی کے ساتھ ہو یا مذاق میں۔

ایک شخص نے رسول ؐ کی خدمت میں عرض کی : اے اللہ کے رسول ؐ ! کیا مومن زنا کرتا ہے ؟ فرمایا: کبھی، عرض کی مومن چوری کرتا ہے ؟ فرمایا: کبھی کر لیتا ہے، عرض کی: کیا مومن جھوٹ بولتا ہے؟ فرمایا: ہرگز، خداوند عالم فرماتا ہے : جھوٹ کا بہتان تو وہی لوگ باندھتے ہیں جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔

حضرت امام حسن عسکری ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: تمام گناہوں کو ایک گھر میں ذخیرہ کردیا گیا ہے اور اس گھر کی کنجی جھوٹ ہے۔ یعنی اگر کسی نے جھوٹ بولنا شروع کردیا تو وہ تمام گناہوں میں مبتلا ہوسکتا ہے۔

جھوٹ کا سرچشمہ:

رسول ؐ نے فرمایا: جھوٹ بولنے والا اس نقص و کمی کے باعث جھوٹ بولتا ہے جس کو وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ بنابرایں جھوٹ کا سرچشمہ نفس کی پستی و کمی ہے۔

جھوٹ کا مد مقابل صداقت و سچ ہے جس کا تعلق نفس پر اعتماد سے ہے۔ ایک روز حجاج نے ایک طولانی تقریری کی مجمع کے درمیان سے ایک شخص نے بآواز بلند کہا: نماز کا وقت ہوگیا: تقریر کا دامن سمیٹئے نہ وقت تمہارے لئے ٹھہرے گا اور نہ خدا تمہاے عذر کو قبول کرے گا، اس بات پر حجاج کو بہت غصہ آیا اور اس کو قید خانہ میں ڈالنے کا حکم دیدیا اس کے عزیز واقارب حجاج کے پاس گئے اور درخواست کی کہ وہ پاگل ہے۔ حجاج نے کہا: اگر وہ اپنے پاگل ہونے کا خود اعتراف کرلے تو ٹھیک ہے وہ لوگ قید خانہ میں اس شخص کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تم اپنے پاگل ہونے کا اعتراف کرلو اس طرح تم رہا ہو جاؤ گے، اس نے کہا:خدا نے مجھے صحیح سالم اورعاقل پیدا کیا ہے، میں دیوانہ نہیں ہوں، اپنے پاگل ہونے کا جھوٹا اعتراف کیوں کروں ؟ انھوں نے حجاج کو خبر دی کہ وہ یہ کہتا ہے۔ چنانچہ حجاج نے اس کے سچ کے احترام میں اس کو آزاد کردیا۔

۱۵۔ غیبت:

زبان کی پندرہویں آفت غیبت ہے، غیبت کی بحث شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی تعریف بیان کردی جائے : شہیدثانی نے کتاب الریبہ ’’ میں غیبت کی تعریف کی ہے ‘‘ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی طرف ایسی بات کی نسبت دینا جس کو وہ پسند نہ کرتا ہو اور عرف میں اس بات کو عیب سمجھا جاتا ہو اور کہنے والے کا مقصد بھی اس میں عیب و نقص ثابت کرنا ہو۔

لوگوں نے جناب ابوذر سے غیبت کے معنی معلوم کئے تو انھوں نے جواب دیا اپنے مسلمان بھائی کی عدم موجودگی میں ایسی بات کہنا کہ اگر وہ سنے تو اسے تکلیف ہو۔

شریعت اسلام میں غیبت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ شیخ انصاری ؒ نے مکاسب میں کچھ دلیلوں کی بنا پر اسے حرام قرار دیا ہے اور اس کے حرام ہونے میں درج ذیل آیتوں سے تمسک کیا ہے:

اور تم میں سے بعض، بعض کی غیبت نہ کریں کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے یقینا یہ بات تمہیں پسند نہیں ہے۔

غیبت اس لئے بھی منفور عمل ہے کہ غیبت کرنے اور سننے والے دونوں ہی ایک مجبور و بے دفاع انسان پر حملہ کرتے ہیں۔ ایک تو ایسے مردہ کا گوشت کھاتا ہے کہ جس میں کوئی حس و حرکت نہیں ہے اور دوسرا اس شخص کو اپنے حملہ کا نشانہ بناتا ہے جو وہاں موجود نہیں ہے کہ اپنا دفاع کرے۔ اس تشبیہ و مثال میں قرآن نے چار چیزیں بیان کی ہیں :

۱۔ مسلمان اور ہم مذہب، سگے بھائی کی مانند ہیں۔ ۲۔ اس کی عزت و آبرو اس کے گوشت کی مانند ہے۔ ۳۔ اس کی غیبت کرنا اور اس کی عزت پر حملہ آور ہونا اس کا گوشت کھانے کے مثل ہے۔ ۴۔ اور چونکہ وہ اس جگہ موجود نہیں ہے اور اس حملہ سے باخبر نہیں ہے لہٰذا اپنا دفاع نہیں کرسکتا گویا کہ وہ اس مردہ کی مانند ہے کہ جس کو چیرا پھاڑا جارہا ہو اور وہ اف بھی نہ کررہا ہو شاید حضرت علی ؑ نے اسی وجہ سے غیبت کرنے والے کو عاجز قرار دیا ہے : غیبت عاجز و کمزور کا حربہ ہے۔

دوسری آیت کہ جس سے غیبت کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے یہ ہے:

جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں کے درمیان کسی برائی کو پھیلائیں ان کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے در حقیقت خداوند عالم جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

چونکہ انسان اجتماعی زندگی گذارنے کا خوگر ہے لہٰذا وہ جس معاشرہ میں زندگی بسر کرتا ہے وہ معاشرہ اس کے گھر کی مانند ہے اسے چاہیے کہ اس معاشرہ کی حفاظت اسی طرح کرے جس طرح وہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے اور اس میں گندگی و فساد پیدا نہ ہونے دے۔ اسی بنا پر اسلام نے ہر اس چیز سے شدید طور سے جنگ کی ہے کہ جو معاشرہ کی فضا کو آلودہ اور گندہ کرتی ہے، اسلام نے غیبت کی بھی شدید طور پر مذمت کی ہے کہ اس میں پوشیدہ عیوب ظاہر ہوتے ہیں اور اسلام کو یہ بات پسند نہیں ہے، مسلمان بھائی کے عیوب کو چھپانے کا حکم اسی طرح بامفہوم ہوسکتا ہے۔ تیسری آیت کہ جس سے شیخ انصاری نے غیبت کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے یہ ہے:

خدا ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا ہے جو اپنی باتوں کے ذریعہ برائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ ’’ سوئ‘‘ سے مراد ہر قسم کی برائی اور بدی ہے اور قول میں جہر سے مراد ہر قسم کا لفظی اظہار ہے۔ یہ اظہار خواہ شکایت کی صورت میں ہو یا حکایت و بیان کی شکل میں یا لعنت و تذلیل کے پیرایہ میں یا غیبت کے انداز میں اسی لئے مذکورہ آیت سے غیبت کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے۔

چوتھی آیت، کہ جس سے استدلال کیا گیا ہے، یہ ہے:

وائے ہو ہر عیب جو اور مسخرہ کرنے والے پر۔

بعض مفسرین کا قول ہے کہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ سول ؐ کی عدم موجودگی میں آپ کی غیبت کیا کرتا تھا اور آپ کو دیکھ کر مذاق اڑاتا تھا۔

ہمزہ اور لمزہ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اگرچہ مبالغہ کے مشہور اوزان پر نہیں ہیں، پہلے کا مادہ ہمزہے جس کے معنیٰ توڑنا ہے اور چونکہ عیب جو اور غیبت کرنے والے دوسروں کی شخصیت کو پاش پاش کرتے ہیں اس لئے ان پر بھی ہمزہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ لمزہ ’’ لمز ‘‘ سے مشتق ہے اور رمز کے وزن پر ہے جس کے معنیٰ عیب جوئی اور غیبت کرنا ہیں۔

حدیث کی رو سے غیبت کا حرام ہونا:

غیبت کے حرام ہونے کے سلسلہ میں عامہ و خاصہ کے طریق سے بہت سی حدیثیں وارد ہوئیں ہیں اور ان میں اس گناہ کے برے اور غلط آثار مختلف مثالوں میں بیان ہوئے ہیں، ان میں سے چند نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

رسول ؐ فرماتے ہیں : ہر مسلمان کا خون و مال ار اس کی (ہتک) عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے اور فیض کاشانی نے کتاب ’’ محجۃ البیضاء ‘‘ میں غیبت کو عزت و شرف کا مصداق قرار دیا ہے۔ جابر اور ابو سعید دونوں نے رسول ؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: خبردار غیبت نہ کرنا کیونکہ غیبت زنا سے زیادہ سخت ہے کیونکہ کبھی آدمی زنا کا مرتکب ہوتا ہے اور پشیمان ہو کر خدا سے توبہ کرتا ہے اور خدا اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے، لیکن غیبت کرنے والا اس وقت تک نہیں بخشا جائے گا جب تک کہ وہ خود معاف نہ کردے کہ جس کی غیبت کی تھی۔

شب معراج

انس کہتے ہیں : رسولؐ نے فرمایا: شب معراج میرا گزر ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو ناخنوں سے اپنا چہرہ نوچ رہے تھے، میں نے جبرئیل سے معلوم کیا کہ یہ کون لوگ ہیں ؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ لوگوں کی غیبت کرکے ان کی عزت و آبرو کو برباد کیا کرتے تھے۔

غیبت اور اس کا رد عمل:

اس دنیا کے ثابت و مستقل قوانین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے اس کا رد عمل ضرور ہوتا ہے اس سلسلہ میں درج ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیں :

پہاڑ کے سامنے کھڑے ہو کر آواز لگا نا صدا کی بازگشت کا سبب ہوتا ہے۔ توپ کا گولہ جتنی تیزی کے ساتھ اوپر کی طرف جاتا ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ نیچے آتا ہے۔ کھٹائی کا نام سن کر منھ میں پانی آجاتا ہے، یہی عمل اور در عمل ہے ) مثنوی کہتے ہیں :

براء کہتے ہیں :رسول ؐ نے ہمارے درمیان خطبہ دیا یہ خطبہ کچھ ایسا تھا کہ طلقاء نے، جن سے چشم پوشی کرلی گئی تھی، گھروں میں سنا تھا۔ فرمایا: اے وہ لوگو! جو زبان سے ایمان لائے ہو نہ دل سے! مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو اور ان کی کمزوریوں کی ٹوہ میں رہا کرو کیونکہ اگر کوئی ایسا کرے گا تو خدا اس کے راز اور کمزوریوں کو آشکار کردے گا۔ اور خدا ایسا کرنے والے کے راز کو فاش کردے گا۔

یہی رد عمل ہے اس سلسلہ میں عامہ و خاصہ کے طریق سے روایات نقل ہوئی ہیں مذکورہ حدیثیں عامہ کی نقل کی ہوئی تھیں اب خاصہ کی نقل کردہ حدیثیں ملاحظہ فرمائیں :

شیخ صدوق نے اپنی سند سے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

جو شخص اپنے بھائی کی غیبت کرنے اور اس کے عیوب یا خفیہ باتوں کو آشکار کرنے کے لئے جاتا ہے اس کا پہلا قدم جہنم کی طرف اٹھتا ہے اور خداوند عالم اس کے عیوب کو لوگوں کی نظر میں آشکار کردیتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی غیبت کرتا ہے اس کا روزہ اور وضو باطل ہوجاتا ہے اور اگر وہ اس حال میں مر جائے تو خدا کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھتے ہوئے مرے گا۔

واضح رہے کہ روزہ اور نماز کا یہ بطلان فقہی بطلان نہیں ہے، غیبت کو فقہا نے مبطلات روزہ اور وضو میں شمار نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہاں ان کے باطل ہونے سے مراد یہ ہے کہ روزہ اور وضو کے آثار ختم ہو جائیں گے۔

امام صادق ؑ نے رسول ؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: غیبت انسان کے ایمان کو برباد کرنے میں، کینسر کے جراثیم کے بدن میں دوڑنے سے بھی زیادہ تیز ہے۔ بنا برایں یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیبت دین کا سرطان ہے۔

مفضل نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: جو شخص کسی مومن کے نقصان کے لئے بات کہتا ہے اور اس سے اس کا مقصد اس مومن کو ذلیل کرنا اور اس کو اس طرح نقصان پہنچانا ہو کہ لوگوں کے درمیان اس کی عزت ختم ہوجائے تو خداوند عالم اسے اپنی ولایت سے نکال کر شیطان کی ولایت کی طرف ڈھکیل دیتا ہے اور شیطان بھی اس کو قبول نہیں کرتا ہے۔

غیبت صرف زبان ہی سے نہیں ہوتی:

ہر وہ چیز جو دوسرے کے نقص و عیب کو ظاہر کرے اور اس چیز کو سمجھائے کہ جس کو وہ ناپسند کرتا ہو تو وہ بھی غیبت ہے، خواہ زبان کے ذریعہ ہو، کھلم کھلا ہو یا اشارہ، کنایہ اور رمزوایما کے ذریعہ یا طعنے دینے اور لکھنے کے وسیلہ سے، زبان سے غیبت کرنا اس لحاظ سے حرام ہے کہ غیبت کنندہ اپنے بھائی کے عیب کو دوسرے سے بیان کرتا ہے، بنا برایں کسی بھی ذریعہ سے عیب سمجھانا غیبت ہے اور حرام ہے، لنگڑا کر چلنا یا کسی کی نقل کرنا حرام ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہ عیب کو زیادہ واضح کرتا ہے، ایک عورت عائشہ کے پاس آئی جب وہ چلی گئی تو عائشہ نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ پستہ قد ہے رسول ؐ نے فرمایا: تم نے اس کی غیبت کی ہے۔

سننے والا بھی غیبت میں شریک ہے:

رسول ؐ نے فرمایا: غیبت سننے والا بھی غیبت کرنے والوں کا شریک ہے۔ بنا بر ایں سننے والابھی گناہ سے نہیں بچ سکتا مگر یہ کہ زبان سے اس کو غلط قرار دے یا کسی طریقہ سے اس کی بات کو قطع کردے یا وہاں سے اٹھ کر چلا جائے اگر ان میں سے کوئی بھی کام نہ کرسکے تو اس کو دل سے غلط سمجھے، لیکن اگر زبان سے یہ کہے: میاں ! چپ ہوجاؤ، اور باطنی طور پر اس سے خوش ہوتو یہ نفاق ہے رسولؐ نے فرمایا:

جس شخص کے سامنے کوئی شخص کسی مومن کو ذلیل کرے اوروہ اس کی مدد کرسکتا ہو لیکن مدد نہ کرے تو خدا روز قیامت اسے ساری مخلوق کے سامنے ذلیل و رسوا کرے گا۔

نیز فرمایا:

جو شخص اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی عزت و آبرو کا دفاع کرے تو خدا پر یہ حق ہے کہ قیامت کے دن اس کی عزت و آبرو کو بچائے۔

آپ ہی کا ارشاد ہے:

جو اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی عزت کی حفاظت کرتا ہے تو خدا پر یہ حق ہے کہ اسے جہنم سے نجات عطا کرے۔

غیبت کے محرکات:

جن چیزوں کو علما نے غیبت کے محرکات میں شمار کیا ہے، وہ یہ ہیں :

۱۔ غضب، کینہ یا حسد، اس صورت میں غیبت، علم اخلاق کی اصطلاح میں قوۂ غضبیہ کے رذائل میں سے ہے۔

۲۔ تمسخر اور استہزاء، کسی شخص کا ہنسی مذاق اڑانا یا لوگوں کو ہنسانے کے لئے کسی کی نقل کرنا اس کا تعلق اس کی قوۂ شہویہ سے ہے۔

۱۔ فخرومباہات، دوسرے کے عیوب بیان کرکے بڑا بننا مثلا یہ کہے: وہ تو کچھ نہیں جانتا اور اس سے اس کا مقصد اپنی برتری ثابت کرنا ہو تو یہ بھی قوۂ غضبیہ کے رذائل میں شمار ہوتا ہے۔

کسی شخص کی طرف کسی غلط کام کی نسبت دینا، اس کو بیان کرنے سے اس کا مقصد خود کو پاک و بے عیب ثابت کرنا ہو اس کام کے لئے کبھی دوسرے کو کسی کام میں اس لئے اپنا شریک قرار دیتا ہے تاکہ اس کام میں وہ خود کو معذور ثابت کرے۔

۵۔ اپنے دوستوں کی ہمنوائی کرنا، مسلمانوں کے عیوب بیان کرنے کے سلسلہ میں اس لئے اپنے دوستوں کی ہمنوائی کرتا ہے تاکہ وہ اس سے نفرت نہ کریں، اس قسم کی غیبت کا محرک نفس کی کمزوری ہے۔

۶۔ کسی بڑی شخصیت کے سامنے کسی شخص کے عیوب کو اس لئے بیان کرنا کہ اس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت و حیثیت نہ رہے اس کی بنیاد بھی خوف اور ضعف نفس ہی ہے۔

۷۔ مہربانی و ہمدردی: مثلاً کسی شخص کو کسی پریشانی میں مبتلا دیکھ کر یہ کہے اس غریب نے اس غلط کام سے مجھے بھی دکھ پہنچایا، میں بھی اس کے غم میں اس کا شریک ہوں لیکن اس کا یہ نام لینا اور اس کے عیب کو ظاہر کرنا بھی غیبت میں شمار ہوتا ہے۔

۸۔کسی کے غلط کام پر تعجب کا اظہار کرنا مثلاً یہ کہے: تعجب ہے فلاں شخص ایسے غلط کام کا مرتکب ہوا ہے گویا یہ تعجب کرنے والا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پیرایہ میں اس آدمی سے ناراضگی کو ظاہر کرنا چاہتا ہے یہ شخص نہ جانتے ہوئے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔

علمائے علم اخلاق نے انسان کے اندر غیبت کے یہ آٹھ محرکات بیان فرمائے ہیں۔

غیبت کے علاج کا طریقہ:

اس خانما نسوزا اور مہلک مرض کا علاج یہ ہے کہ پہلے مرحلہ میں اس کی خرابیوں اور اس کی جزاء میں ملنے والی اخروی سزاؤں کو یاد کرے، دوسرے مرحلہ میں اس کے دینوی نقصانات اور برائیوں کو یاد کرے لیکن ان سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ اپنے وجود سے غیبت کے محرکات کا صفایا کر دے۔

اگر کسی سے کوئی غلط کام سرزد ہوجاتا ہے اور وہ اس کام کی نسبت دوسرے کی طرف دیتا ہے تو اس کے علاج کا طریقہ ہے ہے، اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کے غضب کا نشانہ بننا مخلوق کی دشمنی سے کہیں زیادہ سخت ہے اور اسے یہ جان لینا چاہیے کہ یہ بہت بڑی نادانی ہے۔

اپنے لئے جواز پیدا کرنے کے لئے اس طرح کسی کی غیبت کرنا کہ اس نے بھی یہ غلط کام کیا ہے لہٰذا میں نے بھی کیا ہے مثلاً یہ کہے: چونکہ فلاں شخص نے حرام کھایا ہے لہٰذا میں نے بھی حرام کھا لیا ہے۔ جو شخص خدا کی مخالفت کرتا ہے اس کی پیروی نہیں کرنا چاہیے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ جو شخص اپنے برے فعل کا دوسرے کے برے فعل سے موازنہ کرتا ہے اس کے عذر و بہانہ کا سرچشمہ اس کے نفس کی خباثت ہے۔

اور جہاں غیبت کا محرک دوستوں اور ساتھیوں کی موافقت ہو تو اس کا علاج یہ ہے اسے یہ بات یاد رکھنا چاہیے۔ اگر وہ مخلوق کی خوشنودی کو خدا کی خوشنودی قر مقدم کرتا ہے تو خدا کے غضب میں مبتلا ہوگا اور مومن ہرگز ایسا کام نہیں کرتا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس شخص کے نزدیک خدا پست مخلوق سے کم اہمیت رکھتا ہے؟!

لیکن جہاں غیبت کا محرک دوسرے کی بات کے اثر کو زائل کرنا ہو وہاں اس کا علاج یہ ہے: اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کسی چیز کے گمان و احتما ل کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ وہ چیز واقع ہوگئی ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص اس کی برائی نہ کرے یا اس کے خلاف گواہی نہ دے۔ بنابرایں وہم کی وجہ سے تلافی کرنا انسان کے ایمان کے منافی ہے۔

اگر غیبت کا محرک کسی کی ہمدردی اور اس سے محبت ہو یا خدا کے غضب کی بنا پر غیبت ہو اگرچہ یہ چیز اچھی ہے لیکن اگر اس میں غیبت کا عنصر ہوگا تو اس کا اجروثواب ختم ہوجائے گا۔ ایسی غیبت کا علاج یہ ہے کہ اگر وہ غور کرکے اس نتیہ پر پہنچے کہ اس ہمدردی اور تعجب کا محرک ایمان اور دین کی حمایت ہی ہے تو صحیح ہے اور اگر اس میں غیبت کا عنصر ہوتو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دین کی حمایت نہیں ہے۔

غیبت اور آزادیٔ بیان:

زبان کی آفتوں، خصوصاً غیبت، کی وضاحت کرنے کے بعد ہم اس بحث کو شروع کرتے ہیں کہ اسلام میں آزادیٔ بیان ہے یا نہیں ؟ اگر بیان کی آزادی ہے تو کس حد تک؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام کے حقوقی نظام میں بیان کی آزادی کو محترم شمار کیا گیا ہے۔ اس بات کا ثبوت وہ آیات و روایات ہیں جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے:پس ان بندوں کو بشارت دیدیجئے جو بات سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور یہی صاحبان عقل و خرد ہیں۔

واضح ہے کہبہترین بات کی پیروی اسی جگہ کی جاسکتی ہے جہاں بیان کی آزادی ہو اور اچھی بری باتوں کا موازنہ کرکے اچھی بات کی پیروی کی جاسکے، حضرت علی بن ابی طالب ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:یہ دیکھو کہ کیا کہا: یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا:

آپ کا قول ہے: علم و حکمت کو حاصل کرو خواہ وہ گمراہوں سے حاصل ہو حکمت لے لو خواہ مشرکوں سے ملے۔

مخالف افکار سے معصومین ؑ کس طرح مقابلہ کرتے تھے:

دین کے رہبروں کی سیرت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مخالفوں کے عقائد کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کرنے کی بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ مثلاً جن لوگوں ’’ جیسے سعد بن ابی وقاص اور ابو موسیٰ اشعری وغیرہ ‘‘ نے حضرت علی ؑ کی، آغاز خلافت میں، بیعت نہیں کی تھی، آپ نے ان پر دباؤ بھی نہیں ڈالا اور جن لوگوں، جیسے طلحہ و زبیر، نے بیعت توڑ دی تھی اور آپ کے خلاف جنگ بھڑکائی تھی، ان سے بھی آپ نے ممکنہ حد تک جنگ سے پہلو تہی کی۔

کتاب و سائل الشیعہ میں مرقوم ہے: حضرت علی ؑ نے ان لوگوں میں سے کسی ایک کو بھی کافر و مشرک قرار نہیں دیا جنھوں نے آپ سے جنگ کی تھی بلکہ آپ یہی فرماتے تھے : وہ ہمارے بھائی ہیں انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔

اسی طرح امام صادق کی ابن العوجا ء جیسے لوگوں سے نپی تلی رسم و راہ تھی، لہٰذا بیان کی آزادی پر کوئی قدغن نہیں ہے ہاں اسلام میں فتنہ و فساد ممنوع ہے خواہ کسی بھی طریقہ سے ہو۔

فقہی نقطۂ نظر سے زبان کی قیمت

زبان کے حق کی بحث اپنی اہمیت کی بنا پر طولانی ہوگئی ہے، اس کے خاتمہ پر ہم فقہی نقطۂ نظر سے زبان کی قیمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شارع نے انسان کی صحیح زبان کی مکمل دیت معین کی ہے جو بجائے خود زبان کی اہمیت و قیمت کی دلیل ہے۔ محقق حلی اپنی کتاب ’’ مختصر النافع‘‘ میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں :

صحیح ز بان کی دیت کامل دیت ہے اگر اس کا کچھ حصہ کٹ جائے تو حروف معجم کے لحاظ سے دیکھا جائے گا جو کہ ۲۸ ہیں اور گونگے کی زبان کی دیت ایک تہائی ہے۔

آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید ابو القاسم الخوئی ’’ تکملۃ المنہاج‘‘ میں اس طرح رقم طراز ہیں :

جہاں زبان کا فائدہ ختم ہوجائے وہاں صحیح زبان کے کٹے ہوئے حصہ کی مقدار کی مساحت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا معیار وہ حروف ہیں جو زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ بنا بر ایں اگر مساحت کے لحاظ سے زبان کا ایک چوتھائی حصہ کٹا ہو لیکن زبان سے نصف حروف ادا ہوتے ہوں تو اس صورت میں نصف دیت دی جائے گی اور اگرمساحت کے اعتبار سے آدھی زبان قطع ہوجائے مگر حروف کے لحاظ سے ایک چوتھائی کو نقصان پہنچا ہو تو اس صورت میں ایک چوتھائی دیت دی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے زبان کی مساحت مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی دیت میں صحیح طریقہ سے حروف کی ادائیگی کو معیار سمجھا گیا ہے۔

کان کا حق

کان کا حق یہ ہے کہ تم اسے اپنے دل کا راستہ بنانے سے پاک رکھو ہاں اسے اس بہترین بات کے لئے دل کا رساتہ بناؤ جو تمہارے دل میں پیدا ہو جو تمہیں بہترین اخلاق سے آراستہ کرے کیونکہ کان دل کا راستہ ہے اور وہ بہترین معافی کو درک کرتا ہے کان دل تک خیر یا شر کو پہنچاتا ہے اور طاقت و قوت صرف خدا کی ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: اے رسول کہدیجئے خدا وہی ہے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں کان، آنکھ اور دل عطا کئے لیکن تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

انسان کے تکامل میں قوت سامعہ کا اثر:

جب انسان اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو اس وقت وہ اس دنیا کے مخلوقات و موجودات سے نا آشنا ہوتا ہے خ رفتہ رفتہ ان سے آشنا ہوتا ہے ار ان کی معرفت پیدا کرتا ہے۔ ان کی شناخت کا ایک طریقہ انسان کی قوت سامعہ اور اس کا کان بھی ہے۔ وہ کان کے ذریعہ باتوں کو سنتا ہے اور ذہن و حافظہ میں ثبت کرتا ہے سننا مقصدا تک پہنچنے کا مقدمہ ہوتا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب ؑ نیاس شخص ک یسوال کے جواب میں فرمایا کہ جس نے نیکی کی طرف راہنمائی طلب کی تھی۔

اے سوال کرنے والے پہلے تم سنو، پھر اسے سمجھو پھر یقین پیدا کرو اس کے بعد اس پر عمل کرو۔

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سمجھنے، یقین کرنے اورعمل کرنے کی ابتداء کان سے ہوتی ہے۔ لہٰذا سامعہ کو حس اجتماعی کا نام دیا جاسکتا ہے اور اس لحاظ سے اس کو قوۃ باصرہ سے افضل قرار دیا جاسکتا ہے۔

سننے کا نظام

آواز کیا ہے؟

آواز اجسام کے ارتعاش سے پیدا ہوتی ہے، انسان کی آواز بھی اس کے حلق کے تاروں کے ارتعاش ہی کا نتیجہ ہے۔ تجربہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ خلا(وہ فضا جہاں ہوا نہ ہو)میں آواز منتشر نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اس سے یہ خیال بھی نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ منتقل کرنے کا ذریعہ صرف ہوا ہے بلکہ گیس سے زیادہ تیز رفتار سیال چیز اور سیال چیزوں سے زیادہ تیز رفتار جامد چیزیں بھی آواز کو منتقل کرتی ہیں۔

سننے کے مختلف حصے سننے کی مشینری تین جداگانہ حصوں سے مل کربنی ہے:

۱۔ ظاہری کان ۲۔ درمیانی کان ۳۔ اندرونی کان

ظاہری کان:

یہ حصہ دو عضو سے مل کربنا ہے کان کی گوٹ جس کو کان کا خیمہ بھی کہتے ہیں اور دوسرا کان کا مجریٰ ہے۔ لالہ گوش یہ ایک ابھری ہوئی نرم ہڈی ہے جس میں باریک باریک مخصوص سوراخ ہیں یہ باعث زینت ہونے کے علاوہ صوتی امواج کو بھی جمع کرتی ہے اور آواز کی سمت کو معین کرتی ہے،نیز آواز کی شدت کو گھٹائی ہے۔

کان کا مجریٰ یہ تین سینٹی میٹر لمبا ایک سوراخ ہے اور اس کے داخلی حصہ کے بالکل آخر میں ایک پردہ ہے جس کو صماخ (یعنی سوراخ) کہتے ہیں، یہی ظاہری کان کو درمیانی کان سے جدا کرتا ہے اس سوراخ کی دیوار پر مخصوص قسم کی کھال چڑھی ہوئی ہے اس میں بھی بہت سے سوراخ ہوتے جن سے زہریلا اور لس دار مادہ ٹپکتا ہے اس مادہ سے میکروب مر جاتے ہیں یہی مادہ کیڑے مکوڑوں اور گردوغبار سے بھی کان کو محفوظ رکھتا ہے۔

درمیانی کان:

پردۂ صماخ کے پیچھے ایک فضا ہے جس کو صماخ پیٹی کہتے ہیں اور دو دریچوں کے ذریعہ اندرونی کان سے مربوط ہوتا ہے۔ اس پیٹی میں چھوٹی چھوٹی اور نازک ہڈیاں رکھی گئی ہیں کہ جن کے اسماء سے ان کے کام کی نوعیت بھی معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ ہتھوڑا نما ہڈی، اس کا دستہ پردہ صماخ پر ٹکا ہوا ہے۔

۲۔ آئرن نما ہڈی، ہتھوڑا نما ہڈی اسی پر لگتی ہے۔

۳۔ رکاب نما ہڈی بیضی دریچے پر ٹکی ہوئی ہے اور بیضی دریچہ وہ کھڑکی جو اندرونی کان تک پہنچتی ہے۔

۴۔لنز نما ہڈی یہ آئرن نما اور رکاب نما ہڈی کے درمیان رابطہ ہے۔

اندرونی کان:

یہ حصہ قوت سامعہ کا اہم ترین اور نازک و حساس ترین حصہ ہے جو ایک مضبوط ہڈی کے پیچھے واقع ہے تاکہ ہر پہنچنے والے صدمہ سے محفوظ رہے، اس کی عمارت بہت پیچیدہ ہے، اس کے آلات و اوزار بہت ہی باریک ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ان کے تین مختلف حصے ہیں :

۱۔ دہلیزی حصہ اس میں دو گڑھے ہیں۔۲۔ نصف دائرہ کا مجریٰ یہ تین نصف دائرہ ہڈیوں سے مل کر بنا ہے ار مجریٰ حلزونی، یعنی اسپرنگ نما ۵؍۲ نلی ہے، یہ تینو اعضاء کان کی اس اندرونی فضا میں تیرتے ہیں جو ایک سیال مادہ سے پر ہیجب کہ ان تینوں کے اندر بھی ایک مخصوص مادہ ہے، ان تینوں سے اعصاب کے تار جڑے ہوئے ہیں اور یہ تینوں جداگانہ آواز کو پہنچانے پرمامور ہیں۔

ہم کیسے سنتے ہیں ؟

جو ہوا صوتی لہروں کی حامل ہوتی ہے وہ کان میں داخل ہوتی ہے جس کے ٹکرانے سے کان کے پردہ میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ہتھوڑا نما، آئرن نما اور رکاب نما ہڈیاں اس ارتاش کو کان کے پردے سے اٹھا کر بیضی دریچے پر پھینکتی ہیں جو کہ اندرونی کان کے مدخل میں واقع ہے۔ یہ دریچہ اس ارتعاش کو لیتا ہے اور اس سیال مادہ میں پہنچا دیتا ہے جو اندرونی کان کی فضا کے درمیان ہے سننے والے خلئے اس سیال مادہ کے اندر منتشر ہیں وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس تاثر کو دماغ میں منتقل کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں صوت و صورت کا احساس ہوتا ہے۔

قوت سامعہ:

قوت سامعہ کا تعلق مختلف قسم کے عوامل سے ہے، آواز کی موقعیت، اس کی جسمانی کیفیت، غذائیت، خمیری ا نفعالات اور سب سے زیادہ آشکارافراد کا سن ہے طول عمر سے قوت سامعہ کا براہ راست اور اٹوٹ رابطہ ہے جتنا سن بڑھتا ہے اسی لحاظ سے بہرہ پن بڑھتا ہے۔

ایک کامل و بے عیب کان میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ اس کا پردہ ظریف و مبہم آواز کو ہوا میں موجود ملکول سے ٹکرانے کے سبب مرتعش ہوجاتا ہے اور سننے والے خلیے دماغ کو متاثر کرتے ہیں اگرچہ ظاہری کان آواز کو دریافت کرتے اور آواز کی سمت کا سراغ لگاتے ہیں لیکن آواز کو کنٹرول بھی کرتے ہیں اگر ان دونوں حصوں میں ہم آہنگی و تناسب نہ ہوتا تو کوئی آواز سنائی نہ دیتی۔

قرآن میں کان کو آنکھ و دل پر کیوں مقدم کیا ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ جن میں آنکھ، کان اور دل کا ذکر ہے اور ان میں سے اکثرآیات میں کان کو آنکھ اورقلب پر مقدم کیا گیا ہے کیا اس کی علت کو سمجھا جاسکتا ہے ؟ پہلے ہم ان میں سے چند آیات کو بیان کرتے ہیں :

قل۔۔۔۔۔۔۔۔مسؤلا۔

(اے رسول) ان سے یہ معلوم کیجئے کہ زمین و آسمان سے تمہیں کون رزق دیتا ہے اور سماعت و بصارت کا مالک کون ہے؟

بیشک سماعت و بصارت اور دل من میں سے ہر ایک کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

اسی طرح سورۂ نحل کی ۷۸ویں،سورۂ مومنون کی ۷۸ویں، سورۂ بقرہ کی ساتویں اور سورۂ فصلت کی بیسویں آیت میں نیز دوسری بہت سی آیات میں کان کو مقدم کیا گیا ہے۔

جواب میں یہ کہنا چاہیے کہ : دانشوروں نے علمی اعتبار سے کان کی بہت سی برتریاں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ سماعت کی حد فاصل کم از کم ہزار گنا زیادہ ہے جب کہ بصارت میں یہ فاصلہ بہت کم ہے (کان ایک منٹ میں ۱۶ سے ۱۶۰۰۰ ) بار حرکت کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ آنکھ مخصوص تعداد ہی کے رنگوں میں تمیز کرسکتی ہے۔ اس کی حدود مشخص و معین اور بہت کم ہیں مثلاً آنکھ بنفشہ سے کم اور سرخ رنگ سے آگے نہیں دیکھ سکتی، لیکن کان اپنی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ قوت سماعت کے ساتھ ہر قسم کی آواز سنتے ہیں یعنی صوتی لہروں اور موجوں کو گرفت میں لینے والا عضوجو کہ کان کیاندر واقع ہے۔۱۵۰۰ قسم کی آوازوں کو مختلف اعضاء کی مدد سے ۳۳۵ قسم کی آوازوں کو مختلف شدتوں کے ساتھ سنتا ہے یعنی ۳۳۳۰۰ آوازوں کو محسوس کرتا ہے۔ آنکھ ان تین لاکھ رنگوں کو مشخص کرنے کے لئے کہ جن کو انسان نے حاصل کیا ہے آلات و اوزار سے مدد لے گی، جب کہ کان بیمار ہونے سے پہلے سنی جانے والی چیزوں میں کسی کی مدد کا محتج نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح آنکھوں کو بہت شدید روشنی سے نقصان پہنچتا ہے جیسے سورج گہن کے وقت دیکھنے یا مسلسل ٹیلی ویژن و کمپیوٹر اور فلم دیکھنے سے آنکھ متاثرہوتی ہے جب کہ اضافی آواز کان کو ضرر نہیں پہنچاتی ہے، مختصر یہ کہ آنکھ کے دیکھنے کا میدان بہت محدود ہے وہ سامنے یا دائیں بائیں ہی دیکھتی ہے حالانکہ کان شش جہات کی آواز سنتے ہیں، ایسی ہی برتری کے لحاظ سے دانشوروں نے کان کو اس کی ساخت اورفینریکلی اعمال کے اعتبار سے آنکھ پر مقدم کیا ہے لیکن کان کو آنکھ پر مقدم کرنے کی علت قرآن مجید میں اس لئے موضوع بحث قرار پائی ہے کہ تزکیۂ نفس میں کان کا اہم کردار ہے۔ یعنی قلب و نفس کو سنوارنے میں کان کا حصہ آنکھ سے زیادہ ہے۔

قرآن میں کا ن’’سمع ‘‘ کی جمع کیوں نہیں آئی ہے؟

شیخ طوسیؒ نے اپنی کتاب ’’ تفسیر بتیان ‘‘ میں ایکمشہور ادیب سے اس طرح نقل کیا ہے کہ ’’ سمع‘‘ کے مفرد آنے کی علت ممکن ہے دو چیزوں میں سے ایک ہو۔

اول تو یہ کہ کبھی ’’ سمع ‘‘اسم جمع کے عنوان سے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ اسم جمع میں جمع کے معنی پوشیدہ ہوتے ہیں اس لیے اس کی جمع بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

دوسرے ہوسکتا ہے کہ آیت میں وارد لفظ ’’ سمع ‘‘ مصدری معنی کا حامل ہو اور یہبات محتاج بیان نہیں ہے کہ مصدر کم اور زیادہ دونوں پر دلالت کرتا ہے لہٰذا جمع بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرے اس فرق کے علاوہ بھی اس کی علمی توجیہ کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ غیر معمولی مسموعات (سنی جانے والی چیزیں ) کی بہ نسبت ادراکات و مشاہدات میں زیادہ تنوع ہے اسی لئے، قلوب و ابصار جمع کی صورت میں بیان ہوئے ہیں لیکن ’’ سمع ‘‘ مفرد کی صورت مبیں بیان ہوا ہے۔

کان کی فقہی قیمت

یہ تو آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہے کہ امام زین العابدین ؑ کے نظریہ کے مطابق، انسان کے اوپرکان کے دوحق ہیں جو کہ بیان ہوچکے ہیں، کان کی فقہی قیمت بھی ہے جس کو شارع نے بیان کردیا ہے، محقق حلی فرماتے ہیں :

انسان کے دونوں کانوں کے لئے مکمل دیت مقرر کی گئی ہے اور ایک کان کے لئے نصف دیت رکھی گئی ہے۔ اس کی لوکو کاٹنے کی دیت ایک تہائی ہے او ر لو میں سوراخ کرنے کی دیت بھی ایک تہائی ہے۔

تقریباً یہی مفہوم ’’ مبانی تکملۃ المنہاج ‘‘ کی عبارت کا ہے۔

دونوں کانوں کی دیت مکمل ہے اور ایک کان کی دیت نصف ہے اور کان کے بعض حصہ کی دیت، اسی کے لحاظ سے ہے اور لو کی دیت ایک تہائی ہے۔

موصوف اپنے فارسی رسالۂ عملیہ میں لکھتے ہیں : دونوں کان کاٹنے کی دیت پوری ہے اسی طرح ایسا کام کرنا کہ جس سے اس کے دونوں کان بہرے ہو جائیں، اگر اس کے ایک کان کو کاٹ لے یا اسے بہرہ کردے تو قتل کی نصف دیت دینا ہوگی۔ اور اگر اس کے کان کی لو کاٹ لے تو احوط یہ ہے کہ اس سے صلح کرے۔

آنکھ کا حق

لیکن آنکھ کاحق تمہارے اوپر یہہے کہ اس کو اس چیز سے بند کرلو جو تمہارے لئے حلال و روا نہیں ہے آنکھ سے وہی دیکھو جس سے عبرت ہو اور جس سے تم بینا ہوجاؤ جہاں سے تم کوئی حلم حاصل کرسکو کیونکہ آنکھ عبرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

بصر (بروزن فرس ہے) کے دو معنی ہیں قوت بینائی اور آنکھ، مفردات میں راغب فرماتے ہیں : بصر قوت بینائی کو بھی کہا جاتا ہے اور آنکھ کو بھی۔ بصر یعنی بینا ہوگیا، بصر اور ابصر، یعنی دیکھا، درک اور مشاہدہ کیا۔

’’ بصر‘‘ آنکھ کو بھی کہا جاتا ہے اور قوت باصرہ کو بھی کہا جاتا ہے مثلاً اس آیہ شریفہ میں ’’ وما۔۔۔۔ البصر‘‘۔ بصر کی جمع ابصار ہے مثلاً: وجعل۔۔۔۔۔ والافدۃ۔

بصیرت کے معنی دل کی بینائی کے ہیں اور یہ معرفت و درک کے مرادف ہے۔ اقرب الموارد میں نقل ہوا ہے کہبصر کے معنی علم ہیں اور طبرسی نے آیت ’’ ادعوا۔۔۔۔۔۔۔ اتبعنی ‘‘ میں بصیرت سے دل کی معرفت و بینائی ہی مراد لی ہے اور بصیرت کے معنی عقل و زیر کی بیان کئے ہیں۔

قوت بینائی چند علوم کا محور

آنکھ احساس و ادراک کا ذریعہ ہے اور علم نفسایت کی توجہ کا مرکز واقع ہوتی ہے او ر چونکہ نور کے قوانین سے مربوط ہے اس لئے اس سے علم فزکس میں بھی بحث ہوتی ہے او ر چونکہ دیکھنے کی پر اسرار کیفیت نے فلاسفہ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا ہے اور یہ بدن کی ایک قوت ہے اور ایک مخصوص فریضہ کی حامل ہے اس لئے علم تشریح اور فزیالوجی میں اس کی باریکیوں اورجزئیات سے بحث ہوتی ہے لہٰذا اگر ہم آنکھ کو چند علوم کا محور کہیں تو یہ مبالغہ نہیں ہے اور اسی قوت سے ہم رنگو ں، شکلوں اور اجسام کے فاصلوں کو دیکھتے ہیں۔

آنکھ سے صحیح طریقہ سے استفادہ کرنا

خداوند عالم نے آنکھ کی عظمت کو سورہ بلد میں انسان کے گوش گزار کیا ہے فرماتا ہے: الم۔۔۔۔۔۔ کیا ہم نے اس کے لئے دو آنکھیں نہیں قرار دی ہیں آنکھ بدن سے باہر کی دنیا سے رابطہ کا اہم ترین وسیلہ ہے اس کی حیرت انگیزیاں اتنی زیادہ ہیں کہ جو حقیقت میں انسان کو اس کے خالف کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کرتی ہیں۔ مگر افسوس کہ بعض انسان آنکھ سے صحیح فائدہ حاصل نہیں کرتے ہیں۔ سورہ ٔاعراف میں انسانوں کے ایک گروہ کے بارے میں بیان ہوا ہے: ولھم۔۔۔۔۔۔۔ اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں ہیں اور اس نعمت سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کرتے ہیں۔

سورۂ بلد کی آیت کے ذیل میں رسول ؐ کی ایک حدیث ہے کہ خداوند عالم انسانوں سے فرماتا ہے :

آدم کے بیٹو! اگر تمہاری زبان تمہیں اس چیز کی طرف ابھارے جس کو میں نے تم پر حرام کیا ہے تو میں نے اسے بند کرنے کے لئے دو لبوں سے تمہاری مدد کی ہے تو اسے بند کرلو اور اگر تمہاری آنکھ تمہیں حرام کی طرف لے جائے تو میں نے تمہارے اختیار میں دو پلکیں دی ہیں ان سے اسے بند کرلو۔

آنکھوں کو خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بند کیا جانا چاہیے سورۂ کہف میں کافروں کے بارے میں ارشاد ہے:الذین۔۔۔۔۔۔ سمعا۔

وہ لوگ جن کی آنکھیں میرے ذکر سے پردے میں تھیں اور وہ سن نہیں سکتے تھے۔

اس آیت میں خدا یہ فرماتا ہے کہ کافر اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے چشم پوشی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے برخلاف وہ ان چیزوں سے آنکھیں موند لیتے تھے جن سے انسان کو خدا یاد آتا ہے اور قوت سامعہ رکھنے کے باوجود انھوں نے کان نہیں دھرے،حقیقت یہ ہے کہ کافروں نے حق جوئی اور حقائق کو درک کرنے والی قوت کو ناکارہ کردیا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ آنکھوں کے باے میں فرماتا ہے: انھوں نے میری یاد سے دور رہنے کے لئے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ غفلت کے پردوں میں تھے اس لئے انھوں نے خدا کے آثار کو نہیں دیکھا او ر چونکہ حقیقت کو نہیں دیکھا اس لئے گمراہ ہوئے۔

یاد خدا ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو آنکھوں سے دیکھا جا سکے جو دکھائی دیتا ہے وہ اس کے آثار ہیں اور آثار ہی اس کے ذکر و یاد کا سبب ہوتے ہیں۔

انسان اپنی خلقت کو دیکھے:

آنکھوں سے صحیح معنی میں دیکھنا اور ان سے درست طریقہ سے استفادہ کرنا وہی ہے جس کو قرآن نے سورۂ طارق میں بیان کیا ہے اور انسان کو دیکھنے کی دعوت دی ہے فرماتا ہے:فلینظر۔۔۔۔ والترائب۔

انسان کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیاگیا ہے اس پانی سے جو پشت اور سینہ کے بیچ سے نکلتا ہے۔

اس طرح قرآن نے تمام انسانوں کو مخاطب قرار دیا اور انھیں ان کی پہلی خلقت کی طرف پلٹا دیا ہے اور استفہام کے ذریعہ ان سے سوال کیا تمہاری خلقت کیا تھی؟ اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی اس سوال کا جواب دیدیا ہے تم اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کئے گئے ہو جس کو مرد کا نطفہ کہتے ہیں جو منی میں تیرتا ہے اور نکلتے وقت اچھل کر نکلتا ہے۔ اس کے بعد صلب و ترائب کے موضو ع کو چھیڑتا ہے کہ جس کے بارے میں مفسرین نے متعدد احتمال دئیے ہیں لیکن یہاں ان کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے یہاں ہمارا مقصد یہی ہے کہ : جہاں قرآن دیکھنے کی دعوت دیتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے:

اپنے کھانے کی چیزوں کو دیکھو:

دوسری چیز جس کی طرف دیکھنے کی قرآن نے دعوت دی ہے وہ انسان کی خوراک اور اس کا کھانا ہے سورۂ عبس میں ارشاد ہے: فلینظر۔۔۔۔۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے کھانے و خوراک کو دیکھے خارج کی چیزوں میں سے کھانا ہر چیز سے زیادہ انسان سے نزدیک ہے کہ معمولی سی تبدیلی کے بعد اس کے وجود کا جز بن جاتا ہے اگر اسے کھانا نہ ملے تو وہ بہت جلد ہلاک ہوجائے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام موجودات میں سے اسی کا سہارا لیا ہے خاص طور سے نباتات اور درختوں سے فراہم ہونے والی غذا کا سہارا لیا ہے۔

اس دیکھنے کے کیا معنیٰ ہیں ؟ اس کے بارے میں مفسرین کے نظریات مختلف ہیں بعض نے کہا ہے یہی ظاہری نگاہ مراد ہے یعنی انسان کو دسترخوان پر اپنے کھانے کو دیکھنا چاہیے کہ حلال طریقہ سے فراہم ہوا ہے یا حرام طریقہ سے، نفع بخش ہے یا ضرر رساں، بعض روایات میں علمی غذا و خوراک کے معنی میں نقل ہوا ہے۔ امام محمد باقر ؑ فرماتے ہیں : علمہ۔۔۔۔۔ انسان کو اپنے علم کو دیکھنا چاہیے کہ اسے کس سے اور کس طریقہ سے حاصل کیا ہے ؛ یا کھانے کی چیزوں کے بارے میں غوروفکر سے جو بھی مراد ہو قرآن نے اس کے بارے میں انسان کو غور کرنے کی دعوت دی ہے۔

قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر انسان کو نظر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ مثلاً فانظروا۔۔۔۔۔ حق کو جھٹلانے والوں کا انجام دیکھو کیا ہو ا۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے : سیروا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا نے خلقت کا آغاز کیسے کیا ہے۔

نامحرم عورتوں کو دیکھنا منع ہے

یغضوا، غض بروزن ’’خر‘‘سے مشتق ہے جس کے معنی کم کرنا اور گھٹانا ہیں اور بہت سی جگہوں پر آواز دھیمی کرنے اور نگاہ جھکانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی بنا پر آیت کہتی ہے: اپنی نگاہ کوجھکاؤ، نظر کو نیچا رکھو یہ ایک لطیف مفہوم ہے کہ نامحرم عورتوں کے روبرو ہونا پڑے تو اپنی نگاہ کو جھکالو کیونکہ اگر آنکھیں بند کریں گے تو راستہ کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ لیکن اگر اس کے بدن و صورت پر نگاہ پڑے تو تم اپنی نگاہ کو جھکالو اور جس چیز کو دیکھنے سے منع کیا ہے اس سے نظر ہٹا لو۔

جس طرح خداوند عالم نے قرآن مجید میں مردو عورت دونوں کو نامحرم کو دیکھنے سے منع کیا ہے اسی طرح بہت سی روایات میں بھی نامحرم کو دیکھنے کو حرام قرار دیا گیا ہے بعض مقامات پر تو اس کے نقصان وہ اثر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کتاب ’’ وسائل الشیعہ ‘‘ میں ایک باب اس عنوان ’’ باب تحریم النظر الی النساء الاجانب وشعورھن ‘‘ کا ہے اس باب کی اولین حدیث یہ ہے:

محمد بن یعقوب۔۔۔۔۔۔۔۔۔ طویلۃ۔

محمد بن یعقوب نے محمد بن یحییٰ سے انھوں نے محمد بن فضال سے انھوں نے علی بن عقبہ سے انھوں نے اپنے والد سے انھوں نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: نگاہ شیطان کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر ہے اور اکثر ایک ہی نگاہ طویل حست کا باعث ہوتی ہے۔

اس حدیث میں نگاہ کو تیر سے تشبیہ دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تیر نشانہ پر لگتا ہے تو اسے شگافتہ کردیتا ہے، غلط نگاہ بھی عصمت و عفت کے پردہ کو چیر دیتی ہے، پھر فرماتے ہیں : غلط نگاہ طویل حسرت کا باعث ہوتی ہے بہت ے لوگ حرام نظر ہی کی وجہ سے ایسے شدید نقصان سے دوچار ہوئے ہیں کہ جس کی تلافی آخر عمر تک نہیں ہوسکی، اور ندامت و پشیمانی کی زندگی گزارتے رہے لیکن کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوسکا۔

چھٹی روایت میں منقول ہے:

وباسنادہ عن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فتنۃ۔

روایت کی اسناد ابن ابی عمیر سے ہے انھوں نے کاہلی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: امام صادق ؑ نے فرمایا: ایک بار دیکھنے کے بعد دیکھنا دل میں شہوت کا بیج بوتا ہے اور یہی بیج جو نگاہ سے بویا جاتا ہے اپنے حامل کو فتنہ میں مبتلا کردیتا ہے۔

اس باب کی نویں روایت میں منقول ہے : قال الصادق ؑ : من نظر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ العین۔

جس شخص کی نظر کسی نامحرم پر پڑی اور اس نے فورا ہی آسمان کی طرف دیکھا، یا اس نے اس عورت سے نگاہ ہٹالی، آنکھیں بند کرلیں، اس نے نگاہ نہیں ہٹائی مگر یہ کہ خدا نے جنت میں حورالعین کو اس کی زوجیت میں دیدیا۔

شرع میں بعض موقعوں پر نامحرم پر نظر ڈالنے کو جائز قرار دیا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں :

استثنائی موقعوں پر دیکھنا جائز

قرآن مجید کی بعض آیتوں اور رسالۃ الحقوق میں امام سجاد ؑ کے بیان سے یہ بات سمجھ میں آتیہے کہ خدا نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے انھیں دیکھنا جائز نہیں ہے محرمات سے آنکھوں کو بند رکھنا چاہیے۔ لیکن بعض جگہوں پرشارع نے نامحرم کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔ اس عورت کو دیکھنا جائز ہے جس سے انسان شادی کرنا چاہتا ہے، کتاب وسائل الشیعہ میں ایک باب اس عنوان کا ہے۔

باب انہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ و محاسنھا۔:

اس باب میں پہلی روایت محمد بن یعقوب سے انھوں نے علی بن ابراہیم سے انھوں نے اپنے والد اب ابی عمیر سے انھوں نے ایوب بن خزار سے انھں نے محمد بن مسلم سے نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا:

میں نے ابو جعفر سے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا کہ وہ ایک عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

کیا وہ اسے دیکھ سکتا ہے ؟ فرمایا: ہاں، کیوں نہیں کہ وہ اسے گراں ترین قیمت میں خرید رہا ہے۔

اس روایت میں صرف جواز نظر کے بارے میں سوال کیا گیا ہے لیکن یہ حدیث مصداق کو بیان نہیں کرتی ہے کہ دیکھنا کہاں جائز ہے ہاں دوسری روایتیں ایسے مصادیق بیان کرتی ہیں، اسی روایت کی مانند دوسرے باب کی روایت ہے۔

وعنہ عن ابیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان یتزوجھا۔

علی بن ابراہیم سے انھوں نے اپنے والد ابن ابی عمیر سے انھوں نے ہشام بن سالم اور حماد بن عیسیٰ سے اور حفص بن بختری سے اور سب نے امام جعفر صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

اگر عورت سے شادی کرنے کا ارادہ ہوتو اس کے چہرہ اور کلائی یا گٹے کو دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

تیسری روایت میں ابو علی اشعری۔۔۔۔۔۔۔ نے حسن بن سری سے نقل کیا ہے کہ میں نے امام صادق ؑ کی خدمت میں عرض کیا:ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور اسے غور سے دیکھتا ہے اس کی پشت اور چہروں کو دیکھتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کی پشت و چہرہ کو دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اسی باب کی دوسری روایات میں بھی عورت کے محاسن کو اس وقت دیکھنے کو جائز قرار دیا گیا ہے جب اس سے شادی کرنے کا ارادہ ہو اور لذت کی نگاہ سے نہ دیکھ رہا ہو۔

ڈاکٹر کا بیمار عورت کو دیکھنا:

ڈاکٹر و طبیب کا اس عورت کو دیکھنا بھی مستثنیٰ ہے جس کا علاج کوئی دوسرا نہ کرسکے کتاب وسائل الشیعہ، کی کتاب النکاح کے آداب و مقدمات نکاح کے ایک سو تیسویں باب میں یہ بیان ہوا ہے: اس باب کی پہلی روایت میں اس مطلب کو اس طرح بیان کیا ہے۔

محمد بن یعقوب۔۔۔۔۔ ان شائت۔

محمد بن یعقوب محمد بن یحییٰ سے انھوں نے احمد بن محمد بن عیسیٰ سے انھوں نے علی بن الحکم سے انھوں نے ابوحمزہ ثمالی سے انھوں نے ابو جعفر ؑ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے امام سے اس مسلمان عورت کے بارے میں دریافت کیا کہ جو مریض ہوگئی یا اس کے بدن کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی یا زخم لگ گیا اور اس کو دیکھا نہیں جا سکتا اور علاج کرنے والا ڈاکٹر عورت سے زیادہ ماہر ہے کیا اس عورت کو ڈاکٹر کو دکھانا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا: مجبوری کے وقت دکھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چنانچہ اگر عورت چاہتی ہے تو علاج کراسکتی ہے۔

اہل ذمہ اور بادیہ نشینوں کی عورتوں کو دیکھنا:

جن عورتوں کو دیکھنا جائز قرار دیا گیا ہے ان میں اہل ذمہ اور بادیہ نشینوں کی عورتیں بھی ہیں۔ اس سلسلہ میں وسائل الشیعہ کے ۱۱۲ویں باب میں منقول ہے:

محمد بن یعقوب نے علی بن ابراہیم سے انھوں نے اپنے والد نوفلی سے انھوں نے مسکونی سے انھوں نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ رسول ؐ نے فرمایا: اہل ذمہ کی عورتوں کی کوئی حرمت نہیں ہے ان کے بالوں اور ہاتھوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

محمد بن یعقوب نے عباد بن صہیب نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: دیہاتیوں اور بادیہ نشینوں اورخانہ بدوشوں کی عورتوں کے سر اور بالوں کو دیکھنا جائز ہے کیونکہ اگر انھیں بے پردہ رہنے سے منع کیا جاتا ہے تو بھی وہ اپنے بالوں کو نہیں چھپاتی ہیں یہی حکم پاگل اور کم عقل عور ت کا بھی ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ جان بوجھ کر اسے نے دیکھے۔

عبرت کے لئے دیکھنا

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : دیکھی جانے والی چیزوں کو عبرت کے لئے دیکھنا چاہیے کیونکہ آنکھیں ایسے دروازے ہیں جو عبرتوں کی طرف کھلتے ہیں انسان کی نگاہ کی قسموں میں سے ایک عبرت آمیز نگاہ بھی ہے کہ جس سے انسان نصیحت حاصل کرتا ہے یہی نگاہ انسان کے لئے نفع بخش ہے۔ ہارون نے موسیٰ بن جعفر کی خدمت میں خط لکھا : مجھے مختصر لفظوں میں وعظ و نصیحت کیجئے۔ امام نے اسے جواب لکھا:ہر وہ چیز جس پر تمہاری نگاہ پڑتی ہے اس میں تمہارے لئے ایک نصیحت و عبرت ہے۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : عبرتیں کتنی زیادہ ہیں لیکن ان سے عبرت کم حاصل کی جاتی ہے۔

کاخ جہان پر است زذکر گذشتگان لکن کسی کہ گوش کند این نداکم است

دنیا گزرے ہوئے لوگوں کے ذکر سے بھری پڑی ہے لیکن اس ندا کو سننے والے بہت کم ہیں۔ حضرت علی ؑ دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں :جو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ بینا ہو جاتا ہے اور جو بینا ہو جاتا ہے ہ سمجھ جاتا ہے اومر جو سمجھ جاتا ہے وہ علم کے رتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔

ایک روایت میں نقل ہوا کہ جب حضرت علی ؑ مدائن کے قریب سے گزرے اور وہاں کسریٰ کے محل و غیرہ کے آثار دیکھے کہ جو منہدم ہوا چاہتے ہیں تو آپ کے ایک صحابی نے ابن یعفر یمنی کا یہ شعر سنایا:جرت۔۔۔۔میعاد

ان کے مکانوں کے مٹے ہوئے نشانات پر ہوئیں خاک اڑا رہی ہیں گویا ان کی ایک میعاد تھی۔

حضرت علی ؑ نے فرمایا: تم نے یہ آیات کیوں نہ پڑھیں : وکم ترکوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ منظرین۔

انھوں نے کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑے ہیں، کتنی ہی کھیتیاں اور بڑے بڑے محل و قصر اور ایسی نعمتیں چھوڑی ہیں جن سے وہ مالا مال تھے اور ان کا ارث ہم نے دوسری قوم کو بنا دیا اور ان پر آسمان رویا نہ زمین اورنہ انھیں کوئی مہلت دی گئی۔

یہ آیتیں فرعون اور اس کی قوم کے بارے میں ہیں ان تمام ظلم و ستم کے بعد حکومت اور وہ سرزمین ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور بنی اسرائیل اس کے مالک ہوگئے۔ وہ دریا میں غرق ہوگئے اور انھیں کوئی نہ بچاسکا، ہاں ایسی عبرت آموز نگاہ سے عقلمند سبق لیتے ہیں۔

امام علی نقی ؑ اور متوکل

مسعودی لکھتا ہے کہ جب متوکل کے سپاہی امام علی نقی ؑ کے گھر میں داخل ہوئے اور انھیں کوئی چیز نہ ملی تو انھوں نے متوکل کو صورت حال بتائی، وہ اپنی بزم میں شراب چڑھائے ہوئے مست بیٹھا ہوا تھا، اس نے حکم دیا کہ امام کو ان کے گھر سے دربار میں لاؤ، امام آئے تو اس نے آپ کا احترام کیا،اور شراب کا جام آپ کی طرف بڑھایا، امام نے فرمایا: شراب میے خون و گوشت میں داخل نہیں ہوئی ہے، مجھے اس سے معاف رکھا جائے، متوکل نے کہا: کوئی شعر سنائیے، امام نے فرمایا: مجھے اشعار سے زیادہ شغف نہیں ہے، متوکل نے اصرار کیا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے:

باتوا علی۔۔۔۔۔۔۔۔۔قد اکلوا

وہ بلند و بالا اور عظیم الشان محلوں میں رہتے تھے اور پاسبانوں اور محافظوں کے ذریعہ ان کی حفاظت ہوتی تھی لیکن بلند محلوں اور پاسبانوں نے انھیں کوئی فائدہ نہیں دیا۔ وہ اپنے محلوں سے نیچے آگئے ہیں جن میں وہ عزت کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، اور اب انھوں نے قبرکے گڑھے میں سکونت اختیار کر لی ہے جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔ ان کے دفن کے بعد ایک منادی نے آواز دی، تمہارا تاج اور ٹھاٹ باٹ کہاں گیا اور شاداب و تر و تازہ چہروں کو کیا ہوگیا۔ قبر کے گوشہ سے آواز آئی : ان کے چہرے حشرات کا گھر بن گئے ہیں ایک زمانہ تک انھوں نے کھایا پیا اب انھیں کھایا جارہا ہے۔

متوکل ان اشعار کو سن کر رونے لگا اور اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہوگئے۔ ایک قول کے مطابق اس نے جام شراب کو زمین پر دے مارا یہ ہے عبرت آموز نگاہ! مگر افسوس کہ متوکل نے اس سے کوئی عبرت نہ لی۔

محدث قمی نے سفینۃ البحار میں امام صادق ؑ سے ’’ اروی سلم کا واقعہ نقل کیا ہے فرماتے ہیں :

حضرت داؤد گھر سے برآمد ہوئے زبور کی تلاوت کی، پرندے اور درندے بھی آپ کے ساتھ پڑھ رہے ہیں وہ اس پہاڑ کے پاس سے گزرے جہاں حضرت حزقیل عابد تھے، حضرت داؤد نے کہا: کیا حاضر خدمت ہونے کی اجازت ہے ؟ کہا : نہیں، حضرت داؤد رونے لگے۔ خداوند عالم نے حضرت حزقیل کو ندا دی کہ داؤد کو رنجیدہ نہ کرو، اس لئے حزقیل ؑ نے داؤد ؑ کو داخل ہونے کی اجازت دی، حضرت داؤد ؑ نے ان سے دریافت کیا: ابھی تک آپ نے کبھی گناہ کرنے کا ارادہ کیا ہے؟ فرمایا: نہیں، حضرت داؤد نے پھر سوال کیا : کیا آپ کو کبھی اپے عمل پر گھمنڈ اور تکبر و غرور ہوا ہے؟ فرمایا: نہیں، کیا کبھی دنیا کی طرف مائل ہوئے ہیں ؟ فرمایا: ہاں۔ حضرت داؤد ؑ نے کہا: اس حال میں آپ خود کو کس طر ح دنیا سے الگ رکھتے ہیں ؟ کہا: میں اس درّے میں چلا جاتا ہوں پھر وہ حضرت حزقیل کے ساتھ درّے میں گئے وہاں ایک لوہے کا تخت دیکھا جس پر ایک کھوپڑی نصب تھی اس کے کنارے ایک تختی تھی اس پر یہ لکھا تھا : یہ کھوپڑی اروی سلم کی ہے، جس نے ہزار سال حکومت کی، ہزار شہر بسائے، ہزار جوان عورتوں سے شادی کی آخر کاریہاں پہنچا کہ خاک اس کا بستر ہے اور کیڑے مکوڑے اس کے مونس ہیں، جو شخص مجھے دیکھے اسے دنیا کے فریب میں نہیں آنا چاہیے یہ ہے عبرت بیں نظر۔

آنکھ کی ساخت

آنکھ دو چیزوں سے مل کر بنی ہے ایک اس کے فرعی اجزا ہیں دوسرے آنکھ کی چربی ہے، فرعی اجزاء عبارت ہیں حدقہ، پلک، بھویں، ابرو اور آنکھ کو گردش دینے والے عضلات سے۔

۱۔ حدقہ: متعدد ہڈیاں ایک دوسرے سے متصل ہوگئی ہیں جس سے مخروطی شکل کا جوف یا صندوقچہ سا بن گیا ہے تاکہ اس میں آنکھ کی لطیف و پراسرار چربی (ڈیلا) محفوظ رہے۔ ایسی نازک چیز کے لئے ایک مضبوط صندوق ضروری ہے مذکورہ ہڈیاں اوپر کی طرف پیشانی کی ہڈیوں سے اور نیچے کی طرف چہرہ کی ہڈیوں سے باہر کی طرف کن پٹی اور اندر کی طرف اس ہڈی سے متصل ہے جو ناک کی ہڈی سے ملی ہے۔

حدقہ آنکھ کی چربی اور ان تمام لطیف و نازک اعضاء کو محفوظ رکھنے کے لئے جو کہ ہڈیوں کے اس صندوقچہ کے اندر ہیں، اس صندوقچہ کی داخلی اور اندرونی فضا چربی کے مادہ سے، جو کہ ایک حد تک سیال بھی ہے، پر ہے، حدقہ ایک جھلی یا پردے کے وسیلہ سے دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے، سامنے کا آنکھ ہی ہے اور اس کے پیچھے کے حصہ میں بینای کے تار ہیں، کہ جن کا کام دماغ تک تصویریں بھیجنا ہے اور اسی میں حسی و حرکی تار و اعصاب اور آنکھ کو گردش دینے والے مچھلی نمایاچوہے کی شکل کے گوشت کے ٹکڑے ہیں اور وہ رگیں ہیں جو حدقہ اور مچھلی نما عضلات تک خون پہنچاتی ہیں۔

۲۔پلک: آنکھوں کے سامنے ظریف و مضبوط دو پردے لٹکا دیئے گئے ہیں جو سردی و گرمی اور گردوغبار سے آنکھ کی حفاظت کرتے ہیں نیند اور خطرے کے وقت خود بخود بند ہوجاتے ہیں تاکہ سی بھی ہونے والے حملہ اور وار د ہونے صدمہ سے آنکھ کی حفاظت کرسکیں اس کے علاوہ روشنی کو اتدال میں لانے کی ذمہ داری بھی انھیں کی ہے۔

عام اوقات میں ایک منٹ میں بارہا پلکیں بند ہوتی ہیں جس کے نتیجہ میں ایک مخصوص پانی کو جو کہ آنکھ کے بالائی حصہ میں واقع غدود سے ٹپکتا ہے آنکھ کے صفحہ پر بہا دیتی ہیں جس سے آنکھ دھل جاتی ہے اس طرح انھیں ہمیشہ تروتازہ رکھتی ہیں اور انکھ کی کارکردگی کو آسان بناتی ہیں۔

اشکوں کا بہنا دو لحاظ سے آنکھوں کے لئے ضروری اور مفید ہے ایک: تاکہ آنکھوں کی دھلائی ہو جائے اور ہوا کے ذریعہ آنکھ میں پڑنے والے گردوغبار کو روکے کہ جس سے آنکھ کا اسکرین مکدرودھندلا ہوجاتا ہے دوسرے : چونکہ یہ بہنے والا مداہ عفونت کی ضد کا حامل ہے اس لئیآنکھ کی چربی کی حفاظت کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

۳۔ مژہ:پلکوں کے کنروں پر بالوں کی منظم جھالر لگا دی گئی ہے، جو آنکھوں میں گردوغبار پڑنے میں مانع ہوتی ہے اور زیادہ روشنی کے وقت اس کا مقابلہ کر کے اس کو گھٹاتی ہے۔ پلکوں کے کنروں پر کچھ غدود ہوتے ہیں ان سے مخصوص چکنا مادہ ٹپکتا ہے جو کہ مژگاں کو چکنا اور ٹھیک ٹھاک رکھتا ہ یتاکہ عام حالات میں وہ آنکھوں کے پانی کو رخسار پر نہ بہنے دیں اور آنکھوں کے مستقل طور پر کھلنے اور بند ہونے میں انسان کو تکلیف نہ ہونے دے، اس کے اطراف میں چھ عضلات ہیں تا مختلف سمتوں اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، اندر اور باہر کی طرف گردش کرنے میں اس کی مدد کریں۔

۵۔ ابرو: ہر پلک کے اوپر بے شمار بالوں کی ایک منظم لکیر کھنچی ہوئی ہے جو خوبصورتی کی علامت ہونے کے علاوہ پسینہ کو آنکھ میں جانے سے روکتی ہے اور روشنی کو، خاص طور سے اوپر سے آنے والی روشنی کو اعتدال پر لانے میں خاص اثر رکھتی ہے۔

آنکھ کے ڈیلے کے طبقات

باہر سے اندر کی طرف آنکھ کے طبقات تین پردوں سے وجود میں آئے ہیں۔

۱۔صلبیہ: یہ ای سفید اور مضبوط پردہ ہے جو پوری آنکھ کا احاطہ کئے ہوئے یہ بہت زیادہ باریک ہے اس کی ضخامت ایک ملی میٹر سے زیادہ نہیں ہے اس کے باوجود نہایت مضبوط ہے لہٰذا اپنی ذمہ داری، کہ آنکھ کی حفاظت کرنا ہے، کو بخوبی انجام دیتا ہے۔ جس طرح کیمرے میں ایک ڈبہ ہوتا ہے کہ جس کے اندر ذرہ بیں اور حساس شیشہ ہوتا ہے اسی طرح ہماری آنکھ میں بھی ایک مضبوط جھلی ہوتی ہے کہ جس کے اندر بہت سے ظریف و حساس اعضاء ہیں اس جھلی میں سے جو چیز دکھائی دیتی ہے وہ آنکھ کی سفیدی ہے۔سامنے کے حصہ میں وہ قدرے ابھرا ہوا، نازک اور شفاف ہوتا ہے تاکہ نور اس سے آسانی کے ساتھ عبور کرسکے اور اسی حصہ کو جو کہ پردہ صلبیہ کا ۹/۱:اصطلاح میں قرنیہ کہتے ہیں۔ صلبیہ کے پیچھے ایک سوراخ ہے جس سے بینائی کی قوت آنکھ کے اندر آتی ہے۔ یہ نازک پردہ کہ جس کو تشریح کی اصطلاح میں، طبیہ اور طبی اصطلاح میں غلاف بینائی کہتے ہیں اتنا سخت ہوتا ہے کہ معمولی چاقو طاقت کے زور سے ہی اس کو چیز سکتا ہے چنانچہ آپریشن کے وقت ڈاکٹروں کو تیز چاقو کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۔مشیمیہ:یہ ایک نازک لطیف پردہ ہے جو صلبیہ کی داخلی سطح کو گھیرے ہوئے ہے اس کے اندر بہت سی رگیں ہیں۔ اس حساس ترین جھلی کا فریضہ آنکھ کی غذا فراہم کرنا ہے اور چونکہ یہ پردہ ایک حد تک بچہ دانی سے مشابہہ ہوتا ہے اس لئے اس کو مشیمیہ کہتے ہیں۔

اس پردہ یا جھلی کے سامنے کے حصہ کو ’’ عنبیہ ‘‘ کہتے ہیں یہ شکل کے لحاظ سے مسطح اور عمودی ہوتا ہے اور یہی شکل کی تغیر اس بات کا سبب بنی کہ سطح قرنیہ کے اس حصہ میں ایک فضا پیدا ہوگئی اور وہ فضا ایک شفاف وسیال مادہ سے پر ہے جس کو ’’ زلالیہ ‘‘ کہتے ہیں، رنگ کے لحاظ سے کالا ہے یہ آنکھ کے کالے حصہ کو تشکیل دیتا ہے بعض لوگوں کی آنکھوں کا یہ حصہ آسمانی اور سبز ہوتا ہے۔

عنبیہ کے وسط میں ایک سوراخ ہوتا ہے جس کو پتلی کہتے ہیں اس کا قطر ۳ تا ۶ ملی میٹر ہوتا ہے۔ نور کی لہروں کے مقابلہ میں اس کے دہانہ کی وسعت کم و زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ یعنی نور جتنا زیادہ ہوتا ہے یہ اتنا ہی تنگ ہوجاتا ہے ا جب نور کم ہوتا ہے تو اس کی وسعت بڑھ جاتی ہے تاکہ یہ آٹو میٹک سسٹم اس نور کو مرتب کرسکے جو آنکھ میں وارد ہوتا ہے درحقیقت یہ کیمرے کے ڈیا فرام کی مانند ہوتا ہے ہاں دونوں میں یہ فرق ہے کہ آنکھ خود کار ہے اس کو گھٹانے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سوراخ کو آنکھ کا تل یا پتلی کہتے ہیں۔ جب دو آدمی ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہوتے ہیں تو ہر ایک کی آنکھ سیاہی کے وسط میں دونوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ انسان کی آنکھ کی پتلی گول ہوتی ہے اور ہمیشہ کالی نظر آتی ہے کیونکہ اس کے پیچھے کالی فضا ہے جس کو تاریک خانۂ چشم کہتے ہیں۔ لیکن دوسرے حیوانات میں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے۔

۲۔ شبکیہ: شبکیہ ایک لطیف و حساس جھلی یا پردہ ہے جو مشیمیہ کے بیچ میں واقع ہے اور چونکہ یہ پنجرہ یا کھڑکی سے مشابہ ہے اس لئے اس کو یہ نام دیا گیا ہے۔شبکیہ ایک عصبی پردہ ہے یعنی قوت باصرہ ہی سے مربوط ہے اور باصرہ ہی کے وسیلہ سے وہ دماغ سے مربوط ہوتا ہے اور اس کے عقب میں دو مشخص نقطے ہوتے ہیں : ۱۔ نقطۂ کور: یہ آنکھ کی قوت بینائی کے مدخل میں واقع ہے۔ ۲۔ اس نقطہ کا رنگ زرد ہوتا ہے اور یہ بیضوی شکل کا ہے اس کو لکہ زرد کہتے ہیں چیزوں کی تصویریں پہلے اسی پر منعکس ہوتی ہیں پھر دماغ میں منتقل ہوتی ہیں۔

آنکھ کے شفاف سمندر

آنکھ کے کچھ حصے ایسے ہیں جو نور کو اپنیاندر سے گزارتے ہیں اور نتیجہ میں شبکیہ ؛ زرد رنگ کے ٹکڑے پر تصویر پھینکتا ہے اور یہ حصے درج ذیل ہیں :

۱۔ زلالیہ: قرنیہ، اور عنبیہ کے درمیان ایک فضا ہے جس کی وسعت و چوڑائی تین سے چار ملی میٹر تک ہوتی ہے، یہ شفاف اور نتھرے سیال مادے سے لبریز ہے۔ اسی لئے اس کو زلالیہ کہتے ہیں۔

روشنی اور نور کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ جب رقیق و پتلا محیط، گاڑھے اور غلیظ محیط میں داخل ہوتا ہے تو اس میں انقلاب پیدا ہوجاتا ہے اسی انقلاب کو انکسار نور(نور کا دھماکہ) کہتے ہیں، بنا برایں جو نور ہوا کے ہلکے پھلکے محیط میں موجود ہے جب وہ اس ماحول میں آتا ہے تو وہ تھوڑا گاڑھا ہوجاتا ہے زلالیہ ہوجاتا ہے، منقلب ہوجاتا ہے اور شبکیہ پر منعکس ہونے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔

۲۔ جلیدیہ: اس عضو کو عدس چشم بھی کہتے ہیں یہ ٹھوس و جامد اور شفاف ہے معمولی ذرہ بیں کی مانند ے ضخامت میں تین چا ر ملی میٹر موٹا ہوتا ہے اور آنکھ کے دوسرے پردہ یعنی عنبیہ کی پشت پر ہوتا ہے اور اس کا مرکزف حصہ اس کے اطراف کے حصوں سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اس کے اوپر ایک نرم پردہ ہے اس کے اطراف میں کچھ ایسے عضلات ہیں جو شکل کو بدلنے کا سبب ہوتے ہیں۔

نور کو توڑنے اور زرد پردہ پر اجسام کی صورتوں کی تطبیق میں اس عضو کا اہم اور قابل توجہ اثر ہوتا ہے کیونکہ ساری تصویروں کو معین نقطہ پر پڑنا چاہیے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ آنکھ کے لنز سے سارے اجسام کافاصلہ برابر نہیں ہے، ان میں سے بعض نزدیک اور بعض دور ہیں اس وقت یہی آنکھ کا لنز مرئی اجسام کے اس فاصلہ کو اپنی ترچھی شعاعوں اور (Iris)عضلات کے انقباض کے وسیلہ سے کم کرلیتا ہے تاکہ تصویریں شبکیہ پ منطبق ہوجائیں، اور یہ کام، جس کو تطابق کہتے ہیں، نہایت ہی آسانی اور تیزی سے انجام پذیر ہوتا ہے۔

۳۔ زجاجیہ : یہ ایک صاف و شفاف مادہ ہوتا ہے جو آنکھ کے اندرونی گڑھے کو پررکھتا ہے اور آنکھ کے لنز کے عقب میں قرار پاتا ہے اور اس کے اطراف میں ایک صاف ستھری جھلی ہوتی ہے، اس عضو کا کام بھی نور کا توڑنا ہے اور لکہ زرد (Yellow Spo)پر اجسام کی تصویروں کی مطابقت میں اس کابڑا کردار ہوتا ہے۔

آنکھ اور کیمرہ کی شباہت:

فزیکی نقطۂ نظر سے آنکھ اور کیمرہ میں بہت سی مشابہتیں ہیں،کیمرہ میں اس کے لنز کے ذریعہ تصویریں ریل پرپڑتی ہیں اور آنکھ میں بھی چیزوں کی تصویریں شبکیہ پر ٹھہرتی ہیں۔ کیمرہ میں لنز کی طاقت کو لنز کے آگے، پیچھے کرکے بدل سکتے ہیں او رتصویر کو واضح کرسکتے ہیں اسی طرح آنکھ میں بھی لنز کی طاقت کی تبدیلی کے ذریعہ شبکیہ پر پڑنے والی تصویر کو واضح کرسکتے ہیں۔ کیمرے میں ڈیا فرام اور آنکھ میں سیاہ گول پردہ نور کی شدت کو منظم کرنے میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ مختصر یہ کہ کیمرہ ہو یا آنکھ دونوں میں اشیاء کی تصویر معکوس ہوتی ہیں دماغ کا پردہ تصویر کو سیدھا کرتا ہے اور اشیاء کو تصویر کو صحیح دیکھتا ہے۔

آنکھ کی فیزیولوجی (Physiology):

دیکھنے کے لئے اشیاء کی تصویر شبکیہ پر پڑتی ہے اور یہی بینائی کے خلیوں کی تحریک کا باعث ہوتی ہے۔ ایک ایک عصبی موج بینائی کے ریشوں کے ذریعہ دماغ تک پہنچتی ہے جہاں اس کا ادراک ہوتا ہے اور آنکھ کی پتلی کے ذریعے نورمنظم ہوتا ہے اور نتیجہ میں آنکھ کی پتلی سے اشیاء کے فاصلہ کو نور کی شدت کے لحاظ سے کم و زیادہ کرتا ہے اور زیادہ نور میں یا پتلی سے نزدیک دکھائی دینے والی چیز کو تنگ اور کم نورمیں دور دکھائی دینے والی چیز کو اس کے برعکس کرتا ہے۔

آنکھ کی خرابی:

عام طور پر چیزوں کی تصویر شبکیہ پر پڑتی ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اشیاء کی تصویر صحیح طریقہ سے شبکیہ پر نہیں پڑتی بلکہ اس سے آگے یا اس سے پیچھے پڑتی ہے اگر اس سے آگے پڑتی ہے تو آنکھ نزدیک دیکھتی ہے اور اگر اس یس پیچھے پڑتی ہے تو آنکھ اسے دور دیکھتی ہے۔

آنکھ کا نزدیک دیکھنا، اس وقت آنکھ نزدیک دیکھتی ہے جس وقت قرنیہ اور لنز کے درمیان کا فاصلہ معمول سے زیادہ ہوتا ہے یا شبکیہ سے لنز کا فاصلہ زیادہ ہوتا ہے یا لنز کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ ان تمام صورتوں میں ہر چیز کی تصویر شبکیہ سے آگے پڑتی ہے۔

آنکھ کا دور دیکھنا، دور دیکھنا، نزدیک بینی کے برعکس ہے اس میں قرنیہ کا فاصلہ آنکھ کے لنز سے کم ہوتا ہے یا پھر آنکھ کے لنز کی طاقت میں ضعف ہوتا ہے، اس خلل میں چیزوں کی تصویر شبکیہ کی پشت پر پڑتی ہے، سن رسیدہ لوگوں کو اکثر دور نظر آتا ہے اسی وجہ سے اس کو آنکھوں کا بڑھاپا کہا جاتا ہے، اس مرض میں آنکھ کا لنز رفتہ رفتہ اپنے ارجاع کی قابلیت کو گنوا دیتا ہے اور پھر وہ تصویر کو شبکیہ پر ٹھہرانے کیقابل نہیں رہتا، آنکھ کے بڑھاپے کے زمانہ میں اشیاء کو دیکھنے کے لئے کہ جب وہ ایکمیٹر سے کم آنکھ سے نزدیک ہوں تو اس وقت مناس پاور کے محدب شیشہ سے مدد لینا چاہیے۔

فقہی نقطۂ نظر سے آنکھ کی قیمت:

تحریر الوسیلہ میں امام خمینیؒ تحریر فرماتے ہیں :

دونوں آنکھوں کی دیت کامل دیت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کی دیت نصف ہے، چندھے،بھینگے رات میں بہتر دیکھنے والا یا رات میں کم دیکھنے والا یا آشوب چشم والا اس شخص کی مانند ہے کہ جس کی آنکھیں صحیح ہیں اور اگراس کی آنکھ کی سیاہی میں سفیدی ہو اور دیکھنے کی صلاحیت اس طرح باقی ہے کہ دیکھنے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے تواس کی دیت پوری ہے۔ اور اگر بینائی کو نقصان پہنچا ہو تو اسی لحاظ سے دیت کے حساب سے کم ہوجائے گی لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ جب تشخیص کا امکان ہو اور اگر اس کا امکان نہ ہوتو اس صورت میں ارش ہے یعین صحیح و معیوب کے درمیان فرق کے لحاظ سے دیت دی جائے گی۔

کتاب، مبانی تکملۃ المنھاج میں، آنکھ کی دیت کے بارے میں یہ تحریر ہے :وفیھما۔۔۔۔۔ دونوں آنکھوں میں ایک کامل انسان کی دیت ہے، پھر حاشیہ پر لکھتے ہیں : اس سلسلہ میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ شیخ اور ابن زہرہ نے تو غیر شیعہ کے اختلاف کی نفی کا بھی دعویٰ کیا ہے اور مسالک میں اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور سند کے عنوان سے جو روایت نقل کی ہیں ان میں ایک عبداللہ بن سنان کی صحیحہ ہے، انھوں نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

انسان کے بدن میں جس چیز کا جوڑا ہے، جیسے کہ دو ہاتھ اور دو آنکھ، ان میں سے ہر ایک کے لئے نصف دیت ہے۔

اس کے بعد اصل مسئلہ میں فرماتے ہیں :

ہر آنکھ کے لئے نصف دیت ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ آنکھ صحیح تھی یا نہیں، آیت اللہ گلپائیگانی سے لڑکی کی آنکھ خراب کرنے کی دیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: عورت کی ایک آنکھ کی دیت، عورت کی پوری دیت کی نصف ہے۔ یقینا انسان کی دونوں آنکھوں کی قیمت خود انسان کی قیمت کے برابر ہے۔

پیر کا حق

تمہارے پیروں کا حق یہ ہے کہ ان سے اس چیز کی طرف نہ جاؤ جو تمہارے لئے حلال نہیں ہے اور انھیں اس راستہ کے لئے اپنی سواری نہ بناؤ جو چلنے والے کی سبکی کا باعث ہوتا ہے کیونکہ وہ تمہیں اٹھاتے ہیں اور دین کی طرف لے جاتے ہیں اور تمہارے آگے بڑھنے کا سبب ہوتے ہیں اور خدا کے علاوہ کوئی قوت و طاقت نہیں ہے۔

لفظ(’’ ر ‘‘ کے کسرے کے ساتھ ) قرآن مجید میں بھی آیا ہے: ’’ ارکض۔۔۔۔۔ اپنے پیر سے چلو، اس کی جمع ارجل ہے، سورۂ اعراف کی ایک سو پچانویں (۱۹۵) آیت میں ارشاد ہے: اللھم۔۔۔۔ اور راستہ چلنے میں دوقدموں کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے اسے قرآن مجید میں ’’ خطوہ ‘‘ (خ کے ضمہ کے ساتھ ) کہا گیا ہے اسی طرح (خ کے فتحہ کے ساتھ) خطوہ ایک مرتبہ قدم اٹھانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے پہلے کی جمع خطوات اور دوسرے کی جمع خطوات ہے۔

شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے مراد اس کا وسوسہ اور گدگدانا ہے، راستہ چلنے میں صحیح معنی میں اتباع کرنے کا مفہوم یہ ہے اپنے پیر کو اس شخص کے نقش قدم پر رکھنا کہ جس کا اتباع کررہا ہے اور اسی کی مانند راستہ طے کرنا ہے یہ لفظ ’’ خطوات ‘‘ جمع کی صورت میں قرآن مجید میں پانچ جگہ استعمال ہوا ہے: سورۂ بقرہ آیت ۱۶۸ و ۳۰۸ سورۂ انعام آیت ۴۲ اور سورۂ نور کی آیت ۲۱ مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے سفر میں شیطانی سج دھج کا تابع نہ ہوجائے بلکہ اس صحیح راستہ پر گامزن ہو جو انبیاء کے ذریعہ پہچنوایا گیا ہے۔

راستہ چلنے کے معنی میں قرآن میں دوسرا لفظ ’’ مشی‘‘ بیان ہوا ہے، راغب کہتے ہیں :

الانتقال۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہے: ’’کلما۔۔۔۔۔ ‘‘ جب انھیں روشنی ملتی ہے تو وہ چل کھڑے ہوتے ہیں۔

’’ مشی‘‘ معنوی طور پر راستہ طے کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، سورۂ حدیدی کی ۲۸ ویں آیت میں آیا ہے:

ویجعل۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہم نے تمہارے لئے ایک نور قرار دیا ہے جس میں تم چلتے پھرتے ہو، اس سے مراد زندگی میں نور ایمان ہے۔

خدا کے خاص بندے کس طرح چلتے ہیں ؟

ؒ خداوند عالم نے قرآن مجید کے سورۂ فرقان میں اللہ کے بندو ں ’’ عباد الرحمٰن ‘‘ کے (بارہ)۱۲ صفات و خصوصیات بیان کئے ہیں ان میں سے پہلی خصوصیت راستہ چلنا ہے: وعباد۔۔۔۔۔۔

خدا کے خاص بندے وہ ہیں جو سکون وقار اور خاکساری کے ساتھ راستہ چلتے ہیں۔

’’ ہون ‘‘ مصدر ہے جس کے معنی خاکساری اور تکبر نہ ہونے کے ہیں اور یہاں مصدر اسم فاعل کے معنی میں تاکید کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ ایسے ہیں بلکہ عین خاکساروعدم تکبر ہیں۔ بیشک خدا کے خاص بندوں کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تکبر و غرور نام کو بھی نہیں ہوتا ہے ؛یہ خصوصیت ان کے تمام اعمال میں یہاں تک کہ راستہ چلنے میں بھی دیکھی جاسکتی ہے کیونکہ اخلاق اقدار اور ملکات انسان کے اعمال، گفتگو اور حرکات میں نمایاں ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں رسول ؐ کے لئے خدا کا اہم دستور:

خدا نے اپنے رسول ؐ کو جو اہم دستورات دیئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے: ولا۔۔۔۔

روئے زمین پر اکڑ کر نہ چلو کیونکہ نہ تم زمین کو شگافتہ کرسکتے ہو اور نہ طول قامت میں پہاڑ کی مانند ہوسکتے ہو۔

یہ آیت ان مغرور تکبر کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے جو راستہ چلنے میں پٹک پٹک کر زمین پر قدم رکھتے تھے اس سے ان کا مقصد لوگوں کو اپنی آمد ورفت سے آگاہ کرنا تھا، گردن اٹھا کر چلتے تھے تاکہ بزعم خود دوسروں سے ممتاز ہوجائیں ان لوگوں سے قرآن کہتا ہے: اگر تم زمین پر اپنا پیر پٹکتے ہوتو اس سے تم زمین کو ہرگز شگافتہ نہیں کرسکوگے کیا تم اس کرۂ زمین پر ایکچھوٹا سا ذرہ نہیں ہو! تم کتنی ہی گردن بلند کرلو پہاڑ کے برابر ہرگز نہیں ہوسکتے بلکہ اپنے قد کو ایک سینٹی میٹر بھی نہیں بڑھا سکتے۔

بعض لوگ ایسی منزل پہ پہنچ جاتے ہیں کہ وہ خود کو فراموش کردیتے ہیں، اپنی حقیقت کو بھول جاتے ہیں اور خود کو بڑا سمجھنے لگتے ہیں، رسول ؐ کی ایک شاندار حدیث ہے: ایک روز آپ ایک کوچہ سے گزر رہے تھے، ایک جگہ کچھ لوگ جمع تھے، آپ نے ان کے جمع ہونے کی وجہ دریافت فرمائی : عرض کیا گیا کہ ایک دیوانہ ہے جو مضحکہ خیز حرکت کررہا ہے آپ نے ان لوگوں کو اپنے پاس طلب کیا اور فرمایا: کیا میں یہ بتاؤں کہ صحیح معنی میں دیوانہ کون ہے مجمع پر سناٹا تھا سب ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔ فرمایا:

جو غروروتکبر کے ساتھ راستہ چلتا ہے اور مستقل ادھر ادھر دیکھتا ہے اپنے کندھوں سے اپنے پہلوؤں کو حرکت دیتا ہے (اپنے علاوہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتا ہے اپنے وجود سے آگے اس کی نگاہ نہیں جاتی ہے) جس سے لوگوں کو کسی نیکی کی امید نہیں ہوتی جس کے شر سے وہ محفوظ نہیں ہیں یہی صحیح معنوں میں دیوانہ ہے اور جس کو تم دیکھ رہے تھے یہ تو ایک بیمار ہے۔

راستہ چلنے میں خاکساری یہ نہیں ہے کہ سست چلے اور پھونک پھونک کر قدم رکھے بلکہ خاکساری یہ ہے کہ ایسے قدم اٹھائے جس سے سکون وقار اور سنجیدگی ظاہر ہوتی ہو۔

رسولؐ کے چلنے کا انداز

کتاب مکارم الاخلاق میں ایک بحث رسول ؐ کے راستہ چلنے سے متعلق ہے جس کا عنوا ’’ فی مشیہ ‘‘ ہے روایات میں سے ایک روایت یہ بھی ہے:

حضرت علی بن ابی طالب ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: جب رسول ؐ راستہ چلتے تھے تو عجلت کے ساتھ نہیں چلتے تھے لیکان اس طرح تیزی سے قدم اٹھاتے تھے جیسے اوپر سے نیچے اتر رہے ہوں، نہ میں نے آپ سے پہلے کسی کو اس طرح چلتے دیکھا اور نہ آپ کے بعد۔

رسول ؐ کے ایک صحابی کا بیان ہے: میں نے کسی کو رسول ؐ سے تیز چلتے ہوئے نہیں دیکھا لگتا تھا گویا آپ کے قدم کے نیچے کی زمین سمٹ رہی ہے ہم مشکل سے آپ تک پہنچتے تھے، حالانکہ آپ کے لئے یہ کوئی مشکل نہ تھی۔

ابن عباس کہتے ہیں : جب رسول ؐ راستہ چلتے تھے تو نہ عاجز و ناتواں کی مانند چلتے تھے نہ کہ کاہل و سست کی طرح۔

راستہ چلنے کے بارے میں لقمان کی نصیحت :

سورۂ لقمان میں ان نصیحتوں کے ذیل میں جو کہ لقمان نے اپنے فرزند کو کی ہیں، یہ جملہ بھی ہے:(ولا تمش۔۔۔۔۔۔۔۔۔فخور)

بیٹا زمین پر اکڑ کر نہ چلو کیونکہ خدا کسی مغرور و متکبر کو پسند نہیں کرتا ہے۔

مرح، فرح کے وزن پر ہے جس کے معنی نعمت کے سبب مغرور و مست ہونا ہیں اور مختال، خیال خیلاء سے مشتق ہے اس کے معنی اپنے خیال میں خود کو بڑا سمجھنا ہے، اور فخور، فخر سے مشتق ہے، یعنی دوسروں کے سامنے فخر کرنے والا مختال و فخور میں یہ فرق ہے کہ پہلا لفظ کبر آلود ذہنی تخیلات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا کبر آمیز بیرونی اعمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بعد والی آیت میں اثباتی پہلو کو بیان کرتا ہے۔ ’’ واقصد۔۔۔۔ ‘‘ اپنا راستہ چلنے میں اعتدال کو ملحوظ رکھو، رسول ؐ کی حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے:

جو شخص غروروتکبر کے ساتھ زمین پر چلتا ہے اس پر زمین اور زمین کے اندر والے اور روئے زمین پر بسنے والے لعنت کرتے ہیں۔

امالی میں ایک حدیث میں ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے جن سے رسول ؐ نے روکا ہے: رسول ؐ نے غروروتکبر کے ساتھ راستہ چلنے سے منع کیا ہے اور فرمایا: اگرکوئی شخص کوئی لباس پہننے اور اس پر تکبر کرے تو خداوند عالم اس کو زمین کے اس گڑھے میں پہنچا دیتا ہے جو جہنم کے کنارے ہے اور ایسا شخص قارون کا ہم نشیں ہوگا کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے تکبر و غرور کی بنیاد رکھی تو خدا نے اسے اس کے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا اور نابود کردیا۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : خدا نے انسان کے اعضاء وجوارح پر ایمان کو واجب کیا ہے اور ایمان کو ان کے درمیان تقسیم کیا ہے، پیروں پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ گناہ و معصیت کی طرف نہ جائیں اور خدا کی مرضی کے مطابق اٹھائیں۔

روز قیامت کے گواہ

خداوند عالم قرآن مجیدمیں ارشاد فرماتا ہے: آج ہم ان کے منھ پر مہر لگاتے ہیں آج ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پیر ہمارے سامنے ان کاموں کیگواہی دیں گے جو انھوں نے انجام دیئے ہیں۔

سورۂ نورمیں آیا ہے:جس دن ان کے خلاف ان کے کئے ہوئے اعمال کی گواہی ان کی زبان، ان کے ہاتھ اور ان کے پیر دیں گے۔

اعضاء کے بولنے اور گویا ہونے کی کیفیت کے سلسلہ میں مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں۔

۱۔ اس دن خدا ہر عضو کے اندر ادراک وشعور اور بولنے کی قدرت پیدا کردے گا اور وہ سچ بولیں گے، کیا یہ کوئی تعجب کا مقام ہے؟ جس نے زبان نامی گوشت کے ٹکڑے میں یا دماغمیں یہ طاقت پیدا کی ہے وہ تمام اعضا کے اندر بھی یہ طاقت پیدا کرسکتا ہے۔

۲۔ ان کو ادراکو شعور نہیں ملے گا لیکن خدا انھیں بولنے پر اکسائے گا بلکہ وہ خدا کے حکم سے حقائق کو آشکار کریں گے اور زبان کی مانند ہوجائیں گے۔

۳۔ ہر انسان کے بدن کے اعضاء ان اعمال کے آثار کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہونگے جو اس نیپوری زندگی میں انجام دیئے ہیں کیونکہ اس دنیا میں کوئی عمل بھی نابود نہیں ہوتا ہے اور ان کے آثا کا ظاہر ہونا گواہی کے مثل ہے یہ مفہوم روزبولا جاتا ہے ادبا کے کلام میں بھی اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً کہتے ہیں :عینک۔۔۔۔۔۔، تمہاری آنکھ تمہاری بیداری کی گواہ ہیں۔ ایک فارسی شاعر کہتا ہے :

رنگ رخسارہ خبرمی دہد از سردرون

مومنوں کی حاجت روائی کے لئے جانا:

امامزین العابدین ؑ نے پاؤں کے حق کے بارے میں فرمایا ہے: اپنیپیر سے حرام جگہ نہ جاؤ اور جس راستہ میں تمہاری ہتک ہوتی ہو اس پر قدم نہ رکھو کیونکہ یہ انسان کی بے وقعتی کا سبب ہوتا ہے اگر ہم اپنی حیثیت و وقعت بنانا چاہتے ہیں تو خدا کے بندوں کی حاجت روائی کے لئے قدم اٹھائیں :

علی بن ابراہیم نے اپنے والد سے انھوں نے حماد سے انھوں نے ابراہیم بن عمر یمانی سے اور انھوں نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

کوئی بندہ ایسانہیں ہے کہ جو اپنیمومن بھائی کی حاجت روائی کے لئے قدم اٹھائے مگر یہ کہ خدا اس کے لئیہر اٹھنے والے قدم کے عوض ایک نیکی و خوبی لکھتا ہے اور اس کے ہر قدم پر ایک گناہ کو مٹاتا ہے اور اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے۔ مکارم الاخلاق کی عبارت کے مطابق امام زین العابدین ؑ نے فرمایا: تم اپنے دونوں پیروں سے پل صراط پر کھڑے ہوگے ہوشیار! تمہارے پیر نہ پھسلیں اور تمہیں جہنم میں نہ گرا دیں۔

لوگوں کا جہنم میں داخل ہونا:

خداوند عالم سورۂ مریم کی آیت ۷۱ و ۷۲ میں اس طرح اس کی خبر دیتا ہے :

تم سب جہنم میں جاؤ گے یہ تمہارے پروردگار کا حتمی حکم ہے پھر ہم اس سے ان لوگوں کو نجات عطا کریں گے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے اور ظالموں کو جو کہ عاجز آچکے ہونگے،اسی میں چھوڑ دیں گے۔

مفسرین نے ان دو آیتوں کی مختلف تفسیریں کی ہیں کہ جہنم میں داخل ہونے سے مراد کیا ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ ورود کے معنی نزدیک ہونا ہیں یعنی اچھے برے سب لوگ جہنم سے نزدیک ہوکر اسے دیکھیں گے پھر نیک و شریف بچ جائیں گے برے لوگ جہنم میں چلے جائیں گے اس پر انھوں نے حضرت موسیٰ کے بارے میں نازل ہونے والی سورۂ قصص کی آیت سے استدلال کیا ہے، ارشاد ہے: ’’ولما۔۔۔۔‘‘ جس وقت موسیٰ مدین کے پانی کے کنارے پہنچے۔

دوسری تفسیرکہ جس کو اکثرمفسرین نے اختیار کیا ہے، یہ ہے : ورود کے معنی نزدیک ہونا نہیں ہیں بلکہ یہ داخل ہونے کے معنی میں ہے، حقیقت میں سارے انسان جہنم میں داخل ہوں گے لیکن مومنین نجات پاجائیں گے اور مشرکین اس مماثلت کے مطابق جو کہ ان کو آگ سے ہے اسی میں رہ جائیں گے، جو قرینہ اس تفسیر کی تقویت کررہا ہے وہ آیت کا آخری جملہ ہے: ثم۔۔۔۔ اس سے دوسرے معنی ہی سمجھ میں آتے ہیں پھر اس آیت کی تفسیرسے متعلق جو حدیثیں آئی ہیں وہ بھی دوسرے معنیہی کی تاکید کررہی ہیں۔

جابر بن عبداللہ انصاری سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ ایک شخص نے ان سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا، جابر نے دو انگلیوں سے دونوں کانوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا : میرے ان دونوں کانوں نے رسول ؐ سے سنا ہے اگر جھوٹ بولوں تو یہ بہرے ہو جائیں فرماتے تھے یہاں ورود کے معنی دخول کے ہیں، کوئی نیکوکار اور بدکار ایسا نہیں ہے جو جہنم میں نہ جائے لیکن مومنوں کے لئے آگ ٹھنڈی ہو جائے گی اور وہ جلنے سے محفوظ رہیں گے بالکل اسی طرح جس طرح ابراہیم کے لئے ہوا تھا، یہاں تک کہ آگ یا جہنم (اس میں جابر کو شک ہے) سردی کی شدت سے فریاد کرے گا۔ پھر خداوند عالم مومنوں کو رہائی عطا کرے گا اور ظالموں کو رسوائی کے ساتھ اسی میں چھوڑ دیا جائے گا۔

دوسری حدیث رسول ؐ کی ہے : روز قیامت مومن سے آگ کہے گی : اے مومن گزرجا کہ تمہارا نور میرے شعلوں کو خاموش کئے دے رہا ہے۔

یہی معنی ان روایات سے سمجھ میں آتے ہیں جو صراط کے بارے میں آئی ہیں کہ جہنم کے اوپر ایک راستہ ہوگا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا۔

رسول ؐ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا: تمام لوگ آگ میں وارد ہونگے پھر اپنے اعمال کے مطابق اس سے باہر آئیں گے، بعض بجلی کی مانند کچھ تیز ہوا کی مثل، بعض گھوڑے کے دوڑنے کی مانند کچھ معمولی سوار کی طرح، بعض تیز چلنے والے کی مانند اور بعض معمولی راستہ چلنے والے کی طرح۔

پیروں کی ساخت:

دھڑ کے نچلے حصہ میں رانوڈ سے اوپر کا حصہ، ران، پیراورپنڈلیاں ہیں انوں سے اوپر کا حصہ بدن کے نچلے حصہ کو اوپر کے حصہ سے جوڑتا ہے یہ، کمر بند ہڈی ریڑھ کی ہڈی کی انتہا اور کولہے ہڈی سے تشکیل پاتی ہے۔

کولہے کی ہڈیاں پیچھے کی طرف سے خاجی ہڈیوں سے اور سامنے کی طرف جوڑ سے متصل ہوکر ایک گڑھا سا بن گیا ہے اس کو مجموعہ پیڈو کہتے ہیں :

لیکن کولہے کی ہڈی چوڑی اور اَنْ گھڑ قسم کی ہوتی ہے یہ تین ہڈیوں "lliams, Isehiam, pubis"سے مل کربنی ہے۔

ران کی ہڈی:

یہ ہڈی پوری ران کو تشکیل دیتی ہے، اس کا اوپر کا حصہ گول جو ایک بڑی، چپٹی ہڈی کے پیالہ نما گہرے خانہ میں فٹ ہے اور نیچے جاکر پنڈلی سے گھٹنے کے جوڑ پر مل جاتی ہے، واضح رہے کہ کھڑے ہونے کی صورت میں ران ی ہڈی، اندر کی طرف جھکی رہتی ہے اور چونکہ عورتوں کا پیڈو کچھ چوڑا ہوتا ہے اس لیے ان کی ران زیادہ جھکی رہتی ہے، ران کی ہڈی، بدن کی سب سے زیادہ لمبی ہڈی ہوتی ہے۔ اس میں ایک تنہ اور دو اطراف ہوتے ہیں، ران کی ہڈی تکونی ہے، اس کا بالائی حصہ، دو حصوں، سروگردن، میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس ہڈی کا سرا صاف اور کروی ہوتا ہے، ران کا بالائی حصہ اندر اور باہر کی طرف تمائل رکھتا ہے اس کا قطر تقریباً ۵ سینٹی میٹر ہوتا ہے ران کی ہڈی کا سرا ایک مضبوط ڈورے کے ذریعہ اسٹابولم "Acedbulum"کے گڑھے سے متصل ہوتا ہے، خون کی رگیں اسی ڈورے کے ذریعہ ران تک پہنچتی ہیں۔ اگر سن رسیدہ لوگوں کے اس ڈورے پر چوٹ لگ جائے تو ممکن ہے کہ ران کے سرے تک خون نہ پہنچنے کے سبب اس کا بالائی حصہ متاثر ہو کر نابود ہو جائے، ران کی گردن نما ہڈی باریک ہوتی ہے جو ران کے سر کو کوتنے سے ملاتی ہے۔

ران کا نچلا حصہ چوڑا ہوتا ہے جو کہ پنڈلی کی موٹی ہڈی سے متصل ہوتا ہے یہی گھٹنے کا جوڑا کہلاتا ہے۔اس کے اوپر ایک چپنی ہوتی ہے۔ گھٹنے کے جوڑ کا پچھلا حصہ تھوڑا چوڑا ہوتا ہے جس میں رگیں اور اعصاب ہوتے ہیں۔

گھٹنے کی چپنی :

گھٹنے کے جوڑ پر ایک چھوٹی سی چپنی رکھی ہوتی ہے، جو کہ تکونی ہے یہ ہڈی گھٹنے کو آگے کی طرف جھکنے سے روکتی ہے۔

پنڈلی ہڈیاں :

پنڈلی میں د و لمبی لمبی ہڈیاں ہوتی ہیں، ایک موٹی اور دوسرے باریک،موٹی ہڈی اندر اور باریک باہر کی طرف واقع ہے یہ دونوں اپنے بالائی اور نچلے حصہ میں ایک دوسرے سے متصل ہیں ہاں بیچ میں دونوں جدا رہتی ہیں۔

پنڈلی کی موٹی ہڈی:

یہ ایک لمبی ہڈی ہے اس کا اوپری حصہ موٹا ہوتا ہے اور اس میں دو ابھارے ہوتے ہیں، اس کا بالائی حصہ ران کے نچلے حصہ سے جڑ جاتا ہے۔

پنڈلی کی باریک ہڈی:

یہ ہڈی باریک اور لمبی ہوتی ہے اور پیر کے بیرونی حصہ میں واقع ہوتی ہے اس کا بالائی حصہ گھٹنے تک نہیں پہنچتا ہے ہاں موٹی ہڈی کے آخری حصہ سے جڑ جاتا ہے اور نیچے کی طرف نکیلی ہڈی ہے جوٹخنے کی ہڈی کے اوپر ٹکی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

پیر کی ہڈیا ں :

پیر میں تین جوڑ ہیں :۱۔ ٹخنے کی ہڈیاں ۲۔ پیر کے تلوے کی ہڈیا ں ۳۔ انگلیوں کی ہڈیاں ٹخنہ سات چھوٹی چھوٹی مضبوط سات ناہموار ہڈیوں سے مل کر بنا ہے یہ ہڈیاں دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں، نیچے اور اوپر، نچلے حصہ میں دو پلیٹ نما ہڈیاں اور ایک ایڑی ہے اور اوپر کا حصہ ٹخنہ ہے۔

استخوان قاب:

یہ چھوٹی چھوٹی ہڈیاں اوپر کی طرف پنڈلی ہڈیوں سے او ر نیچے کی طرف ایڑی کی ہڈی سے اور سامنے کی طرف ٹخنہ کی ہڈی سے جدا ہوتی ہے۔

ایڑی کی ہڈی:

یہ چھوٹی ہڈی صرف ایڑی ہی ہے اور پاؤں کے گٹے کی ہڈی کے نیچے واقع ہے۔

تلوے کی ہڈی:

اس میں پانچ لمبی ہڈیاں ہیں جو پیر کے پیچھے کی طرف سے گٹے کی ہڈیوں سے اور سامنے کی طرف سے انگلیوں کے جوڑ سے جدا ہوتی ہیں

۔ پیر کے تلوے کی ہر ہڈی میں بھی ایک تنہ اور دوا طرف ہوتے ہیں۔

تلوے کی کمان نما ہڈی:

تلوے کی ہڈی سپاٹ اور مسطح نہیں ہے بلکہ اس میں ٹیڑھا پن ہے۔ یہ ٹیڑھا پن اور پیرکی عرضی و طولی سطح میں واقع ہے۔ کھڑے ہونے کی حالت میں یہ بوجھ سنبھالتی ہے، اس سے راستہ چلنے میں آسانی ہوتی ہے اگر خدانخواستہ یہ تختہ کے مثل سپاٹ ہوتا تو راستہ چلنا دشوار ہوجاتا۔

انگلیوں کے پور:

یہ ہاتھ کی انگلیوں کے پور سے کچھ چھوٹے ہوتے ہیں۔ انگوٹھوں کے علاوہ پیر کی ہرانگلی میں تین تین پور ہیں، پیروں کی انگلیاں، ہاتھوں کی انگلیوں کی بہ نسبت اندر کی طرف سے باہر کی جانب گئی جاتی ہیں یعنی انگوٹھے کو اول کہتے ہیں۔

پیر کی فقہی قیمت:

امام زین العابدین ؑ نے پیر ایسی عظیم نعمت اور اس سے لئے جانے والے کام کے بارے میں وصیت فرمائیہ ے لیکن انسان کے اس عضو کا، جو کہ راستہ چلنے کا عامل ہے، فقہی اعتبار سے کیا حق ہے؟

کتاب تکملۃ المنھاج میں اس طرح بیان ہوا ہے:

دونوں پیر کاٹنے کی دیت ایک انسان کی دیت ہے اور ایک پیر کی دیت نصفہے اس میں کوئی فرقنہیں ہے کہ پیر جوڑ سے کاٹا جائے یا پنڈلی سے یاران سے۔

پیر کی ساری انگلیاں کاٹنے کی پوری دیت ہے، مختصر النافع میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

دونوں پیروں کی دیت پوری ہے اور ان میں سے ایک کی دیت نصف ہے اور دونوں پیروں کی حد پنڈلی کا جوڑ ہے اور پیر کی انگلیوں کا وہی حکم ہے جو ہاتھوں کی انگلیوں کا ہے۔ (جیسا آئندہ بیان ہوگا)

ہاتھ کاحق

ہاتھ کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ اسے اس چیز کی طرف نہ بڑھاو جو تمہارے لئے حلال نہیں ہے (کیونکہ اگر ایسا کروگے تو ) آخرت میں خدا کے عقاب میں مبتلا ہوگے اور دنیا میں لوگوں کی ملامت سے بھی محفوظ نہیں رہو گے اوراسے اس چیز سے بند نہ رکھو جو خدا نے تم پر واجب کی ہے اور اس کا احترام اس طرح کرو کہ ان سے ان بہت سے کاموں کا انجام نہ دو جو ان کے لئے حلال نہیں ہیں اور ان کو ان چیزوں کے لئے کھولو جن میں ان کا نقصان نہیں ہے پھر اگر اس دنیا میں ہاتھ حرام سے باز رہے یا عقل و شرافت سے کام لیا تو آخرت میں ان کے لئے ثواب ہے۔

’’ ید‘‘ کے معنی ہاتھ اور قرآن میں اس کی جمع ’’ ایدی ‘‘ بیان ہوئی ہے سورۂ فتح آیت ۲۰ میں ہے ’’کف۔۔۔۔۔‘‘ لیکن استعارہ کے طور پر ہاتھ متعدد معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ قدرت، تسلط اور ملک جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت۲۶ میں بیان ہوا ہے ’’ بیدک۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ اختیار تیری ہی قدرت میں ہے تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ید مغلول ہاتھ روکنے کے معنی میں ہے چنانچہ سورۂ مائدہ کی ۶۴ ویں آیت ہے۔’’وقالت۔۔۔۔ ‘‘یہودی کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوے ہیں، ان کے ہاتھ بندھ جائیں وہ اپنے قول کی بنا پر لعنت کے مستحق بن گئے بلکہ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، جس طرح چاہتا ہے انفاق کرتا ہے۔

۲۔طاقت و قدرت: سورہ ص کی ۴۵ ویں آیت : واذکر۔۔۔۔۔۔، ہمارے بندے ابراہیم و اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو کہ صاحب اقتدار اور (اطاعت خدا میں ) بصیرت رکھنے والے تھے۔

ہاتھ فساد کی جڑ

باوجودیکہ دونوں ہاتھ خدا کی ان نعمتوں میں سے ہیں جو خدا نے انسان کو عطا کی ہیں اور ان کی دیت ایک انسان کی دیت کے برابر قرار دی ہے لیکن زیادہ تر گناہ کا سبب یہی ہوتے ہیں ان میں سے بعض کی طرف قرآن اشاہ کرتا ہے، ارشاد ہے: ظھر الفساد۔۔۔۔۔۔ یرجعون۔

خشک و تر میں ان کاموں کی وجہ سے فساد پھیل گیا ہے جو کہ لوگوں کے ہاتھو ں نے کئے ہیں، خداوند عالم چاہتا ہے کہ انھیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے شاید یہ (حق کی طرف ) لوٹ آئیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے ہر غلط کام معاشرہ کی کیفیت پر اور اس کے ذریعہ معاشرہ کے افراد پر اثرانداز ہوتا ہے اور اجتماعی نظام میں فساد کا باعث ہوتا ہے اور اپنے عمل و رد عمل کا اثر چھوڑ جاتا ہے، بہت سی غلطیاں اور بد بختیاں انسان کے ہاتھ سے انجام پاتی ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: ما۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کثیر۔

جو مصیبت بھی تمہارے اوپر پڑتی ہے وہ ان اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے جو تمہارے ہاتھوں نے انجام دیئے ہیں اور بہت سے بخش دیئے جاتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان پر جو مصائب پڑتے ہیں وہ ایک قسم کی خدائی جزا ہیں، خداوند عالم سورۂ بقرہ میں ارشاد فرماتا ہے:

راہ خدا میں خرچ کرو اور (اورایسا نہ کرکے) خود کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیک کام انجام دو کہ خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بہت سی ہلاکتیں خود انسان کے ہاتھوں سے وجود میں آتی ہیں لہٰذا خدا نے خبردار کیا اور ہلاکت میں پڑنے سے منع کیا ہے۔

کبھی انسان انھیں ہاتھوں کے ذریعہ کہ جن سے اپنے لئے گھر بنانا چاہیے اپنے ہی گھر کو ویران و برباد کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ سورۂ حشر میں ارشاد ہے: وقذف فی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الابصار۔

ان کے دلوں میں اس طرح خوف و وحشت ڈال دی ہے کہ انھوں نے خود اپنے اور مومنین کے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کردیا اے بصارت و بصیرت رکھنے والو عبرت حاصل کرو۔

یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے بعض لوگوں کا قول ہے کہ وہ اندر اندر قلعوں کی دیواروں کو اس لئے گرارہے تھے تاکہ وہاں سے بھاگ نکلیں، اور ممکن ہے اس کی کنای معنی مراد ہوں کہ انھوں نے اپنی جاہلیت اور ہٹ دھرھی کی وجہ سے اپنی زندگی برباد کرڈالی۔ بہر حال، خدا یہ فرماتا ہے کہ بعض انسان اپنے ہاتھوں اپنی سعادت کو گنوا دیتے ہیں۔

قتل، ہاتھ کا گناہ:

آدم کے بیٹوں کی داستان میں ہولناک ترین موضوع، قتل ہے۔ جب خدا نے ایک کی قربانی کو قبول فرمالیا اور دوسرے کی قربانی کو رد کردیا، تو اس نے اپنے بھائی کو قتل کی دھمکی دی، بھائی نے جواب دیا : میں تمہیں قتل نہیں کرونگا۔

لئن بسطت۔۔۔۔۔۔۔۔ رب العالمین۔

اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے دست درازی کروگے تو میں تمہارے قتل کے لئے ہرگزہاتھ نہیں اٹھاؤ نگا، کیونکہ میں عالمین کے پروردگار خدا سے ڈرتا ہوں۔

اس آیت میں ہاتھ کا ذکر ہوا ہے، ایک بھائی دوسرے بھائی سے کہتا ہے :اگر تم اپنے ہاتھ کو گناہ سے آلودہ کروگے تو میں ہرگز ایسے گناہ کا مرتکب نہیں ہونگا۔قرآن میں جن مقامات پر ہاتھو ں کی طرف گناہوں کی نسبت دی گی ہے ان میں سے بعض کو ہم نے بیان کیا ہے اب ہم حدیثوں میں سے بعض حدیثیں پیش کرتے ہیں جن میں ہاتھوں کے فرائض کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اصول کافی میں ایک باب اس عنوان سے قائم ہوا ہے کہ انسان کے اعضاء و جوارح کے درمیان ایمان تقسیم ہوا ہے۔ امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

خدا نے ہاتھوں پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ ان چیزوں کی طرف نہ بڑھیں جن کو خدا نے ان پر حرام کیا ہے اور ان امور کو انجام دیں جن کا خدا نے حکم دیا ہیجیسے صدقہ دینا، صلہ ٔرحم اور راہ خدا میں جہادکرنے اور نماز کے لئے طہارت کرنا واجب کیا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

اے ایمان لانے والو!جب تم نماز کے لئے اٹھو! تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لیا کرو ار اپنے سروں کا اور پیروں کا ٹخنوں تک مسح کرو۔

قرآن مجید میں متعدد جگہوں پ ہاتھوں کا مختلف الفاظ میں ذکر ہوا ہے اور اہم چیزوں کی ہاتھوں کی طرف نسبت دی گئی ہے ان میں سے بعض کو ہم اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں :

ہاتھ سے بیعت:

بیشک خدا مومنین سے اس وقت راضی ہوا جب انھوں نے (اے رسول ؐ) درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے دلوں کی کیفیت معلوم ہوگئی لہٰذا ان کے دلوں میں سکون و آرام نازل کیا اور انھیں قریبی فتح نصیب کی۔

بیعت ’’بیع‘‘سے مشتق ہے جس کے معنی خرید وفروخت کے وقت ہاتھ میں ہاتھ دینے کے ہیں، لیکن بعد میں بیعت کا اطلاق عہد و اطاعت کے لئے ہاتھ دینے کے عمنی پر ہونے لگا اس بیعت کی کیفیت یہ تھی کہ جب کوئی شخص کسی سے وفاداری کا اعلان کرتا تھا اور اس کو صحیح سمجھتا تھا اور اس کی اطاعت کرتا تھا تو وہ اس کی بیعت کرتا تھا شاید ان معنی پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا تھا کہ طرفین خرید و فروخت کے معاملہ کی مانند ایک دوسرے سے پابند رہنے کا عہد کرتے تھے،بیعت کرنے والا اس بات کے لئے آمادہ ہوتا تھا کہ وہ بیعت لینے والے کی اطاعت میں مال و اولاد وغیرہ کی قربانی کے لئے تیار رہتا ہے۔ بیعت لینے والا بھی اس کی حمایت اور اس کا دفاع کرنے کا عہد کرتا ہے۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں لکھا ہے:

جب وہ کسی امیر کی بیعت کرتے تھے تو اس کے استحکام کے لئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے تھے بالکل ایسے ہی جیسے خریدار و فروخت کنندہ کرتے ہیں۔

خداوند عالم سورۂ فتح میں اپنے رسول ؐ سے فرماتاہے: ان الذین۔۔۔۔۔

اے رسولؐ جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں در حقیقت وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں، مرد ہاتھ سے رسول ؐ کی بیعت کرتے تھے لیکن عورتیں ایک پانی کے برتن میں ہاتھ ڈال کربیعت کرتی تھیں۔

لوگ رسول ؐ اور ائمہ ؑ کی بیعت اس لئے کرتے تھے تاکہ ان سے اپنی وفاداری کی تجدید کرکے اسے مستحکم کریں لہٰذا بیعت توڑنے کو بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت موسی بن جعفر یعنی امام موسیٰ کاظم ؑ فرماتے تھے:

تین گناہ انسان کو ہلاک کردیتے ہیں : بیعت توڑنا، سنت کو ترک کرنا اور جماعت کو چھوڑنا۔ ہاتھوں کے اہم کاموں میں سے ایک بیعت بھی ہے۔

ہاتھ سے جزیہ دینا:

قرآن مجید میں جن مقامات پر ہاتھ کا ذکر ہوا ہے انھیں میں سے ایک ہاتھ سے جزیہ دینا بھی ہے سورۂ توبہ میں ارشاد:

قاتلو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صاغرون

(اے رسول) اہل کتاب میں سے جو لوگ خدااور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لائے ہیں اور نہ خدا اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ آئین حق کو قبول کرتے ہیں ان سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک کہ وہ چھوٹے بن کر ہاتھ سے جزیہ نہ دیدیں۔

’’ جزیہ‘‘ جزاء سے مشتق ہے، جزیہ اس مال کو کہتے ہیں جو ان غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کی پناہ میں رہتے ہیں۔ اور یہ جزیہ ؛ جان و مال کی حفاظت کی جزاء میں اسلامی حکومت کو دیا جاتا ہے۔

’’صاغر‘‘ صغر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں حقیر و ذلیل بننے پر راضی ہونا اور مذکورہ آیت میں مراد اسلام و قرآن کے سامنے ذلیل وخوار ہوکر جزیہ ادا کرنا ہے۔

جزیہ ایک قسم کا اسلامی ٹیکس ہے جس کا تعلق افراد سے ہوتا ہے اموال و اراضی سے نہیں، دوسرے لفظوں میں اسے سالانہ ٹیکس کہہ سکتے ہیں، بعض لوگوں کا گمان ہے کہ لفظ جزیہ عربی نہیں ہے بلکہ اس کی اصل پرانی فارسی کے لفظ ’’کریت‘‘ ہے یعنی وہ ٹیکس جو فوج کی تقویت کے لئے لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے برخلاف لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خالص عربی ہ ے،جزیہ کے سلسلہ میں اسلمی حکومتوں اور اہل کتاب کے درمیان معاہد ے ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہاں بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے اور یہ معاہدہ وہ ہے جو خالد بن ولید اور فرات کے اطراف میں بسنے والے عیسائیوں کے درمیان ہواتھا۔ معاہدہ کا متن:

ھذا کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فی صغر

یہ خط خالد بن ولید کی طرف سے عیسائیوں کے سردار صلوبا اور اس کی قوم کے نام ہے میں تم سے جزیہ اور دفاع پر یہ معاہدہ کرتا ہوں اور اس جزیہ کے عوض تم ہماری پناہ و حمایت میں رہو گے جب تک تم ہمیں جزیہ دیتے رہو گے تم ہماری حمایت میں رہو گے اور جب ہم تمہارا دفاع وحمایت چھوڑ دیں گے تو پھر کوئی جزیہ نہیں لیں گے۔ یہ معاہدہ ماہ صفر ۱۲ھ؁ لکھا گیا۔

جزیہ ہاتھ سے دیا جائے یہ بھی جزیہ کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔

ہاتھ کی فزیکی ساخت

ہاتھ میں تین ہڈیاں ہیں، کلائی، ہتھیلی اور انگلیاں، یہ ہڈیاں مجموعی طور پر آٹھ ہیں جو کہ دوردیفوں میں چار چار ہیں اوپر کے حصہ کا نچلا حصہ کلائی کے نزدیک ہے، ان میں سے تین ہڈیاں کلائی کی ہڈی کے ساتھ گٹے کے مفصل و جوڑ کو بناتی ہیں، نیچے کی ہڈیاں بھی ہاتھ کی ہتھیلی کے ساتھ مفصل بن جاتی ہیں۔

ہتھیلی کی ہڈیاں :

ہاتھ کی ہتھیلی میں پانچ ہڈیاں ہوتی ہیں جن کو باہر کی طرف سے اندر کی طرف گنا جاتا ہے (پہلی اور دوسری) اوپر کی طرف ہاتھ کے گٹے کی نچلی ہڈیوں کے ساتھ اور نیچے کی طرف انگلیوں کے پہلے پور کے ساتھ گٹا بنتی ہیں۔

انگلیوں کے پور:

انگوٹھے کے علاوہ ہاتھ کی تمام انگلیوں میں تین پور ہوتے ہیں ار ہر پور میں ایک ہڈی ہوتی ہے جس کو ’’ بند انگشت‘‘ کہتے ہیں ہر انگلی کی ایک ہڈی ہتھیلی کی ہڈیوں سے جدا ہوتی ہے انگلیوں کے پور کے بالترتیب نام ہیں۔

ان ہڈیوں میں ایک تنہ اور دو اطراف ہیں، پہلے پور کی ہڈی کے اوپر کا حصہ ہتھیلی کی ہڈی سے اور ان کے نیچے کا آخری حصہ دوسرے پور کی ہڈی کے اوپرکا حصہ دوسرے پور کا مفصل یا جوڑ ہوتا ہے۔ پور کی ہڈیاں انگلی کے پہلے پور ہی کی مانند ہوتے ہیں۔ بس تیسرے پور کے نچلے حصہ کے آخر میں مفصل نہیں ہوتا ہے۔

ممکن ہے بیان شدہ ہڈیوں کے علاوہ ہتھیلی کے مفصل سے پہلے اور انگلیوں کے پور میں چھوٹی چھوٹی ہڈیاں ہوں جن کو استخوان کنجدی کہتے ہیں۔

فقہ کی نظر میں ہاتھ کی قیمت

اسلامی فقہ میں انسان کے دونوں ہاتھوں کی قیمت پوری دیت مقرر کی گئی ہے اور ایک ہاتھ کی نصف دیت رکھی گئی ہے، مسانی تکملۃ المنہاج میں تحری ہے:

دونوں ہاتھ کاٹنے کی پوری دیت ہے اور ایک ہاتھ کی نصف دیت ہے اس مسئلہ میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ میں دونوں (منقول و محصل) قسم کا اجماع ہے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس مسئلہ اور اس کے حکم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس حکم پر بہت سی حدیثیں دلالت کررہی ہیں ان میں وہ حدیثیں بھی دلالت کررہی ہیں جو کہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو چیزیں انسان کے بدن کے اندر دو، دو ہیں ان کی دیت پوری ہے مثلاً ہشام بن سالم کی صحیحہ ہے:

ہشام بن سالم نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

جو چیزیں انسان کے اندر دو ہیں ان کی پوری اور ایک کی نصف دیت ہے۔

امام خمینی ؒ تحریر فرماتے ہیں :

ہاتھ کاٹنے کی دیت پوری ہے اور ایک ہاتھ کی دیت نصف ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ ہاتھ دایاں ہو یا بایا ں اور جس شخص کا پیدائشی ایک ہو ایک ہاتھ کہیں کٹ گیا ہوتو اس کے ہاتھ کی دیت بھی نصف ہی ہے۔

دیت کے دوسرے مسئلہ میں تحریر فرماتے ہیں :

جس ہاتھ کی اتنی قیمت ہے اس کیحد کہاں تک ہے؟ کہتے ہیں اس کیحد معصم یعنی کلائی اور ہتھیلی کے درمیان مفصل (گٹہ) ہے پس اگر ایک ہاتھ کو گٹے سے قطع کیا جائے تو اس کی نصف دیت ہے خواہ اس میں انگلیاں بھی ہوں اس فرض میں انگلیوں کے لئے الگ سے دیت نہیں ہے اگر ایک انگلی کاٹی جائے تو اس کی دیت پانچ سو دینار ہیں جو پوری دیت کا نصف ہے۔

ہاتھ کے امین ہونے کی قیمت ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کے دونوں ہاتھوں کی دیت وہی ہے جو ایک انسان کے قتل کی ہے اور ایک ہاتھ کی قیمت نصف ہے۔ یعنی پانچ سو مثقال سکہ طلا۔ ابوالعلا معری ایک روز سید مرتضیٰؒ کی خدمت میں پہنچا اور چوری کی حد (انگلیاں کاٹے جانے) پر اعتراض کیا اس نے اپنے اعتراض کا اظہار اس شعر کے ضمن میں کیا:

ید بخمس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ربع دینار

جس ہاتھ کی دیت پانچ سو مثقال سونا ہے کیا وجہ ہے اسے اس رقم کی چوتھائی چوری کرنے پر کاٹ دیتے ہیں ؟

سید مرتضیٰ ؒ ایک شعر میں اس کا جواب دیتے ہیں :

عزا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الباری

یہ امانت کی عزت ہے جس نے ہاتھ کی قیمت بڑھائی ہے اور یہ خیانت کی ذلت ہے جس نے ہاتھ کی قیمت بڑھائی ہے اور یہ خیانت کی ذلت ہے جس نے اس کی قیمت کو گھٹا دیا ہے۔

اے ابو العلاء یہ خدا کی حکمت ہے، تم مسئلہ کو صحیح طریقہ سے سمجھو خدا کے قانون پر اعتراض نہ کرو۔ دوسرے نسخہ میں یہ لکھا ہے کہ سید مرتضیٰ نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا: حراسۃ۔۔۔۔۔۔۔۔ الباری

یہ خون کی حفاظت اور مال کی نگہبانی ہے جس نے ہاتھ کی قیمت کو بڑھا دیا ہے لیکن مال پر تجاوز کرنے نے ہاتھ کی قیمت کو گھٹا دیا ہے پس تم خدا کی حکمت کے بارے میں غور کرو۔

مشہور ہے کہ سید مرتضیٰ کی بزم میں موجود ایک شخص نے اس طرح جواب دیا:

مناک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الباری

جہاں ہاتھ مظلوم ہے یعنی لوگوں کے حقوق کی طرف نہیں بڑھتا ہے وہاں اس کی قیمت ہے جہاں وہ چوری کرکے ظلم کرتا ہے وہاں وہ خدا کی بارگاہ میں بے قیمت ہے۔

اس سلسلہ میں تیسرے شخص نے کہا

لما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ھانت

جب تک ہاتھ امین تھا با قیمت تھا جب اس نے خیانت کی تو بے قیمت ہوگی

ایک شاعر نے اسی مفہوم کو شعر میں بیان کیا ہے:

خیانتھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ امینا

اس شعر کا مفہوم بھی یہ ہے کہ ہاتھ کی قیمت اس کے امین ہونے میں ہے اور اس کے خیانت کرنے سے اس کی کوئی قیمت نہیں رہتی ہے۔

شکم کا حق

تمہارے شکم کا حق یہ ہے کہ اسے قلیل و کثیر حرام کا ظرف نہ بناؤ بلکہ حلال میں سے بھی اسے اس کے اندازہ کے مطابق دو اسے تقویت کی حد سے نکال کر پر خوری اور بے مروتی کی حد تک نہ پہنچاؤ اور جب وہ بھوک و پیاس میں مبتلا ہو تو اسے قابو میں رکھو کیونکہ شکم پری سستی و کسالت کا باعث ہوتی ہے اور ہر نیک و مستحسن کام کی انجام دہی سے باز رکھتی ہے اور جو مشروب اپنے پینے والے کو مست کردے وہ اس کی سبکی، نادانی اور بے مروتی کا سبب ہوتا ہے۔

انسان غذا کا محتاج ہے

سارے انسان غذا (کھانے ) کے محتاج ہیں ؛ اگر انھیں کھنا و خوراک نہ ملے تو وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، بعض لوگوں کا گمان ہے کہ خدا کے بھیجے انبیاء کو غذا کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ قرآن ان کے اس خیال کی تردید کرتا ہے۔

وما جعلنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خالدین۔

اور ہم نیانبیاء کو ایسا جسد نہیں بنایا جو کھانا نہ کھائے اور وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے نہیں تھے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ پیغمبر کا انکار کرنے والوں کے اعتراض کو اس طرح نقل کیا ہے:

وقالو۔۔۔۔سواق

وہ کہتے ہیں : اس رسول کو کیا ہوگیا کہ یہ کھانا کھاتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے؟!

قرآن مجید میں انسان کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنے کھانے کے بارے میں غور کرے:

فلینظر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شقا۔

انسان کو اپنے کھانے کو دیکھنا چاہیے ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے اور زمین کے اندر سے دانہ ہم نے اگایا ہے۔

خارجی چیزوں میں انسان سے سب سے زیادہ نزدیک اس کی خوراک ہی ہے کہ وہ تھوڑی سی تبدیلی کے بعد انسان کے بدن کا جز بن جاتی ہے، اگر اسے خوراک نہ ملے تو عنقریب فنا ہوجائے گا یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام موجودات میں سے غذائی مواد کا سہارا لیا ہے وہ بھی اس مواد سے جو انسان کو نباتات اور درختوں سے حاصل ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ غذا ہے کیا؟ واضح ہے کہ دیکھنے سے ظاہری طور پر دیکھنا مراد نہیں ہے بلکہ انسان کو چاہیے کہ اس غذائی مواد کی ساخت و ترکیب اور اس کے حیات بخش اجزاء میں اور انسان کے بدن میں اس کے حیرت انگیز اثر کرنے ک یبارے میں غور کرنا مراد ہے۔

بعض افرادنے یہ کہا ہے کہ ظاہری نگاہ ہی مراد ہے کہ اس سے دہن کے غدوں سے لعاب مترشح ہوتا ہے اور نتیجہ میں کھانے کو ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے،لیکن یہ تفسیر کچھ بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس سے پہلی اور بعد والی آیتوں میں اس قسم کے مسائل نہیں بیان ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے : دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ دسترخوان پر بیٹھ کر یہغور کرے کہ یہ کھانا کس طریقہ سے فراہم ہوا ہے، شرعی طریقہ سے یا غیر شرعی طریقہ سے ؟! یہ اخلاقی اور تشریعی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔

ائمہ معصومین ؑ سے جو روایات نقل ہو کر آئی ہیں ان کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غذا سے مراد جان اور علم کی غذا ہے یعنی ان کی غذا کے بارے میں غور کرے کہ علم کس طریقہ سے سیکھا ہے؟

درج ذیل آیت کے سلسلہ میں امام محمد باقر ؑ نے فرمایا: انسان جس علم کو حاصل کرتا ہے اس کے بارے میں غور کرے کہ کس سے حاصل کررہا ہے؟ امام صادق ؑ نے بھی یہی معنی بیان کئے ہیں۔ بعدوالی آیتوں کے سیاق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ غذا سے مراد، ظاہری اور جسم کی غذا ہے کیونکہ اس میں بارش برسنے دانہ کے شگافتہ ہونے اور غذا کے فراہم ہونے کو بیان کیا گیا ہے لیکن جہاں انسان کو اپنے جسم کی غذا کے بارے میں غور کرنا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اس غذا کا سرچشمہ حیات بخش بارش ہے وہاں اسے اپنی روحانی غذا کے بارے میں بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ قلب رسول ؐ پر وحی کے ذریعہ نازل ہوتی ہے اور وہاں سے معصومین ؑ کے سینوں میں محفوظ ہوجاتی ہے اور پھر جوش مار کر ابلنے والے چشموں کی مانند دلوں کے صفحات پر جاری ہوتی ہے اور ایمان و تقوے کا لذت بخش پھل دیتی ہے۔

غذائی مواد کو تم نے پیدا کیا ہے یا خدا نے؟

قرآن مجید میں کھانے، پینے کی چیزوں اور ان کی اہمیت کے بارے میں کچھ آیات نازل ہوئی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں :

افرایتم۔۔۔۔۔۔۔ تفکھون۔

کیا تم نے اس چیز کے بارے میں غو ر کیا ہے جو تم بوتے ہو؟ کیا تم نے اس کو اگایا ہے یا اس کے اگانے والے ہم ہیں ؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھوسے کی مانند بنا دیں او ر تم حیرت زدہ رہ جاؤ۔

پہلی آیت میں لفظ ’’ تحرثون ‘‘ جو کہ حرث سے مشتق اور درس کے وزن پر ہے کے منی کھیتی بونے کے ہیں اور دوسری آیت میں لفظ ’’ تزرعونہ ‘‘جو کہ زراعت سے مشتق ہے کے معنی اگانے کے ہیں۔

واضح ہے کہ انسان کا کام بو دینا ہے اور اگانا صرف خدا کا کام ہے ایک حدیث میں رسول ؐ سے منقول ہے:

تم میں سے کوئی یہ ہرگز نہ کہے کہ میں نے زراعت کی ہے بلکہ یہ کہے کہ میں نے کھیتی بوئی ہے کیونکہ زارع حقیقی خدا ہے۔

ان آیتوں میں انسان کی توجہ خدا کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ وہی ساری مخلوق کا خالق ہے اور وہی ان کے رزق کا پیدا کرنے والا ہے جب وہ رزق کو نہ اگائے یا اس کو تباہ کردے، تو اس کو حطام کہتے ہیں۔ حطام ’’ حطم ‘‘ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں غالباً خشک چیز جیسے بھوسہ پر یا سوکھی نباتات کے تنے کو توڑنے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یہاں حطام سے مراد بھوسہ ہے۔

’’ تفکھون‘‘ فاکھہ سے مشتق ہے جس کے معنی پھل او ر میوے کے ہیں پھر اس کا اطلاق لطیفہ گوئی اور ہنسی، مذاق پر ہونے لگا لیکن یہی کبھی کبھی تعجب و حیرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مذکورہ آیت میں بھی انھیں معنی میں استعمال ہوا ہے۔

افرایتم۔۔۔۔۔۔۔۔۔تشکرون۔

جو پانی تم پیتے ہو کیا کبھی تم نے اس کے باے میں غور کیا ہے؟ کیا اسے تم بادل سے نازل کرتے ہو یا اس کے نازل کرنے والے ہم ہیں ؟ اگر ہم چاہیں تو اس نتھرے پانی کو تلخ بنا دیں تو پھر تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟

ان آیتوں میں خداوند عالم انسان کے ضمیر سے فیصلہ طلب کررہا ہے یا ان کے ضمیر کو بیدار کررہا ہے تاکہ وہ اپنے کھانے، پینے کی چیزوں کے بارے میں غور کرکے خدا کی عظمت کو سمجھیں۔

انسان کی روح پر غذا کا اثر

غذا کے اچھے، برے اثرات صرف بدن ہی پر مترتب نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کے اچھے برے اثرات روح بشر پر بھی مترتب ہوتے ہیں، اس بات کو ساری دنیا کے دانشور تسلیم کرتے ہیں، ترقی یافتہ دنیا کی لیباریٹری اور تجزیہ کرنے والی مشین ایک حد تک غذا کے طبیعی عناصر کا پتہ لگا سکتی ہیں لیکان ان غذاؤں کے معنوی آثار کا سراغ نہیں لگاسکتیں یا بنیادی طور پر وہ ہمیشہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں یا کم از کم یہ چیز ان آثار کا آج تک سراغ لگانے میں ناکام رہی ہیں۔

اس سلسلہ میں امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

بیشک اللہ تبارک و تعالیٰ نے کسی کھانے، پینے کی چیز کو حلال نہیں کیا مگر اس فائدہ کے سبب حلال کیا ہے جو اس چیز میں موجود ہے اور خدا نے کسی چیز کو حرام نہیں کیا مگر اس ضرر کے باعث جو اس میں موجود ہے۔

اولیاء اسلام کی حقیقت بیں نظر کھانے، پینے کی چیزوں کے جسمانی فوائد و نقصانات کو دیکھتی تھیں چنانچہ انھوں نے بعض موقعوں پر ان کے جسمانی اور معنوی نقصانات کی تصریح کی ہے۔

خون پینے سے سنگدلی پیدا ہوتی ہے:

اما م صادق ؑ نے بدن کی خرابیاں، بیان کرنے کے بعد خون کے حرام ہونے کی علت بیان فرمائی ہے :خون پینا انسان کو بداخلاق بنا دیتا ہے، دل کو پتھر کردیتا ہے، محبت و مہربانی کو اتنا کم کردیتا ہے کہ خون پینے والا ایسا خونخوار ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے اور باپ کو بھی قتل کرڈالتا ہے۔

شراب خوری کے اثرات:

امام صادق ؑ شراب کے حرام ہونے کی علت بیان فرماتے ہیں :

مستقل طور پر شراب پینے والا بت پرست کی مانند ہے، شراب خور رعشہ میں مبتلا ہوتا ہے، اس کی مروت ختم ہوجاتی ہے شراب نوشی اسے مجرموں کو قتل کرنے اور زنا پر جسور کردیتی ہے۔

مے نوشی اور خون پینے کے جو برے اثرات بدن پر مترتب ہوت یہیں ان کا تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن لیباریٹری میں دل کی قساوت کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا۔

الکحل کے دماغ اور بدن کے دوسے اعضاء پر اثرات:

۱۔ الکحل و اسپرٹ کا اثر یہ ہے کہ وہ دماغ کے خلیوں کو بیکار کردیتا ہے، اکثر دماغ کی رگ پھٹنے یا دماغ میں خون جمنے کا باعث ہوتا ہے اور خون کے دوران کو روکتا ہے اور بلڈ پریشر کا سبب ہوتا ہے یہ بدن کے اعضاء کے مفلوج ہونے کا باعث ہوتا ہے۔

۲۔ الکحل، اسپرٹ، مختلف امراض کے پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے جیسے ہاتھوں، پیروں میں رعشہ پڑنا اور ہاتھ و پاؤں پر قابو نہ رہنا، ظاہری اور باطنی حواس میں کمزوری آنا اور نتیجہ میں بے خوابی میں مبتلا ہونا۔

۳۔ الکحل حس ذائقہ کو ضائع، دہن کے لعاب کو کم اور اس کے ترشح کے نظم کو درہم برہم کرتا ہے، معدہ میں خلل پیدا کرتا ہے اور اس کی کھٹائی کو کم کرتا ہے اور پیپسین کے انعقاد کے ساتھ اکثر قے ہونے کا باعث ہوتا ہے کہ جس میں خون کا لوتھڑا بھی ہوتا ہے، نیزمعدے اور اس کے بعد نالی میں مختلف قسم کے امراض پیدا کرتا ہے اور معدے کو حد سے زیادہ چوڑا کردیتا ہے، نظام ہاضمہ میں حدت پیدا کرتا ہے شدید طور پر دست آنے کا باعث ہوتا ہے۔

۴۔ کلیجی کو کمزور کرتا اور اس پر ورم لاتا ہے اور جگر کی خرابی کا آغاز پیٹ کی طرف درد ہونے کے احساس سے ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ گردوں، یہاں تک کہ آنکھوں میں پیلئے کا مرض پیدا ہوجائے۔

۵۔ الکحل چونکہ بدن کے سسٹم کے استعمال کے لئے نہیں ہے محض اس کے معدے میں وارد ہونے سے خون ہوجاتا ہے اور یہ خون کے اندر کے سفید گلبول کو مار ڈالتا ہے اور بلڈ پریشر کم ہونے کے سبب سکتہ پڑتا ہے۔

الکحل و اسپرٹ کے خطرناک عوارض میں سے سانس لینے کے نظام میں تنگئی تنفس ایسی خانماں سوز بیماری کا پیدا ہونا بھی ہے کیونکہ جب الکحل خون کے ساتھ گروہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ گردے کے مخاط میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس پر ورم لاتا ہے۔ اس تحریک سے بدن کی کیلشیم برباد ہوتی ہے اور گردے کے کام کو مختل کرتی ہے جس سے سل کا مرض پیدا ہوتا ہے۔

الکحل جنون کا سبب:

جن مشروبات میں الکحل و اسپرٹ ہوتی ہے وہ دیوانگی و جنون کا باعث ہیں اسپتالوں کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاگل ہونے والوں میں زیادہ تر وہ افراد ہیں جنھوں نے ایک عمر تک شراب پی ہے۔ بلا ہائے اجتماعی نامی کتاب میں ’’ تندرست‘‘ نامی مجلہ سے نقل کیا گیاہے : فرانس میں ڈاکٹروں کی تحقیقات کے مطابق دو لاکھ پاگل وہ ہیں جو الکحل کے مشروبات کی وجہ سے پاگل ہوئے ہیں اور برطانیہ میں دانشوروں کی تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پاگلوں میں نوے فیصد پاگل وہ ہیں جو الکحل سے بنی ہوئی مشروبات پیتے تھے۔

الکحل کے اثرات نسلوں میں :

مذکورہ کتاب میں صاحب کتاب تحریر کرتے ہیں : الکحل سے نطفہ کے خلیوں پر برا اثر پڑتا ہے، چنانچہ جرمن کے ایک ڈاکٹر نے یہ ثابت کیا ہے کہ الکحل ک یاثرات تین نسلوں تک باقی رہتے ہیں بشرطیکہ تین نسلوں نے الکحل نہ پی ہو۔

انھیں خانما نسوز نقصانات کے پیش نظر اسلام نے الکحل پینے کی اجازت نہیں دی ہے اور اس کو حرام قرار دیا ہے۔ حضرت امام زین العابدین ؑ نے فرمایا: اپنے شکم کو ان چیزوں سے محفوظ رکھو جن کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، رسول ؐ فرماتے ہیں : ملعون۔۔۔۔۔۔ الخمر۔

وہ شخص خدا کی رحمت سے دور ہے جو اس دسترخوان پر بیٹھتا ہے جس پر شراب پی جاتی ہے۔

آیت اللہ دستغیب نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب تنقیح سے نقل کیا ہے: امریکہ نے منشیات کے استعمال کے خلاف تبلیغ میں ہر قسم کے حربہ و اسلحہ، مثلاًمجلات، جرائد، تقاریر، فلم اور سیمینا ر کا سہارا لیا ہے اور اٹھ سو ملیون ڈالر سے زیادہ خرچ کئے ہیں اور اس مقصد کے تحت دسیوں ملیون صفحات کتابوں اور مجلوں میں صرف کئے ہیں جب کہ چودہ سال کے عرصہ میں اور منشیات کے ممانعت والے قانون کو نافذکرنے کے سلسلہ میں دو سو پچاس ملیون لیرہ سے زیادہ خرچ کئے ہیں اور ۳۳۵ افراد کو قید کیا ہے اور تقریباً ۱۶ ملیون لیرہ منشیات کے جرمانے کی بابت وصول کیا ہے اور ۴۵۵ ملیون لیرہ کی مالیت کی املاک کو ضبط کیا ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اس کے برخلاف لوگوں کی منشیات سے اتنی شیفتگی بڑھ گئی ہے کہ ۱۹۳۲ئ؁ میں یہ سارے قانون توڑ کر منشیات سے کلی طور پر پابندی ہٹا دی۔

لیکن دین اسلام نے باوجود یکہ زمانۂ جاہلیت میں شراب پانی کی طرح پی جاتی تھی، مختصر مدت میں اس کو حرام قرار دیا اور اسلامی معاشرہ کو اس کے نقصان اور شر سے بچا لیا الکحل کے جو اثرات بدن پر ہوتے ہیں وہ سائنس دانوں پرپوشیدہ نہیں رہے، جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، لیکن مروت اور اخلاقی اقدار کو لیباریٹریوں میں نہیں دیکھا جاسکتا کہ الکحل کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔

بعض افراد اپنے کھانے، پینے کی چیزوں کی صفائی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اگر غذا کے آلودہ ہونے کا معمولی احتمال ہوتا ہے تو وہ اس غذا کو کھانے سے پرہیز کرتے ہیں لیکن وہ اپنی روح کی صحت و سلامتی سے اتنے بے پروا ہیں کہ ہر گندی بات کو سنتے ہیں اس کے بارے میں حضر ت امیر المومنین ؑ فرماتے ہیں :

مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے کہ جو کھانا کھاتے وقت چراغ روشن کرلیتے ہیں تاکہ یہ دیکھ لیں کہ کیا کھا رہے ہیں لیکن وہ اپنی روح کی غذ ا کو اہمیت نہیں دیتے کہ اپنی عقل و خرد کے چراغ کو روشن کرتے اور اس طرح اپنے عقیدہ و اعمال میں نادانی و خطاء سے محفوظ رہتے۔

امام حسن ل فرماتے ہیں :

مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو کہ اپنے کھانے کی چیزوں کے بارے میں تو سوچتا ہے لیکن روح کی غذا کے بارے میں غور نہیں کرتا وہ اپنے پیٹ کو تو اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے جو اس کے لئے مضر ہے مگر اپنے سینہ کو اس چیز سے محفوظ نہیں رکھتا جو اسے پست کرتی ہے۔

اسلام کے دستورات میں ایک طویل بحث کھانے، پینے اور صحیح غذا حاصل کرنے کے بارے میں لوگوں کی راہنمائی سے مربوط روایات ہیں، مفید ومضر گوشت اور اس کی مقدار اسی طرح چربی، مٹھائی سبزی وغیرہ کے بارے میں بھی روایات آئی ہیں، ایک روز سوید بن غفلہ دوپہر کے کھانے کے وقت حضرت علی ؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے دیکھا کہ آپ دسترخوان پر تشریف فرما ہیں اور سوکھی روٹی تناول فرما رہے ہیں جس پر جو کا دانہ دانہ آشکار ہے راوی کہتا ہے۔ میں آپ کی خدمت گزاروں کے پاس گیااور ان سے کہا : تم لوگ آقا کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟ جو کا پسا ہوا آٹا کیوں نہیں لاتے ؟ فضہ نے کہا: آقا کا حکم ایسا ہی ہے وہ لوٹ کر امام کی خدمت میں آئے اس کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا: یہ طریقہ میں نے رسول ؐ سے سنا ہے۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : حضرت سلیمان جوکا چوکر نہیں نکالتے تھے۔

احمد بن ہارون حضرت علی بن موسیٰ رضا ؑ کی خدمت میں پہنچے آپ نے کھانا لانے کا حکم دیا دسترخوان بچھایا گیا اس پر کھانا لگایا گیا لیکن دسترخوان پر تازہ سبزی نہیں تھی، آپ نے کھانا شروع نہیں کیا، خادم سے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ میں اس دسترخوان پر کھانا نہیں کھاتا جس پر تازہ سبزی نہ ہو؟ جاؤ سبزی لاؤ خادم سبزی لایا تو آپ نے کھانا نوش فرمایا:

معدے کی صحت کا اہم دستور

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

کھاؤ پیو لیکن فضول خرچ نہ کرو بیشک خدا فضول خرچ کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

یہ بات اب ثابت ہوئی ہے کہ یہ بھی حفظان صحت کا ایک اہم دستور ہے، کیونکہ دانشور افراد اپنی تحقیق میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بہت سی بیماریوں کی جڑ اضافی غذائیں ہوتی ہیں کہ وہ انسان کے بدن میں جذب نہیں ہوتی ہیں ایسی ہی باقی رہتی ہیں اور دل کے لئے بھاری بوجھ ہوتی ہیں اور بہت سی بیماریوں اور عفونتوں کا سبب بنتی ہیں بنا برایں معدے کی صحت کے لئے اولین قدم یہ ہے کہ موٹے افراد اپنا اضافی وزن گھٹائیں اس اضافی وزن کا اصلی سبب پر خوری ہے اس کی تلافی کھانے میں میانہ روی سے کرنا چاہیے۔

ہارون رشید کے دربار میں عیسائی حکیم کا اظہار

عظیم مفسر شیخ طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ ہارون رشید کے دربار میں ایک طبیب تھا طب میں اس کی مہارت مشہور تھی ایک دن اس نے مسلمان عالم سے کہا: مجھے تمہاری آسمانی کتاب میں طب کے بارے میں کوئی چیز نہیں ملی حالانکہ مفید علم، علم ادیان اور علم ابدان ہی ہے۔ مسلمان عالم نے جواب دیا: خداوند عالم نے طب کے سارے قوانین کو نصف آیت میں بیان کردیا ہے۔ ’’ کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو‘‘ اور رسول ؐ نے طب کے بارے میں یہ فرمایا: معدہ تمام بیماریوں کی جڑ ہے اور احتیاط کرنا ہر مرض کی دوا ہے اور بدن کو تم نے جس چیز کا عادی بنا دیا ہے وہ اسے دیتے رہو۔

اس عیسائی طبیب نے کہا: تمہاری آسمانی کتاب اور تمہارے رسول ؐ نے جالینوس کے طب کی کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے۔

حفظان صحت کے دوسرے دستورات

پرخوری اور کم خوری دونوں ہی مذموم ہیں حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : کم کھانا بدن کی بہت سی بیماریوں کو ختم کرتا ہے۔ البتہ اتنا کم بھی نہ ہو بدن میں سستی و کمزوری آجائے امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : حضرت امیر المومنین ؑ سے منقول ہے : زیادہ کھانا اور زیادہ سونا دونوں نفس کو تباہ کرتے ہیں ضررونقصان کو بدن کی طرف کھینچتے ہیں۔

حضرت موسیٰ بن جعفر ؑ اس طرح فرماتے ہیں : پرہیز و احتیاط سب سے بڑی دوا ہے اور معدہ بیماریوں کا گھر ہے۔

شکم سیری سے پرہیز کرنا چاہیے:

رسول ؐ فرماتے ہیں : بھرے ہوئے پیٹ پر کھانا کھانا برص کے ظاہر ہونے کا سبب ہوتا ہے۔

آپؐ ہی کا ارشاد ہے: لا تمیتو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔علیہ الماء۔

زیادہ کھانے اور زیادہ پینے سے دل کو مردہ نہ بناؤ کیونکہ دل اسی طرح مر جاتا ہے جس طرح زیادہ پانی سے کھیتی مر جاتی ہے۔

حرام کھانے سے اجتناب کرو:

رسول ؐ نے فرمایا: جو آدمی ایک لقمۂ حرام کھاتا ہے چالیس شب تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی اور چالیس دن تک دعا مستجاب نہیں ہوتی ہے اور اس سے جو گوشت پیدا ہوتا ہے وہ آگ میں جلنے کے لائق ہے۔

نیز فرمایا: جس وقت کسی شخص کے پیٹ میں لقمۂ حرام جاتا ہے تو اس پر زمین وآسمان کے فرشتے لعنت کرتے ہیں اور جب تک اس کے شکم میں لقمۂ حرام رہتا ہے خدا اس کی طرف نہیں دیکھتا ہے، جو حرام کا ایک لقمہ کھاتا ہے وہ خدا کے غضب میں مبتلا ہوگا پھر اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو خدا بخش دیتا ہے ورنہ وہ جہنم کا مستحق ہے۔

اس کے برخلاف حلال کھانے کے بارے میں فرماتے ہیں :

جو شخص چلیس دن تک حلال کھانا کھانے پر مداومت کرے خدا اس کے دل کو منور کردیتا ہے اور علم وحکمت کے چشمہ کو اس کے دل سے زبان پر جاری کردیتا ہے۔

صحت و سلامتی کا راز:

رسول ؐ فرماتے ہیں :جو شخص کھانا کھانے میں پاکیزگی و صفائی کا خیال رکھتا ہے اور اچھی طرح چبا کر کھاتا ہے اور اس وقت کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا ہ یجب کچھ بھوک باقی رہتی ہے او جب پاخانہ لگتا ہے تو اسے نہیں روکتا ہے تو وہ مرض موت کے علاوہ کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوگا۔

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : پیٹ کے حق میں ہمیں افراط و تفریط سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ خوراک کے سلسلہ میں ہمیں اعتدال و احتیاط سے کام لینا چاہیے، ہم یہاں پرخوری کے نقصانات اور شکم کے حق کی رعایت نہ کرنے کے مضر اثرات کو سپرد قلم کرتے ہیں۔

بھوک انسان کی خطرناک حالت ہے بھوکا انسان گویا دین و ایمان کو بھول جاتا ہے اور محبت و مہربانی کو فراموش کردیتا ہے اور پیٹ بھرنے کے لئے وہ غضبناک درندے جیسا بن جاتا ہے۔ تیسری صدی ہجری میں بصرہ میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ چند سال تک صاحب زنج نے بصرہ پر اپنے چند سالہ تسلط ے دوران کشت وکشتا رکا بازار گرم رکھا۔ ہزاروں مردوعورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جو باقی بچ گئے تھے وہ خوف کے ماے چھپے رہتے تھے اور رات میں غذا حاصل کرنے کے لئے خوف زدہ اور لرزتے کانپتے باہر نکلتے تھے کاروبار بالکل ٹھپ ہوگئے تھے، کھیتی باڑی اور گلہ بانی کا کام چوپٹ ہوگیا تھا پورے علاقہ پر قحط سالی اور بھوک مری طاری تھی ایک مدت تک لوگ کتے بلی کا گوشت کھاتے رہے، اس کے بعد اپنے مردوں کا گوشت کھانے لگے کبھی تو اپنے نیم جان آدمی ہی کو کھا جاتے تھے۔

تاریخ میں ہے کہ اس زمانہ میں ایک عورت دیکھی گئی جو ایک سر ہاتھ میں لے کر رورہی تھی لوگوں نے اس سے رونے کا سبب معلوم کیا تو اس نے جواب دیا بھوکے لوگ میری کمزوروناتواں بہن کے پاس جمع ہوگئے کہ وہ مرجائے تو اس کا گوشت کھائیں ابھی وہ مری نہیں تھی کہ انھوں نے اس کی تکا بوٹی نوچ لی اور اس کا گوشت بانٹ لیا، لیکن انھوں نے میرے اوپر یہ ظلم کیا ہے کہ اس کا سارا گوشت انھوں نے آپس میں بانٹ لیا اور مجھے صرف اس کا سر دیا ہے گوشت میں سے مجھے کچھ بھی نہیں دیا۔

بھوک کی وجہ سے بہن نے اس طرح مہرومحبت کو فراموش کردیا ہے کہ اسے اپنی بہن کے مرنے کی فکر نہیں ہے بلکہ وہ اس بات پر روتی ہے کہ اس کی بہن کا گوشت اسے کیوں نہیں دیا گیا۔

شکم کا فقہی حکم

فقہاء نے اس شخص کے بارے میں کہ جو کسی کے شکم پر اس طرح ضرب لگائے کہ وہ پیشاب و پائخانہ نہ روک سکے تو اسے ایک تہائی دیت دینا پڑے گی درج ذیل عبارت کو ہم تکملۃ المنہاج سے نقل کرتے ہیں :

من راس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فی ثیابہ

جو شخص کسی آدمی کے شکم پر اس طرح ضرب لگائے کہ وہ اپنا پائخانہ نہ روک سکے تو اسے ایک تہائی دیت ادا کرنا پڑے گی ای اس کے شکم پر اس طرح ضرب لگائے ہ جس سے اس کا لباس آلودہ ہوجائے۔

پھر فرماتے ہیں : یہی اکثر علماء کا نظریہ ہے اور سکونی کے واسطہ سے جو روایت وارد ہوئی ہے وہی اس پر دلالت کرتی ہے۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : جو شخص کسی کے شکم پر اس طرح ضرب لگائے کہ وہ اپنا لبا س آلودہ کرلے۔ اس کا حکم حضرت علی ؑ سے دریافت کیا تو حضرت علی ؑ فرمایا: اس کے شکم کو فاسد کردے تو اسے ایک ثلث دیت دینا ہوگی۔

شرم گاہ کا حق

تمہارے اوپر تمہاری شرم گاہ کا حق یہ ہے کہ اسے اس چیز سے محفوظ رھو جو تمہارے لئے حلال نہیں ہے اور اس سللہ میں تم آنکھ بند کرنے سے مدد حاصل کرو کہ یہ بہترین مددگار ہے دوسرے موت کو یاد کرنے اور اپنے نفس کو خوف خدا سے ڈرانے سے مدد حاصل کرو اور اس سلسلہ میں عصمت و تحفظ اور تائید خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کی طاقت و قوت کے علاوہ کوئی طاقت و قوت نہیں ہے۔

’’فرج‘‘ کہ جس کی جمع فروج ہے اس کے معنی ہیں دو چیزوں کے درمیان خلل و رخنہ،سوراخ، شگاف وغیرہ۔ فرج پیشاب اور پائخانہ کے مقام کو کہتے ہیں، راغب لکھتے ہیں : فرج دونوں پیروں کے درمیان ہے اور کنایتاً اس کا اطلاق پیشاب، پائخانہ کے مقام پر ہوتا ہے اور کثرت استعمال کی بنا پر اب انھیں معنی میں صریح کی مانند ہوگیا ہے۔ مجمع البیان میں سورۂ مومنون کی آیت ۵ کے ذیل میں لیث کے قول کے بارے میں لکھا ہے:

فرج ہر کزد و عورت کی شرمگاہ کا نام ہے اقرب الموارد میں اس طرح لکھا ہے:

الفرج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والدبر۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فرج کے معنی شگاف اور دو چیزوں کے درمیان کے فاصلہ کے ہیں اور ایسے موقعوں پر شرم گاہ کے معنی میں کنایتاً استعمال ہوتا ہے ہم نے اس کے کنائی معنی کو محفوظ رکھتے ہوئے فارسی میں اس کے معنی دامن رکھے ہیں۔

فرج کی حفاظت سے مراد، جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے اسے دوسروں کی نگاہوں سے چھپانا ہے، امام صادق ؑ کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: قآن مجید کی جس آیت میں بھی حفظ فروج، شرم گاہوں کی حفاظت کا ذکر ہے وہاں حفظ سے مراد اسے زنا سے محفوظ رکھنا ہے مگر اس آیت میں حفظ سے مراد اسے دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا ہے۔

یہ حدیث سورۂ نور کی ۳۱ ویں آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہے۔ آیت یہ ہے : قل۔۔۔۔۔۔فروجھن۔

جنسی میلان و رغبت:

جنسی میلان انسان کی زندگی میں لذت و کامیابی کا سبب ہے یہ اپنی جاذبیت و کشش کی طاقت سے مرد و عورت کے اندر شدید ہیجان پیدا کرتا ہے چنانچہ وہ عشق و محبت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے بیاہ شادی کا مسئلہ ہر زمانہ میں دینی و علمی محفلوں میں موضوع بحث رہا ہے۔ اور اس کے بارے میں افراطی و تفریطی اور درمیانی نظریات سامنے آئے ہیں۔

شدت پسند نظریہ:

جو لوگ جنسی آزادی کے قائل ہیں ان میں متاخرین میں سے فرائڈ اور اس کے پیرو ہیں یہ لوگ جنسی میلان کے بارے میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ فرائڈ نے جنسی میلان کے ابھرنے پر اپنی تقریروں میں بہت زور دیا ہے اور جنسی مسئلہ، جو کہ اس کے نظریہ و مکتب کا بنیادی ستون ہے، کے معنی کی اس نے بہت وسیع تفسیر کی ہے اور نتیجہ میں اس نے انسان کے بہت سے فطریات اور اس کے مستقل میلانات کو جنسی میلان ہی سے مشتق جانا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس نے اس میلان کو انسانی تہذیب و تمدن کی بنیاد قرار دیا ہے۔

فرائڈ کے نقطۂ نظر سے جنسیت سے جو لذت طلبی ابھرتی ہے وہ بالغ افراد ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ لذت طلبی زندگی کے ہر دور میں انسان کے اندر موجود ہوتی ہے چنانچہ چھوٹے بچے اسی محرک کی بنا پر ماں کا پستان چوستے ہیں اور اس سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ فرائڈ کے نقطۂ نظر سے کچلے ہوئے میلانات و خواہشات ہی تحلیل روحی اور روحانی بیماریوں کے معالجہ کی بنیاد ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جب جنسی میلانات معاشرہ کی بندشوں کی یا دوسرے اسباب کی بنا پر کچل دیئے جاتے ہیں یا انھیں دبایا جاتا ہے تو وہ ضمیر کے اندر خلجان اور ایک قسم کا دباؤ پیدا کرتے ہیں اور انسان کو روحی بیماری میں مبتلا کردیتے ہیں۔

فرائڈ کے نقطۂ نگاہ سے جتنی بھی کجرویاں ہوتی ہیں اور روحانی توازن کا جو فقدان ہوتا ہے اس کا آغاز جنسی میلان ہی سے ہوتا ہے اور معالج و ڈاکٹر کو ان کیفیتوں سے آگاہ ہونا چاہیے جو مریض پر گذشتہ ادوار میں طاری ہوئی ہیں۔

فرائڈ کے مخالف ڈاکٹری نقطۂ نظر سے کہتے ہیں :فرائڈ نے شہوانی میلان کے خلل ہی کو روحی انحرافات کا سر چشمہ کیوں قرار دیا ہے اور اس کا علاج اسی سے کیوں شروع کیا ہے؟! فرائڈ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے روحی اور عصبی خرابیوں کا سبب اس جنسی میلان کی تبدیلیوں کو قرار دیا ہے جو غیرمعمولی ہیں اور اس نے ہر شخص کے مادی، مالی اور سماجی ماحول کے عوامل کو نہیں دیکھا ہے جو کاری گر، بیکاری اور کام نے ملنے کی وجہ سے بیوی بچوں کے اخراجات کی فکر میں نفسیاتی طور پر مریض ہوجاتا ہے تو اس کی روح کے مرض کاسرچشمہ جنسی میلان نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور اس عارضہ کو برطرف کرنے ک یلئیکام، تگ ودواور پیسہ کی ضرورت ہے اس کا علاج جنسی پیاس بجھانے سے نہیں ہوگا۔

کلیسا اور جنسی روابط:

پیروان کلیسا، کچھ دوسرے مذاہب اور بعض فلاسفر اور کچھ ماہرین اخلاق نے جنسی میلاپ و آمیزش کو ایک حیوانی حرکت جانا ہے اور اسے منفورو پلید قرار دیا ہے۔ یہ جنسی میلان کے بارے میں تفریط کے شکار ہیں، انھوں نے اس میلان کو کچل دیا ہے، ’’ سن ژرم ‘‘ جو کہ اولیاء کے سلسلہ کی آخری کڑی تھاوہ ہمیشہ زور دے کر یہ بات کہتا تھا : ہمیں چاہیے کہ بیاہ شادی کے درخت کو تجرد کی کلہاڑی سے کاٹ ڈالیں۔

کلیسا کے طریقہ کار کا ہم دیکھتے ہیں کہ ’’ پولس ‘‘ جو کہ کلیسا کے روحانی پیشواؤں اور اس کے اولیاء میں سے ایک تھا، اس نے زندگی بھر شادی نہیں کی اور کسی عورت کو اپنا شریک حیات نہیں بنایا بلکہ مردوں اور عورتوں کو یہ تشویق کرتا رہا کہ وہ شادی نہ کریں، پولس کے پہلے رسالہ میں قرنتیوں سے خطاب میں لکھا ہے: لیکن جس چیز کے بارے میں تم نے مجھے لکھا تھا تو مرد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ عورت کو نہ چھوئے ہاں زنا سے بچنے کے لئے ہر مرد کو عورت رکھنا چاہیے اور ہر عورت کو شوہر دار ہونا چاہیے، شوہر کو بیوی اور بیوی کو شوہر کا حق ادا کرنا چاہیے۔۔۔۔ آگے چل کر لکھتے ہیں : میری یہ آرزو ہے کہ وہ مجھ جیسے ہوتے، مگر ہر شخص خدا کی خاص عطا کا حامل ہے ایک ایسا ہ یتو دوسرا ایسا ہے۔ لہٰذا غیر شادی شدہ اور بیوہ عورتوں سے میری گزارش ہے کہ ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ میری طرح رہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکیں تو انھیں نکاح کرلینا چاہیے کیونکہ نکاح کرنا جہنم میں جلنے سے بہتر ہے۔

اسلام کا طریقہ، معتدل نظریہ:

اسلام افراط و تفریط کے طریقوں کی مذمت کرتا ہے چنانچہ حضت امیر المومنین ؑ جہالت و نادانی کو افراط و تفریط کا سر چشمہ قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں :

لا یری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مفرطا۔

جاہل ہمیشہ افراط یا تفریط کرتے ہی دیکھا جاتا ہے۔

جنسی میلان کے سلسلہ میں میانہ روی ایک ایسا طریقہ ہ یجو خدا کی رضا کے مطابق اور آفرینش کے طریقہ کے موافق ہے۔ اس طریقہ میں نہ جنسی و شہوانی خواہش کو بے لگام چھوڑا گیا ہے اور نہاس کو یکسر کچلا گیا ہے، بلکہ یہ فطری میلان و خواہش صحیح اندازہ کے ساتھ قانون و اخلاق کا حامل ہے اور فرد و سماج کی مصلحت کی حدود میں اس کو پورا کرنے کے اسباب فراہم ہوتے ہیں اور یہ خدا کے پیغمبروں کا طریقہ ہے کہ وہ ایک طرف تو حکم خدا سے لوگوں کو شادی و نکاح کرنے کی تشویق کرتے ہیں اور دوسری طرف جنسی کجرویوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور انسانی معاشرہ کو اس سے بچاتے ہیں۔

اسلام اور شادی

خداوند عالم سورۂ مومنون میں باایمان لوگوں کی ایک نمایاں صفت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

والذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ھم العادون۔

اور جو لوگ اپنی شرم گاہوں کی (بے عفتی سے ) حفاظت کرتے ہیں صرف اپنی بیویوں اور کنیزوں ہی سے جنسی لذت حاصل کرتے ہیں کیوں کہ ان سے لذت اندوز ہونے میں ملامت نہیں کی جاسکتی پس جو اس سے ہٹ کر دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہی حد سے گزر جانے والا ہے۔

چونکہ شہوت انسان کی ایک منھ زور قوت ہے اس لے اسلام اپنے ماننے والوں کا یہ حکم دیتا ہے کہ تم اپنی بیویوں اور ان کنیزوں ہی سے جنسی لذت حاصل کرو جو تمہارے اختیار میں ہیں۔ یہ تعبیردائمی اور غیر دامئی دونوں بیویوں کو شامل ہے، ممکن ہے : غیر ملومین سے اس غلط طرز فکر کی طرف اشارہ ہو کہ جس سے عیسائیت میں کجروی پیدا ہوئی ہے وہ ہر قسم کی جنسی آمیزش اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں یہاں تک کیتھولک کا پاپ اسی طرح تارک دنیا مردوعورت تمام عمر تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر قسم کی شادی کو روحانیت کے خلاف سمجھتے ہیں، جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کرچکے ہیں۔

رسول نے اسلام کے دستورات میں جنسی آمیزش پر خاص توجہ فرمائی ہے اور اپنے پیروؤں کو تجرد اور غیر شادی شدہ رہنے سے ڈرایا ہے۔

قال رسول اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔النکاح

رسول ؐ نے فرمایا:جو شخص میری فطرت کو پسند کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ میری سنت کی پیروی کرے اور میری سنت میں سے نکاح بھی ہے۔

شادی گناہ سے حفاظت:

رسول ؐ فرماتے ہیں : اے جوانو! تم میں سے جس کے اندر شادی کی استطاعت ہے اسے چاہیے کہ شادی کرے کہ یہ خیانت آمیز نگاہوں اور شرم گاہ کو بے عفتی سے بچانے کا بہترین ذریعہ ہے اور جو شخص شادی نہ کرسکے اسے ہمیشہ روزہ رکھنا چاہیے کہ یہ شہوت کی منھ زوریوں کو روکنے میں اہم اثر رکھتا ہے۔

شادی زندگی کی مضبوط بنیاد:

اسلام نے اپنے پیروؤں کو خاندان سازی کی تشویق کی ہے اور اس کو خدا کے نزدیک بہترین بنیاد قرار دیا ہے رسول ؐ کا ارشاد ہے:

مابنی۔۔۔۔۔۔۔۔ التزویج۔

اسلام میں رکھی جانے والی بنیاد میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ بنیاد شادی کرنا ہے۔

اس لحاظ سے ایسی بنیاد بنانے میں عجلت ہونا چاہیے حضرت امام صادق ؑ سے منقول ہے کہ ایکروز رسول ؐ منبر پر تشریف لے گئے اور خدا کی حمدوثناء کے بعد فرمایا:

اے لوگو!لطیف و خبیر خدا کی طرف سے میرے پاس جبریل آئے اور کہا: باکرہ لڑکیاں درخت پر لگے ہوئے پھل کی مانند ہیں اگرپھل کو بروقت نہ چنا جائے تو اسے سورج کی دھوپ خراب کردے گی اور ہوا چلنے سے وہ پراگندہ ہو جائے گا ایسے ہی وہ باکرہ لڑکیاں ہیں جو عورتوں کی مانند اپنے اندر تشنگی محسوس کرتی ہیں تو ان کی تشنگی کی کوئی دوا نہیں ہے سوائے شوہر کے اگر ان کی شادی نہ کی جائے تو وہ فساد سے محفوظ نہیں رہیں گی کیونکہ وہ بھی بشر ہیں اور بشر لغزش سے محفوظ و معصوم نہیں ہے۔

شادی برائیوں سے بچاتی ہے:

قرآن مجید نے شادی پر مردوعورت کی عفت کے لحاظ ے توجہ دی ہے ارشاد ہے: ھن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لھن۔ عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ بیشک لباس برائیوں کا پردہ ہے اور شرم گاہ کو چھپاتا ہے،لباس بہت سے ناسازگار حالات اور امراض سے بچاتا ہے سردی و گرمی سے محفوظ رکھتا ہے، شادی بھی انسان کے اندر طہارت و پاکیزگی کو وجود بخشتا ہے رسول ؐ فرماتے ہیں :

جو شخص خدا سے طاہرومطہر حالت میں ملاقات کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی عفت و پاک دامنی کو اپنی زوجہ کے ذریعہ محفوظ کرے۔

شادی نہ کرنے کی رسول ؐ نے مذمت فرمائی ہے:

اسلام نے مسلمانو ں کو گناہوں سے بچانے کے لئے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو شادی کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود کسی وجہ سے شادی نہیں کرتے ہیں۔

عکاف نام کا ایک شخص رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، رسولؐ نے اس سے دریافت فرمایا: تم شادی شدہ رہو؟ عرض کی : اے اللہ کے رسول ! نہیں۔ فرمایا: کیا تم بدن کی صحت اور مالی استطاعت نہیں رکھتے ؟ عرض کی : رکھتا ہوں آنحضرت نے اسے شادی کرنے کا حکم اور شادی نہ کرنے سے ڈرایا۔

فرمایا: اے عکاف وائے ہو تجھ پر شادی کرلو کہ اس وقت خطا کاروں میں سے ہو شادی کرلو ورنہ گناہگاروں میں شامل ہوجاؤ گے۔ شادی کرلو ورنہ تم نصاریٰ میں شمار ہوگے ورنہ تم شیطان کے بھائیوں میں شامل ہوگے۔

ایک عورت نے قربۃ الی اللہ شادی نہ کرنے کا قصد کرلیا تھا۔ امام نے اس کو اس عمل سے روکا امام رضا ؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک عورت نے امام باقر ؑسے دریافت کیا : میں متبتلہ ہوں،امام نے فرمایاتبتل سے تمہاری مراد کیا ہے؟: اس نے جواب دیا، میرا ارادہ ہے کہ ہرگز شادی نہ کروں، فرمایا: کس لئے ؟ اس نے کہا: فضیلت و کمال کے حصول کی خاطر۔ فرمایا: اس ارادہ کو چھوڑ دو اگر شادی نہ کرنے میں کوئی فضیلت ہوتی تو حضرت فاطمہ ؐ تم سے زیادہ اس فضیلت کو حاصل کرنے کی حقدار تھیں حالانکہ کوئی بھی فضیلت میں ان سے آگے نہیں ہے۔

ان دو حدیثوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اولیاء اسلام نے مردوعورت کو مجرد اور غیر شادی شدہ رہنے سے روکا ہے اور انھیں مختلف طریقوں سے شادی کرنے کی تشویق کی ہے کہ پاک و پاکیزہ رہیں اور گناہوں سے اپنے دامن کو آلودہ نہ کریں۔

اسلام اور عورتوں سے کنارہ کشی

رسول ؐ کے اصحاب میں سے چند آدمیوں نے اپنے نفس کے تزکیہ اور روح کی بلندی کے لئے عورتوں سے ملتا، روز ہ افطار کرنا اور رات کو سونا اپنیاوپر حرام کرلیا۔ ان کے اس ارادہ کی اطلاع ام سلمہ کو بھی ہوگئی انھوں نے رسول ؐ کوخبر کی:

فخرج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فلیس منی۔

رسول ؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا:کیا تم نے اپنی عورتوں سے کنارہ کشی کرلی ہے؟میں تمہارا رسول ہوں اس کے باوجود میں عورتوں کے پاس جاتا ہوں، دن میں کھانا کھاتا ہوں اور رات کو سوتا ہوں پھر تم میں سے جو بھی میری سنت و روش سے اعراض کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ روایت ان لوگوں پر شدید تنقید کرتی ہے جو کہ عورتوں کو چھوڑ کر روحانی بلندی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے اس طریقہ کو غلط قرار دیتی ہے۔

زنا بڑا گناہ ہے

جو لوگ شادی کرکے گھر آباد کرنے سے پرہیز کرتے ہیں ممکن ہے وہ زنا کے مرتکب ہوجائیں اور اس طرح گوناگوں مشکلات سے دوچار ہوں لہٰذا قرآن مجید اس راستہ کو بدترین راستہ قرار دیتا ہے اور لوگوں کو اس کے قریب جانے سے منع کرتا ہے سورۂ اسراء میں ارشاد ہے:

ولا تقربوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سبیلا۔

اور زنا کے قریب نہ جاؤ کہ یہ بدترین حرکت ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

اس مختصر جملہ میں تین نکات کی طرف اشارہ کیا گیاہے:

الف:قرآن یہ نہیں کہتا کہ زنا نہ کرو بلکہ یہ کہتا ہے کہ اس شرم آور فعل کے قریب نہ جاؤ یہ جملہ اس تاکید کے علاوہ کہ جو اس کے اندر موجود ہے اس بات کی طرف لطیف اشارہ کررہاہے کہ اکثر زنا کے کچھ مقدمات ہوتے ہیں جو انسان کو بتدریج زنا سے قریب کرتے ہیں، آنکھیں لڑانا بھی اس کے مقدمات میں سے ایک ہے جس کی طرف گزشتہ بیان میں اشارہ کیا جاچکا ہے، بے پردگی اور عریانی دوسرا مقدمہ ہے، سیکس کی کتابیں او ر بیلو فلم اور کلب وغیرہ بجائے خود اس کام کا ایک مقدمہ ہے اسی طرح نامحرم مردوعورت کا تنہائی کی جگہ اکٹھا ہونا بھی زنا کے لئے وسوسہ انگیز عامل شمار ہوتا ہے۔

ب: جملہ ’’ انہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ‘‘ کہ جس میں تین تاکیدیں ہیں (انّ، فعل ماضی اور لفظ فاحشہ کا استعمال ) اس گناہ کے بھیانک ہونے کو آشکار کرتا ہے۔

ج: جملہ’’ سائ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘(زنا بدترین راستہ ہے) اس حقیقت کو بیان کررہا ہے اس راستہ سے ماشرہ میں دوسری برائیاں پھیلتی ہیں۔

زنا کے حرام ہونے کا فلسفہ:

۱۔ خاندان کے نظام میں خرابی کا پیدا ہونا، اولاد اور ان کے باپوں کے رابطہ کا ختم ہونا کہ جس کا وجود صرف اجتماعی شناخت ہی کا سبب نہیں ہے بلکہ اولاد کی پوری حمایت کا بھی باعث ہے اور اس محبت کی بنیاد ہے جو پوری عمر میں اس حمایت کے جاری رہنے کا سبب ہوتی ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کا سراغ لگانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ لمحہ بھر کے لئے اس طرح سوچیں کہ اگر پورے معاشرہ کو زنا کی اجازت دیدی جائے، بیاہ شادی کی رسم ختم کردی جائے، تو اس صورت میں جو بچے پیدا ہونگے ان کی پرورش کا بار کون اٹھائے گا، نہ پیدائش کے وقت کوئی ان کی حمایت کرے گا اور نہ لڑکپن کے زمانہ میں، اس سے قطع نظر ظلم و تشدد سے مقابلہ کرنے میں محبت کا اہم کردار ہوتا ہے، وہ اس محبت سے محروم ہوجائیں گے اور انسانی معاشرہ حیوانیت میں تبدیل ہوجائے گا۔

۲۔ اس سے ہواوہوس کے بندوں کے درمیان مختلف قسم کے جھگڑے ہونگے بعض لوگوں نے جو کسی محلہ یا جاگیر وغیرہ کی داستانیں نقل کی ہیں ان سے بخوبی اس حقیقت کا اندازہ ہونا ہے کہ جنسی کجرویوں کے ساتھ بدترین جرائم بھی وجود پذیر ہوتے ہیں۔

۳۔ تجربہ اور علم نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ زنا سے مختلف قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اگرچہ اس کے برے آثار کو روکنے کے لئے پے پناہ بندوبست کئے گئے ہیں پھر بھی ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد ملتی ہے جنھوں نے اس راستہ پر چل کر اپنی صحت کو گنوا دیا ہے۔

۴۔یہ عمل اکثر بچوں کو ساقط کرانے، انھیں قتل کرنے اور نسل کے قطع ہونے کا سبب ہوتا ہے کیونکہ ایسی عورتیں ایسے بچوں کو اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، حقیقت میں وہ بچوں کو اپنی بد اعمالی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں۔

۵۔ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ شادی کا مقصد صرف جنسی پیاس بجھانا ہی نہیں ہے بلکہ شادی کے اور بہت سے فوائد ہیں جیسے زندگی کی تشکیل میں اشتراک روحی انس، فکری سکون، بچوں کی تربیت اور زندگی کے تمام حالات میں تعاون کرنا۔ اگر مردوعورت ایک دوسرے کے ساتھ زندگی نہ گزارے اور نکاح کو حرام سمجھا جائے تو ان میں سے کوئی کام بھی انجام پذیر نہیں ہوسکے گا۔

رونگٹا کھڑا کردینے والی تعداد:

برطانیہ کے دائرۃ المعارف کی ج ۲۳ ص ۴۵ میں لکھا ہے: متحدہ جمہوریاؤں کی جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے نوے فیصد لوگ مقاربت کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں اس تعداد میں جن بیماریوں کا امریکہ کے سرکاری اسپتالوں میں علاج ہوتا ہے ان کی تعداد تین لاکھ ساٹھ ہزار سے زیادہ ہے، متحدہ جمہوریاؤں کے تمام اسپتالوں میں سے چھ سو پچاس اسپتال اس بیماری سے مخصوص کئے گئے ہیں جب کہ ان اسپتالوں میں علاج کرانے والوں سے ڈیڑھ گنا زیادہ لوگ وہ ہیں جو اپنے فیملی اور خصوصی ڈاکٹروں سے علاج کراتے ہیں۔

’’ قوانین جنسی ‘‘ کتاب کے ص ۳۰۴ پر لکھا ہے: امریکہ میں ہر سال تیس سے چالیس ہزار بچے مقاربت کی موروثی بیماری میں مر جاتے ہیں اور متحدہ جمہوریاؤں میں ان بیماریوں سے جو نقصانات ہوتے ہیں وہ سل کی بیماری کے علاوہ تمام بیماریوں سے زیادہ ہیں۔ اطلاعات نامی اخبار کے شمارہ ۱۰۴۱۴ میں لکھا ہے: ۱۹۷۵؁ء میں امریکہ میں ۲۰۱۷۰۰ بچے ناجائز پیدا ہوئے تھے اور گذشتہ بیس برسوں میں اس تعداد میں پانچ فیصد اضافہ ہے۔ اسی سال جو عورتیں شادی کے تکلفات کے بغیر حاملہ ہوئی تھیں ان کی تعداد ۲۴۰۰۰ ہزار تھی اور ان میں سے اکثر کی عمر ۱۷ سال سے کم تھی، اور پیرس میں ۴۳۵۱۵ بچوں میں سے ۴۱۴۵ بچے غیر قانونی ہیں اور سوئیڈن میں ہر سال ۱۷۰۰۰ ہزار بچے ناجائز پیدا ہوتے ہیں۔

کیھان نامی اخبار کے شمارہ ۳۵۶ ۵ میں لکھا ہے ڈاکٹر مولنٹر جو کہ لندن کے جنوبی علاقہ میں طبابت کررہے ہیں ایک مقالہ میں لکھتے ہیں : لندن میں ہر سال جرائم کے سبب پیدا ہونے والے پچاس ہزار بچوں کو ساقط کرایا جاتا ہے اور اگر بیس بچے پیدا ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک ناجائز ہوتا ہے۔

زنا کے دنیوی و اخروی آثار

یہاں تک ہم نے زنا کی حرمت کے فلسفہ اور اس کے بھیانک نتائج اور مغربی ممالک کی مختصر تعداد کی طرف اشارہ کیا ہے اب ہم ان روایات کو سپرد قلم کرتے ہیں جو دنیا و آخرت اور برزخ کے عذاب سے متعلق ہیں۔

حضرت علی ؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ میں نے رسول ؐ سے سنا ہے کہ فرماتے ہیں :

فی الزنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فی النار۔

زنا کیچھ برے آثا ر ہیں : ان میں سے تین دنیا میں ہیں اور تین آخرت میں ہیں۔ جو دنیا میں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ زنا سے انسان کے چہرہ کا نور ختم ہوجاتا ہے، اس کی روزی کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے اور اس کی تباہی وفنا میں تعجیل ہوتی ہے اور جو آخرت میں ہیں ان میں پروردگار کا غضب، حساب کی سختی اور آگ میں داخل ہونا یا ہمیشہ آگ میں رہنا ہے۔

زنا سے تباہی اور ناداری پیدا ہوتی ہے:

رسول ؐ فرماتے ہیں : زنا فقروناداری کا باعث ہوتا ہے اور یہ شہروں کو ویران و تباہ کردیتا ہے۔

اسی طرح زنا مرگ ناگہاں کا سبب ہوتا ہے : امام محمد باقر ؑ فرماتے ہیں : حضرت علی ؑ کی کتاب میں لکھا ہے کہ رسول ؐ نے فرمایا: جب میرے بعد زنا کی کثرت ہوجائے گی تو اچانک طور پر زیادہ اموات ہونگی اور ایسی بری موت سے لوگ دنیا سے جائیں گے۔

زنا کار کا برزخ کا عذاب :

محمد بن علی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الی النار۔

محمد بن علی بن الحسین نے اپنی اسناد کے ذریعہ شعیب بن واقد سے انھوں نے حسین بن زید سے انھوں نے اس حدیث میں جو مناہی سے متعلق ہے فرمایا: آگاہ ہوجاؤ جو شخص مسلمان یا یہودی یا نصرانی یا مجوسی عورت سے زنا کرے خواہ وہ آزاد ہو یا کنیز اور اس فعل سے توبہ نہ کرے اور اس پر اصرار کرتے ہوئے مرجائے تو خداوند عالم اس کی قبر میں تین سو دروازے کھولے گا کہ جن سے سانپ اور بچھو اور اژدھا نکلیں گے اور وہ قیامت تک جلتا رہے گا اور جب وہ قبر سے نکلے تو لوگوں کو اس کی بدبو سے اذیت ہوگی اور لوگ اسے اس کے بد عمل اور اس کی بدبو سے پہچانیں گے آخر کار اس کو جہنم میں ڈال دیئے جانے کا حکم دیا جائے گا یہ ہے برزخ میں زنا کاروں کو دیا جانے والا عذاب اور روز قیامت انھیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

موت کو یاد کرنے کے ذریعہ شرم گاہ کی حفاظت

امام زین العابدین ؑ نے اس رسالہ میں شرم گاہ کی حفاظت کے طریقہ بیان فرمائے ہیں۔فرماتے ہیں : نامحرم کو دیکھنے سے آنکھیں بند کرلو بلکہ ہر اس چیز کو دیکھنے سے آنکھیں بند کرلو جس کا دیکھنا حرام ہے، دوسرا طریقہ: شرم گاہ کی حفاظت میں موت کی یاد کا اثر؛ فرماتے ہیں : ’’وکثرہ ذکر الموت ‘‘ اور موت کو زیادہ یاد کرنا بھی شرم گاہ کی حفاظت کا باعث ہوتا ہے، قرآن مجید میں موت اور اس کی حقیقت سے متعلق کچھ آیات موجود ہیں یہاں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے : سورۂ ’’ ق‘‘ میں ارشاد ہے:

وجائت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تحیہ۔

اور سکرات موت کا وقت حق کے ساتھ آگیا کہ جس سے تم بھاگتے تھے۔

سکر، بروزن مکر، کے معنی پانی کے راستہ کو بند کرنے کے ہیں اور سکر بروزن فکر بند جگہ کو کہتے ہیں اور چونکہ نشہ کی حالت میں انسان اور اس کی عقل کے درمیان رسہ کشی ہوتی ہے اس کو سکربروزن شکر کہا گیا ہے سکرۂ موت، نشہ کی سی حالت ہے۔ موت کے آثار رونما ہوتے ہی انسان کا اضطراب بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات یہ انقلابی اور ہیجانی کیفیت اس کی عقل پر طاری ہوجاتی ہے۔ اور اس کی علت یہ ہے کہ موت ایک اہم انتقالی مرحلہ ہے کہ انسان اس دنیا سے تمام رشتوں کو توڑ دیتا ہے جس سے وہ مدت دراز سے مانوس تھا اور ایک نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اس مرحلہ میں اس پر ایک عظیم و حشت طاری ہوتی ہے اوراس پر نشہ کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

موت کیا ہے؟

امام زین العابدین ؑ سے دریافت کیا گیا کہ موت کیا ہے؟ فرمایا:للمومن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔واعظم العذاب۔

مومن کے لئے تو میلے اور جوؤں سے بھرے لباس کو اتارنے اور مضبوط زنجیروں اور بندشوں کو توڑنے اور فاخرہ لباس کو گندے لباس سے بدلنے اور مانوس منزل میں جانے کے مثل ہے اور کافر کے واسطے فاخرہ لباس اتارنے اور وحشت ناک و نامانوس منزل میں منتقل ہونے کے مانند اور عظیم عذاب ہے۔

کربلا میں امام حسین ؑ نے بھی حقیقت موت کے بارے میں بہترین تعبیر بیان کی ہے۔

موت امام حسین ؑ کی نظر میں :

صبرابنی الکرام،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الی جحیمھم۔

اے شریف و عظیم لوگوں کے بیٹو! صبر سے کام لو موت کی مثال تو ایک پل کی سی ہے جو تمہیں دنیا کے رنج و محن سے نجات دلا کر وسیع و عریض اور دائمی نعمتوں والی بہشت میں پہنچا دے گی۔ اب تم میں سے ایسا کون ہے جو جیل سے چھوٹ کر قصر میں آرام کو پسند نہ کرے اور تمہارے دشمن کے لئے اس پل کی سی ہے جو انھیں عیش و نشاط کے محل سے جیل خانے میں پہنچا دے گی بیشک میرے والد نے مجھ سے رسول ؐ کی حدیث بیان کی ہے کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے پس مومنوں کا پل ان کی جنت کی طرف اور ان کا پل جہنم کی طرف ہے۔

موت کی کیفیت امام صادق ؑ کی نظر میں :

امام صادق ؑ سے عرض کیا گیا کہ ہمیں موت کی کیفیت بتائیے آپ نے فرمایا: مومن کے لئے ایک خوشبو کی سی ہے جس کو وہ سونگھتا ہے اور وجد میں آجاتا ہے اور نتیجہ میں اس کے سارے رنج و محن دور ہو جاتے ہیں اور کافر کے لئے اژدھا کے ڈسنے اور بچھو کے ڈنک مارنے کی مانند ہے۔

حضرت علی ؑنے مرتے دم کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے: کہ جب مادی پردے ہٹ جاتے ہیں، فرشتے سامنے آتے ہیں۔

فرماتے ہیں :

جو کچھ تمہاے مرنے والے دیکھتے ہیں اگر اسے تم دیکھ لو تو تم وحشت میں پڑ جاؤ اور خوف زدہ ہو جاؤ تم نے حق کی باتیں سنیں اور اطاعت کی لیکن جو انھوں نے دیکھا ہے وہ تم سے پوشیدہ ہے اور عنقریب پردے ہٹ جائیں گے اور تم اسے دیکھ لو گے۔

موت کی حقیقت

اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ موت ایک عدمی امر اور فنا ہوجانا ہے۔ نہیں ! یہ نظریہ اس چیزکے جو کہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے اور ان دلیلوں کے خلاف ہے جن کی طرف عقل راہنمائی کرتی ہے قرآن کی رو سے موت ایک وجودی شئے ہے ایک دنیا سے دوسری دنیا کی طرف منتقل ہونا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں موت آنے کے لئے تو فی کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ واپس لینے اور فرشتوں کے ذریعہ روح کو بدن سے قبض کرنے کے ہیں۔

بعض اسلامی روایات میں وارد ہوا ہے کہ انسان کے لئے تین دن بہت زیادہ وحشتناک ہیں۔

۱۔جس دن وہ پیدا ہوتا ہے اور اِس ان دیکھے جہان کو دیکھتا ہے۔ دوسرے جس دن وہ مرتا ہے اور موت کے بعد کی دنیا دیکھتا ہے اور تیسرے جس دن عرصہمحشر میں وار د ہوگا اور ان احکام کو دیکھے گا جو اس دنیا میں نہیں تھے۔

خداوند عالم نے ان تینوں دنوں کے لئے حضرت یحییٰ بن زکریا کے بارے میں فرمایا: سلام ہو ان پر جس دن وہ پیدا ہوئے سلام ہو ان پرجس دن وہ دنیا سے اٹھے سلام ہو ان پرجس دن وہ زندہ اٹھائے جائیں گے۔

حضرت عیسیٰ کی زبانی نقل ہوا ہے: والسلام۔۔۔۔۔۔۔ حیا۔

سلام ہو مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا، سلام ہو مجھ پر جس دن میں دنیا سے انتقال کرونگا، سلام ہو مجھ پر جس دن میں زندہ اٹھایا جاؤنگا۔

امام صادق ؑفرماتے ہیں : ذکر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

موت کی یاد انسان کی شہوانی خواہشوں کو بھلا دیتی ہے۔

اذکرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فقال الموت۔

لذتوں کو برباد کرنے والے کو یاد کرو عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول ! یہ کیا ہے؟ فرمایا: موت جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، امام زین العابدین ؑ نے موت کی یاد کو شہوتوں کو ختم کرنے کا سبب قرار دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان اپنے نفس کا خیال رکھے اور اسے عقاب خدا سے ڈرنے کا عادی بنائے کہ یہ بھی شہوتوں کو بھلانے کا باعث ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ اہم اس بیان کے آخر میں فرماتے ہیں : عظیم و برتر خدا سے مدد طلب کرنا ہے اگر جو ان خدا کو یاد کریں اور ہر حال میں اس کو حاضر و ناظر سمجھیں تو وہ انھیں نجات بخشے گا، جیسا کہ حضرت یوسف ؑ نے خدا سے عرض کی تھی : اگر تو مجھ سے عورتوں کے مکروفریب کو دور نہیں کرے گا تو میں بھی انسانی طبیعت کی بنا پر ان کی طرف مائل ہوجاؤ گا۔

انھوں نے خود کو خدا کے سپرد کیا تو خدا نے بھی انھیں نجات عطا کی۔

عورت کی حد فقہی نقطۂ نظر سے :

شارع اسلام نے اس اجتماعی اور خانما نسوز وبا کے سد باب کے لئے کچھ ایسے حدود و قوانین بنائے ہیں کہ اگر وہ جاری کئے جائیں تو یقینا اسلامی معاشرہ پاک و پاکیزہ ہوجائے اور ناموس کے لئے امن و امان کی فضا قائم ہوجائے، قرآن مجید کے سورۂ نور میں اس موضوع سے بحث ہوئی ہے چنانچہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں اس طرح لکھا ہے :

الزانیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔المومنین۔

زنا کار عورت اور زنا کار مرد ہر ایک کو سو کوڑے مارو خبردار دین خدا کے سلسلہ میں کسی قسم کی محبت و مہربانی نہ کرنا اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا دیتے وقت مومنوں کو ایک جماعت کو موجود ہونا چاہیے۔

اس آیت میں تین حکم بیان ہوئے ہیں :

۱۔ زنا کار مرد عورت کو سزا دینے کا حکم (زنا سے مرادغیر مرد میاں بیوی کا شرعی جواز کے بغیرجنسی فعل انجام دینا)

۲۔ اس بات کی تاکید کہ اس حد کو جاری کرنے میں خوامخواہ کی محبت و مہربانی کا شکار نہ ہونا اور اس قسم کے جذبات کو کچلنے کے لئے خدا اور روز جز ا پر ایمان کو پیش کیا ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس قانون ک یبارے میں اپنا نظریہ پیش کرے۔ اس سلسلہ میں رسول ؐ کی ایک حدیث نقل ہوئی ہے:

قیامت کے روز میدان محشر میں اس حاکم کو لایا جائے گا جنھوں نے خدا کی مقررکردہ حد میں سے ایک تازیانہ کم کیا ہوگا تو اس سے کہا جائے گا : تم نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا:تیرے بندوں پر رحم کرنے کے لئے۔ ندا آئے گی کیا تم میرے بندوں پر مجھ سے زیادہ مہربان تھے؟ ! حکم دیا جائے گا کہ اس کو جہنم میں پھینک دو۔ پھر اس حاکم کو لایا جائے گا جس نے ایک کوڑا زیادہ مارا تھا۔ اور اس سے کہا جائے گا تم نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا : تاکہ تیرے بندے تیرے مصیت سے باز رہیں۔ خدا کا ارشاد ہوگا۔ کیا تم اس پر مجھ سے بڑے حاکم تھے ؟ پھر حکم دیا جائے گا کہ اس کو جہنم میں پھینک دو۔

۳۔ سزا دیئے جانے کی جگہ پر مومنوں کی ایک جماعت کے پہنچنے کا حکم اس لیے نہیں ہے کہ گناہگار عبرت حاصل کریں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کی سزا سے دوسرے عبرت حاصل کریں، کیونکہ گناہ فرد سے معاشرہ میں سرایت کرتے ہیں اور یہاں چونکہ معاملہ عدالت میں پہنچ گیا ہے اور احکام جاری ہونے کا وقت آگیا ہے لہٰذا اس کی آبرو بچانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اسے قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے عنوان سے پہچنوایا جائے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ قانون محترم و مقدس ہے۔

اس آیت میں زنا کار مردوعورت کی حد سوکوڑے بیان ہوئے ہیں اور یہ حکم عام ہے البتہ کچھ استثنائی موارد بھی ہیں کہ جن کو بعد میں بیان کیا جائے گا مجرم ک یلئے اس حد کے ثابت ہونے کے لئے کچھ شرائط بیان ہوئے ہیں۔

پہلی شرط: بلوغ ہے یعنی مردوعورت بالغ ہوں بنابرایں یہ حد ان لڑکے لڑکیوں پر جاری نہیں ہوگی جو بالغ نہیں ہوئے ہیں۔

دوسری شرط: اختیار ہے، آزادی و اختیار سے زنا کیا ہو بنا بر ایں جس سے بالجبر زنا کیا جائے اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔

تیسری شرط: عقل ہے یعنی زنا کار خواہ مرد ہو یا عورت عاقل ہ واس بنا پر دیوانہ اور مجنون پر حدجاری نہیں ہوگی۔

امام خمینیؒ اضافہ فرماتے ہیں :

جو شخص زنا کا مرتکب ہوتا ہے اسے اس فعل کے حرام ہونے کا علم ہو خواہ اجتہاد کے ذریعہ علم ہو تقلید کے،پس اس شخص پر کوئی حد جاری نہیں ہوگی جو اس کے حرام ہونے کو نہیں جانتا ہے۔

مذکورہ حکم سے مستثنیٰ افراد زنائیمحصن و محصنہ کے مرتکب مردوعورت ہیں، محصن اس شخص کو کہتے ہیں جو شادی شدہ ہے اور بیوی اس کے پاس ہے۔ اور محصنہ اس عورت کو کہتے ہیں جو شادی شدہ ہے اور شوہر اس کے پاس ہے ان دونوں میں سے جو بھی زنا کا مرتکب ہوگا تو اس کی سزا موت ہے۔ دوسرا استثنا محرم سے زنا ہے اس کی سزا بھی موت ہے اسی طرح زنا بالجبر کی سزا بھی موت ہے۔

حکم جاری کرنے کے اصول و شرائط:

۱۔ زنا کے ثابت ہونے اور حد جاری ہونے کے لازم ہونے ک یلئے ضروری ہے کہ چار عادل مرد گواہ یا تین مرد اور دو عورتیں یا دو مرد اور چار عادل عورتیں اس کے دیکھنے کی گواہی دیں۔

۲۔ سارے گواہ یہ گواہی دیں کہ سب نے ایک ہی جگہ زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

۳۔ سارے گواہ یہ گواہی دیں کہ سب نے ایک ہی وقت میں زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

۴۔ سارے گواہ ایک ہی مجلس میں گواہی دیں۔

۵۔ اگر چار عادل افراد، چار آدمیوں کی زبانی نقل کریں تو کافی نہیں ہے۔

۶۔ اگر چار عادل گواہ زنا ہونے کی گواہی دیں لیکن اس عورت کو نہ پہچانیں تو ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

۷۔ اگر چار گواہوں میں سے تین آدمی بالاتحاد گواہی دیں اور چوتھا گواہی دینے سے پہلو تہی کرے یا وہ ان تینوں کی مخالفت کرے تو ان تینوں پر تہمت کی حد جاری ہوگی۔

عبادی افعال کے حقوق

حق نماز

فاما حق الصلاۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الا باللہ۔

لیکن نماز کا حق، تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیی کہ نماز تمہیں خدا کے حضور میں پہنچاتی ہے اور نماز میں تم خدا کے سامنے کھڑے ہوتے ہو جب تم اس بات کی طرف متوجہ ہوجاؤ کہ تم خدا کے سامنے ہوتو تمہیں اس طرح کھڑا ہونا چایے جس طرح ذلیل، عاجز و خورد، مشتاق، جراں، خوف زدہ، امید وار محتاج زاری کرنے والا کھڑا ہوتا ہے اور جس کے سامنے تم کھڑے ہو اس کی عظمت سمجھتے ہوئے، ساکن، سر جھکائے اعضا کے خشوع کے اور فروتنی کے ساتھ اس کی عظمت کا لحاظ رکھو اور اپنے دل میں اس سے بہترین طریقہ مناجات و دعا کے ذریعہ اپنی گردن کو ان خطاؤں سے آزاد کرنے کی التماس کرو ج واس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور ان گناہوں کی بخشش کی دعا کرو اور کوئی طاقت و قوت نہیں ہے سوائے خدا کے۔

نما ز کا حق بیان کرنے میں امام زین العابدین ؑ پہلے نماز کی اہمیت و عظمت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ نماز خدا کی بارگاہ میں باریاب ہونے کا ذریعہ ہے، نماز مادی دنیا کو چھوڑنے اور انسان کو مشغول کرنے والی چیزوں کو پس پشت ڈالنے اور پروردگار کی عظمت کی طرف متوجہ ہونے اور عالم ناسوت کی تاریکیوں سے نکل کر عالم نور میں پہنچنے کا وسیلہ ہے یایسے ہی سفر و ہجرت کو ان خصوصیات کے ساتھ ہونا چاہیے جو امام نے بیان فرمائے ہیں ان خصوصیات کو ہم نماز کی بحث کے ذیل میں بیان کریں گے۔

نماز عظیم عبادت

دین اسلام نے اپنے عبادی دستور العمل میں سب سے پہلے نماز کو رکھا ہے اور اس کی اہمیت کو اپنے ماننے والوں کے گوش گزار کر دیا ہے۔

شارع اسلام نے لڑکے اور لڑکی پر اس وقت سے نماز کو واجب کیا ہے جب وہ بالغ ہوجاتے ہیں اور اگر وہ کسی عذر کی بنا پر نماز نہ بجا لاسکیں تو اس کی قضا بجالائیں رات دن میں مخصوص اوقات میں نماز کو واجب قرار دیا ہے چنانچہ نمازی کا ایک فریضہ اوقات نماز کو پہچاننا بھی ہے۔

اوقات نماز قرآن کی نظر میں

قرآن مجید کی بعض آیتوں میں اشارتاًاور بعض میں صریح طور پر اوقات نماز کو بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں ارشاد ہے:اقم الصلوٰۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔للذاکرین۔

اور آپ (رسولؐ) دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے پہلے حصہ میں نماز قائم کریں۔ بیشک نیکیاں، برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ خدا کو یاد کرنے والوں کے لئے ایک یاد دہانی ہے۔

بظاہر ’’ طرفی النھار‘‘ صبح اور مغرب کی نماز کے وقت کو بیان کرتا ہے کہ دن کے دو طرف صبح اور شام ہی ہیں یہ زلف زلفہ کی جمع ہے جس کے معنی نزدیکی ہیں اور رات کے اس حصہ کو زلف کہتے ہیں جو دن سے نزدیک ہوتا ہے۔

یہ نماز عشاء کے وقت کی طرف اشارہ ہے اور اس آیت کی یہی تفسیر ائمہ اہل بیت ؑ کی احادیث میں بیان ہوی ہے کہ مذکورہ آیت تین وقت صبح مغرب اور عشاء کی نماز کو بیان کرتی ہے۔

سورۂ اسراء میں ارشاد ہے: اقم الصلوٰۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کان مشھودا۔

زوال آفتاب سے رات کی تاریکی چھا جانے تک نماز قائم کرو (اول ظہر میں نماز ظہرین اور ابتدائے شب میں نماز مغربین قائم کرو) نماز صبح بھی بجالاؤ کہ نماز صبح کے گواہ رات دن کے فرشتے ہیں۔

قرآن فجر سے نماز صبح کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں پانچوں وقت کی نماز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور سورۂ بقرہ میں اس طرح ارشاد ہے:

حافظوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قانتین۔

یہ آیت نماز ظہر و عصر سے متعلق ہے۔

امید بندھانے والی آیت

سورۂ ہود کی ۱۱۴ویں آیت کے تفسیرکے ذیل میں صاحب مجمع البیان نے اس آیت کے ذیل میں حضرت علی ؑ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ ! ایک روز آپ نے کچھ لوگوں سے دریافت فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ قرآن میں کونسی آیت زیادہ امید بخش ہے؟ بعض نے کہا:ان اللہ۔۔۔۔۔۔۔

آپ نے فرمایا: بہت خوب لیکن جو آیت میں معلوم کرنا چاہتا ہوں یہ وہ نہیں ہے۔

بعض نے کہا: آیۂ ومن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رحیما۔

آپ نے فرمایا: جو آیت میں معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں ہے۔

بعض نے کہا: آیہ : قل یا عبادی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رحمۃ اللہ۔

آپ نے فرمایا: جو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں یہ وہ نہیں ہے لوگوں نے کہا: پھر وہ کون سی آیت ہے؟ !آپ نے فرمایا: میں نے اپنے حبیب اللہ کے رسول ؐ سے سنا ہے کہ فرماتے ہیں : امید بخش ترین آیت یہ ہے: اقم الصلوٰۃ۔۔۔۔۔۔۔اللیل۔

حضرت موسیٰ کو آغاز وحی میں نماز کا حکم دیا جاتا ہے۔

حضرت علی ؑ کا یہ قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ امید بخش ترین آیت قرآن، آیۂ نماز ہے۔ اولوالعزم پیغمبر موسی بن عمران کے حالالت ملاحظہ فرمائیں : سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ خدا کا کلام سنتے ہیں :

وانا اخترتک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لذکری۔

میں نے تمہیں رسالت کے لئے منتخب کیا ہے اب جو تمہارے اوپر وحی ہوگی اسے سنو! میں اللہ ہوں میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر شرک سے خالص ہو کر میری ہی عبادت کرو اور میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔

اس آیت میں پہلے توحید کو پیش کیا گیا ہے جو کہ انبیاء کی تبلیغ کی اہم ترین اصل ہے۔ پھر خدا کی عبادت کا ذکر ہے اور اس کے بعد نماز یعنی مخلوق کا خالق سے اہم ترین ربط اور اس پاک ذات کو فراموش نہ کرنے کے لئے موثر ترین طریقہ کا حکم دیا ہے۔ نماز کے گونا گوں فلسفہ میں، اس آیت اور موسیٰ کی دعوت کے آغاز میں خدا کے ذکر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ انسان کی زندگی میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کے باعث انسان غافل ہوگیا ہے اور خدا کو بھول گیا ہے لہٰذ دن رات میں متعدد بار نماز کے ذریعہ اس غفلت سے جنگ کی جاتی ہے۔ صبح کو انسان (اس نیندسے) بیدار ہوتا ہے جس نے اسے ہر چیز سے بیگانہ کردیا تھا ) اور اپنی زندگی کے پروگرام کو شروع کرنا چاہتا ہے، خدا نے ہر کام سے پہلے اس پر نماز واجب کی ہے تاکہ وہ نماز کے ساتھ اپنی زندگی کے امور کا آغاز کرے اور یاد خدا کے وسیلہ سے اپنے قلب و روح کو صفاء و جلا بخشے اور جب وہ اپنے روز مرہ کے کام میں منہمک ہوجاتا ہے اور زندگی کے امور اسے پوری طرح اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں تو دن کے نصف میں وہ ’’ حی علی الصلٰوۃ‘‘ نماز کی طرف دوڑو کی آواز سن کر وہ نماز کے لئے جاتا ہے اور راز و نیاز کے لئے اپنے معبود کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنے دل پر پڑے ہوئے گردوغبار کو صاف کرتا ہے۔ اسی طرح دن کے خاتمہ اور رات کے آغاز میں اور رات کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد وہ پھر نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور اپنے دل میں خدا کی یاد کو زندہ کرتا ہے۔

اس آیت میں خدا نے حضرت موسیٰ سے یہ فرمایا ہے: نماز اس لئے پڑھنا ہے تاکہ تمہیں میرا ذکر یاد آجائے۔ اور سورۂ رعد میں خدا نے اپنے ذکر کو دلوں کے سکون و اطمینان کا باعث قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے: الا بذکر اللہ۔۔۔۔۔۔۔القلوب۔ ! جان لو کہ دل یاد خدا سے آرام پاتے ہیں۔

ہر حال میں یاد خدا

سورۂ نساء میں جہاں مسافر اور نماز خوف کا بیان ہے وہاں یہ آیت ہر حال میں یاد خدا کو بیان کرتی ہے:

فاذا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔موقوتا۔

جب تم نماز پڑھ چکو تو کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے خدا کو یاد کرو پھر جب تم مطمئن ہو تو نماز قائم کرو یقینا نماز مومنین پر وقت کے ساتھ واجب کی گئی ہے۔

کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے خدا کا ذکر کرنے سے ممکن ہے جنگ بند ہوجانے کے درمیان آرام کا وقت مراد ہو اور ممکن ہے سر بازوں اور سپاہیوں کے مختلف حالات مراد ہوں کہ وہ کھڑے ہوتے ہیں کبھی بیٹھتے ہیں، کبھی پہلو کے بل لیٹتے ہیں اور کبھی ہتھیار استعمال کرتے ہیں در حقیقت یہ اسلام کاا ہم دستور ہے تاکہ انسان کسی حال میں بھی خدا سے غافل نہ رہے۔ لیکن متعدد روایات میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں بیماروں کے نماز پڑھنے کی کیفیت بیان ہوئی ہے اور روایات میں کتاب موقوت سے مراد ثابت و واجب ہے۔

امام غزالی کا قول:

روح نماز خشوع اور حضور قلب ہے، نماز سے مراد حق تعالیٰ سے دل کو سیدھا رکھنا ہے اور اس کی عظمت و ہیبت کے ساتھ اس کا ذکر کرنا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے : اقم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ‘‘ مجھے یاد کرنے کے لئے نماز قائم کرو رسول ؐ فرماتے ہیں : اس طرح نماز پڑھو جیسے تم کسی کو وداع کررہے ہو،یعنی اس نماز کے ساتھ تم خود کو اور اپنی ہواو ہوس کو رخصت کرو بلکہ حق کے علاوہ ہر چیز کو رخصت کردو اور پورے انہماک کے ساتھ نماز پڑھو۔

یہاں تک ہم نے قرآن کی آیتو ں سے نماز کی اہمیت اور اس کی بعض حکمتیں بیان کی ہیں۔

حقیقی نماز

مرحوم فیض ’’ الحقائق ‘‘ میں لکھتے ہیں : حقیقینماز درج ذیل مطالب کو ملحوظ رکھنے سے وجود میں آتی ہے: حضور قلب ۲۔اس کے منی و مطالب کو سمجھنے ۳۔ تعظیم ۴۔ ہیبت ۵۔ رجاء ۶۔ حیا

حضور قلب:

جو چیزیں حضور قلب کا سبب ہوتی ہیں اور جن کے ذریعہ سے انسان خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے ان میں سے ایک قصد و ارادہ ہے، کیونکہ قلب ارادہ کے تابع ہوتا ہے جس چیز کے لئے انسان کا ارادہ جتنا زیادہ قوی ہوگا اسی تناسب سے دل اس کی طرف متوجہ ہوگا بنا برایں یہ کہا جاسکتا ہے : قلب ارادہ کے تابع ہے۔

انسان کے اندر اس عقیدہ کو پیدا ہونا چاہیے کہ دنیوی اور اخروی زندگی کے موازنہ میں اخروی زندگی کو ترجیح ہے کیونکہ وہ ابدی اور سرمدی ہے اس کے ساتھ مشکلات اور بے چینی نہیں ہے : ان الدار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یعلمون۔ بیشک آخرت ابدی زندگی کا گھر ہے اگر تم جانتے ہو، دوسری جگہقرآن کا ارشاد ہے : والاخرۃ۔۔۔۔۔۔۔ آخرت بہتر اور جاویدانی ہے اس ابدی زندگی اور بہتر وبقا کو صرف نماز ہی کے وسیلہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے، نماز تقرب کا ذریعہ ہے۔ اگر اس جملہ کے ساتھ یہ عقیدہ قائم کرلیں کہ دنیا حقیروپست ہے تو نماز میں حضور قلب ہو جائے گا۔

تفہم:

حضور قلب کے بعد اہم ترین موضوع ان الفاظ کے معنی کو سمجھنا ہے کو زبان سے ادا کررہا ہے۔ اگر اس کی توجہ معانی پر مرکوز ہوگئی تو وہ دنیوی امور سے غافل ہو جائے گا پھر نماز کی حالت میں اسے خیالات کے جنجال سے نجات مل جائے گی۔ حالت نماز میں انسان کے ذہن پر مختلف قسم کے افکار کے ہجوم کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دخت کے سایہ میں موجود ہو اور وہ ایک درخت کے سایہ میں آزادانہ اور اکرام کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہو لیکن وہ پرندوں اور بلبلوں کی آوازوں میں کھو جائے پھر وہ لکڑی اٹھا کر انھیں اڑا دے لیکن وہ پھر آجائیں تو حالت نماز میں نمازی کی یہی حالت ہوتی ہے۔

تعظیم:

تعظیم ایک حالت ہے جو دل پر طاری ہوتی ہے، اس سے معرفت پیدا ہوتی ہے اور ایک معرفت خدا کے جلال و عظمت کی ہے جو کہ اصل ایمان ہے اور دوسری معرفت اپنے نفس کے حقیر و پست ہونے اور اپنے کو خدا کے تابع فرمان سمجھنے کی ہے۔ ان دو حالتوں سے بندہ کے خشوع و انکسار میں اضافہ ہوتا ہے اور اس حالت کے پیدا ہونے سے انسان خدا کی عظمت کو سمجھتا ہے۔

ہیبت:

انسان کے نفس کے لئے دوسری حالت خوف و ہیبت ہے یہ حالت خدا کی بے پناہ قدرت سے پیدا ہوتی ہے اور یہ کہ عالم کے تمام ذرات میں خدا کی مشیت کارفرما ہے چنانچہ جتنا اس کی قدرت کاعلم زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کا خوف بڑھتا ہے، علامہ نراقی مرحوم نے خلوص کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں : اس امر میں خلوص، قصد قربت اور اس کے ریا کی آلودگی سے خالی ہونے کا بھی دخل ہے۔

رجائ:

معرفت سے خداوند عالم کے لطف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس طرح کہ انسان خدا کے بے پناہ لطف و کرم کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اسے خدا کے اس وعدہ کا یقین ہوجاتا ہے کہ نماز کے عوض جنت دے گا اور ان تمام چیزوں سے خداکے لطف کی امید ہوجاتی ہے۔

حیائ:

حیاء انسان کو اس وقت ہوتی ہے کہ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ خدا کے حقوق کو پورا کرنے سے قاصر ہے اور اپنے وجود میں ایسے عیوب دیکھتا ہے کہ جو اسے مسلسل دنیوی امھور اور اس کی زرق برق کی طرف متوجہ کرتے ہیں دوسری طرف جب اسے خدا کے جلال کا علم حاصل ہوتا ہے اور وہ اس بات کی طرف ملتفت ہوتا ہے کہ خدا اس کے باطن سے آگاہ ہے تو اس وقت انسان کے اندر ایسی حالت پیدا ہوتی ہے کہ جس سے حیاء پیدا ہوتی ہے۔

یہاں تک ہم نے حقیقت نماز کو فیض کاشانی سے نقل کیا ہے۔ اب میرزا جوادملکی تبریزی کا قول ملاحظہ فرمائیں : وہ عظمت و اہمیت نماز کے بارے میں شہید اول کی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

شہید اول نے واجبات نماز کو جو کہ ہزار مسئلے ہیں، ایک کتاب میں جمع کیا ہے اور اس کتاب کا نام الفیہ رھا ہے اور مستحبات نماز کو دوسری کتاب میں جمع کیا ہے اور اس کا نام نفلیہ رکھا ہے۔

موصوف نے نماز کا ایک اہم فلسفہ بیان کیا ہے: ان الصلٰوۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ والمنکر۔

نماز انسان کو بداعمالیوں سے روکتی ہے۔تحریر فرماتے ہیں :

رہی یہ بات کہ نماز انسان کو بد اعمالیوں اور بری باتوں سے باز رکھتی ہے تو یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے یکونکہ قرآن نے نماز کی اس خاصیت کو صریح طور پر بیان کیا ہے پس نماز میں یہ خاصیت نہ ہوتو نماز ایک عمل ہے جو نفاق کے سبب وجود پذیر ہوا ہے کیونکہ اگر اس میں روح نماز کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ اتنی ہی مقدار میں انسان کو برائیوں سے روکتا۔

جیسا کہ اس عظیم عالم نے شہید اول کی کتب سے نقل کیا ہے،نماز کے علاوہ کسی عبادت میں اتنے مسائل نہیں ہیں چنانچہ فقہ و حدیث کی کتابوں میں نماز کا باب ہر باب سے زیادہ مفصل ہے ہم امام زین العابدین ؑ کے نورانی کلمات کی شرح میں اس عمیق دریا کے چند قطروں کی طرف اشارہ کریں گے۔

نماز جن فردی، اجتماعی اور اخلاقی آثار کی حامل ہے، اختصار کے ساتھ ہم ان میں سے ہر ایک کا خلاصہ بیان کریں گے۔

نماز کے فردی آثار

نماز کے فردی آثا میں سے یہ ایک ہے کہ جو انسان رات دن می ں پانچ مرتبہ خود کو خدا کے سامنے دیکھتا ہے اس کا حوصلہ و جذبہ بیدار ہوجاتا ہے اور اس کا عزم و ارادہ محکم ہوجاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ مشکلات کے مقابلہ میں پہاڑ کی مانند کھڑا رہتا ہے۔

فرد میں نماز کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب وہ خود کو مادیات سے آزاد کرالیتاہے اورعالم ربوبیت کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا دل مادہ کی کدورتوں سے پاک ہوجاتا ہے اور اس کو آرام و سکون میسر آجاتا ہے منقول ہے کہ جب رسول ؐ کسی حادثہ یا مشکل پیش آجانے کی وجہ سے محزون ہوتے تھے تو نماز کا سہارا لیتے تھے اور زیادہ نماز بجالاتے تھے چونکہ نماز گویا خدا سے ملاقات ہے اور جب آپ خدا سے ملاقات کرتے تھے تو آپ کا حزن و ملال برطرف ہوجاتاتھا توفرماتے تھے : اذ اقام۔۔۔۔۔۔۔ ربہ۔ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو درحقیقت خدا سے مناجات کرتا ہے اور اس کی پوری توجہ خدا پر ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ اس سے نہ دوری ہے اور نہ فاصلہ ہے وہ اس کی دعا کو سنتا ہے اس کے پکارنے کا جواب دیتا ہے۔

نماز کا دوسرا فردی اثر یہ ہے کہ وہ انسان کو اس غرور سے نجات دلاتی ہے جو زندگی کے سفر میں مال و منصب کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے یہی انسانی کمال کا وہ نقطہ ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے قیام و رکوع اور سجود کے راز اور اس کے فلسفہ کے بارے میں امام خمینی ؒ فرماتے ہیں :

جو نماز مومن کے کمال کی معراج اور اہل تقویٰ کو خدا سے قریب کرنے والی ہے وہ ایسی چیزوں پر استوار ہے جو کہ ایک دوسرے کے لئے مقدمہ ہیں۔

۱۔ خود پسندی کو چھوڑنا بھی تقویٰ کی حقیقت اور اس کا باطن ہے دوسرے خدا خواہی اور حق طلبی ہے کہ یہ تقرب و معراج کی حقیقت ہے اسی لئے روایت میں وارد ہوا ہے ’’ الصلٰوۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ نماز ہر متقی اور پرہیز گار انسان کے لئے خدا سے قریب ہونے کا سبب ہے۔

یہ دونوں منزلیں، قیام و رکوع اور سجود سے بتدریج حاصل ہوتی ہیں۔ پس قیام کی حالت میں خود پسندی کو ترک کرنا ہے۔ مقام فالیت اور مقام رویت فاعلیت حق اور حق کی قیومیت مطلق کے مطابق ہے اور رکوع میں ترک خود پسندی حق کے اسماء و صافت ہیں۔

نماز کا ایک فردی اثر یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا اپنی اصلاح کرنے کے لیے تیا ہو اور اخلاقی فضائل میں بلندی کی انتہا تک پہنچا جائے اور دل کی سرزمین کو پستیوں سے صاف کرے۔ قرآن مجید سچے مومنوں کی، ان صفات کے ذریعہ، تعریف کرتا ہے کہ جن سے وہ نماز کے سویلہ سے متصف ہوئے تھے چنانچہ سورۂ مومنون میں ارشاد ہے:

قد افلح۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خاشعون۔

یقینا ان مومنوں نے فلاح پائی کہ جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔

’’ افلح‘‘ فلح فلاح سے مشتق ہے اس کے اصل معنی شگافتہ کرنا اور کاٹنا ہے بعد میں اس کا اطلاق ہر قسم کی کامیابی اور مقصد کے حصول اور خوشبختی پر ہونے لگا حقیقت یہ ہے کہ کامیاب راستے سے رکاوٹوں کو ہٹا دیتے ہیں اور اپنے آخری مقصد تک پہنچنے کے لئے راستہ بناتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ ان معنی کے تشریح کرتے ہوئے راغب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں : فلاح کی دو قسمیں ہیں دنیوی و اخروی، دنیوی فلاح کا خلاصہ تین چیزوں میں ہوتا ہے :بقا غنا اور عزت اور اخروی فلاح چار چیزوں میں ہے : ایسی بقا جس کے لئے فنا نہ ہو ایسی بے نیازی جس کے ساتھ نیاز مندی نہ ہو، ایسی عزت جس کے بعد ذلت نہ ہو اور ایسا علم جس کے ساتھ نادانی وجہالت نہ ہو۔ اس آیت میں مومنوں کا تعارف خشوع کے ذریعہ کرایا گیا ہے، خاشعون خشوع سے مشتق ہے اس کے معنی اس جسمانی اور روحانی خاکساری کے ہیں کہ جو کسی عظیم شخصیت کے سامنے یا کسی اہم حقیقت کی وجہ سے انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر بدن سے ظاہر ہوتا ہے۔ آیت میں اسی چیز کی طرف اشارہ ہوا ہے، یعنی ان کی نماز کے الفاظ و حرکات بے جان نہیں ہیں بلکہ ان میں روح و معنویت ہے انھوں نے خدا کی طرف اس طرح توجہ کی ہے کہ وہ اس کے غیر سے جدا ہوگئے ہیں۔

خشوع پیدا ہونے کے اسباب

۱۔ پہلا سبب کہ جس سے ایسی معرفت پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ دنیا اس کی نظر میں حقیر ہوجاتی ہے اور خدا عظیم ہوجاتا ہے حضرت علی ؑ نے متقین کی علامتو ں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: عظم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اعینھم۔ جب خدا ان کی نظر میں عظیم و برتر ہوگیا تو خدا کے علاوہ دوسرے ان کی نظر میں حقیر ہوگئے۔

۲۔ حالت نماز میں دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہ کرے بلکہ پوری توجہ نماز اور اس کے معنی و مفہوم پر مرکوز کرے۔

۳۔ نماز کے لئے خاص جگہ کا انتخاب کرے کہ اس میں دنیوی زرق و برق نہ ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تصویر و مجسمہ کے مقابل، راستہ میں اور کھولے ہوئے دروازے میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

۴۔ گناہوں سے پرہیز کرنا خشوع کے پیدا ہونے کا اہم ترین عامل ہے۔

۵۔نماز کے معنی، افعال و اذکار اور اس کے فلسفہ کو جاننا۔

۶۔اس کے مخصوص آداب و مستحبات کو بجالانا خواہ وہ اس کے مقدمات میں ہوں یا اصل نماز میں۔

۷۔ یہ کام بھی دیگر امور کی مانند مشق و تمرین چاہتا ہے اس سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

نماز کا اجتماعی اثر

نماز کے اجتماعی آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے دوسروں کی بہ نسبت افراد کے اندر ذمہ دای کا احساس پیدا ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے وہ فطری طور پر اجتماعی زندگی گزارنے کاخوگر ہے۔

وہ تنہائی سے گھبراتا قید خانے کی کوٹھری میں انسان کا زندگی گزارنا اس کے لئے بدترین سزا ہے، انسان دو ذمہ داریوں کا حامل ہے: فردی و اجتماعی، فردی ذمہ دای کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

’’ کل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ‘‘ ہر انسان اس چیز میں پھنسا ہوا ہے جو وہ کرتا ہے۔ اور سورۂ نساء میں ارشاد ہے: ’’ وما۔۔۔۔۔۔‘‘ تم تک جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری ہی طرف سے ہے اور ہر شخص اپنے قول و فعل کا جواب دہ ہے۔

اجتماعی مسؤلیت، اس میں فرد سے نہیں بلکہ پورے معاشرہ سے بحث ہے، معاشرہ ک یلئے ہر فرد کے کچھ فرائض ہیں جیسا کہ رسول ؐ نے فرمایا: کلکم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک جواب دہ ہے۔

خصوصیات نماز میں سے اجتماعی ذمہ داری کے احساس کو زندہ کرنا بھی ہے اسی لئے شارع نے فرادیٰ اور جماعت والی نماز میں فرق رکھا ہے، یہ دونوں ثواب کے لحاظ سے ہرگز برابر نہیں ہیں۔اسلام نے نماز جماعت کے لئے بہت زیادہ تاکید کی ہے اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک بار عبادی و سیاسی نماز جمعہ رکھی ہے کہ جس میں سارے مسلمان صف در صف ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوتے ہیں، اور امام جمعہ کے خطبہ سے سیاسی مسائل، معاشرہ کی موجودہ مشکلیں عنقریب پیش آنے والی مشکلوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان کا حل تلاش کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ جب مسلمان نماز جمعہ میں کھڑے ہوتے ہیں تو اس وقت مسلمانوں کے شکوہ و جلال اور ان کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ نماز اس بات کا باعث ہوتی ہے کہ کینہ توز دشمن مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے کی نہ سوچے،اس سے مسلمان ایک مستقل و خود مختار قوم بن جاتے ہیں اور ہمیشہ شوکت و اقتدار کے حامل رہتے ہیں۔

نماز جماعت میں مستحب ہے کہ صفیں منظم ہوں دلچسپ بات یہ ہے کہ نماز جماعت میں کالے گورے، اور عرب و عجم صف میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوتے ہیں اور نماز کے بعد مصافحہ کرتے ہیں اس سے معاشرہ میں مساوات و برابری کا جذبہ بیدا ر ہوتا ہے اور اس سے طبقاتی فکر، کہ جس سے آزاد منش اور شریف و نجیب آدمی کو اذیت ہوتی ہے، ختم ہوتی ہے اور کینہ توزی و عداوت کی جگہ خلوص و محبت آجای ہے، نماز جماعت میں شریک ہونے سے معاشرہ کے دوسے لوگوں کے حالات بھی معلوم ہوجاتے ہیں اور اگر کوئی شخص کسی دن مسجد میں نہ آئے تو دوسرے نمازی اس کے نہ آنے کی وجہ معلوم کرتے ہیں۔ اگر اسے کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے تو اسے رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں مختصر یہ کہ نماز سارے مسلمانوں کو امت واحدہ (ایک امت ) قرار دیتی ہے اور نتیجہ میں ایک مستقل معاشرہ وجود پذیر ہوجاتا ہے۔

نماز کے اخلاقی آثار

انسان اس وقت تک خدا کا تقرب حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اپنے وجود سے رذائل کو برطرف نہیں کرتا اور اپنے وجود سے ان برے صفات کو اکھاڑ کر نہیں پھینک دیتا جو جڑ پکڑ چکے ہیں اور دل کو فضائل کے پنپنے کے لئے آمادہ نہیں کرتا قرآن کہتا ہے:

قد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فصلیٰ۔

یقینا وہ کامیاب ہوگیا جس نے اپنا تزکیہ کرلیا اور اپنے پروردگار کے نام کو یاد رکھا اور نماز پڑھی۔

نماز اخلاق کی طہارت و پاکیزگی کا ذریعہ ہے، مستقل نماز پڑھنے سے انسان نیکی کا عادی ہوجاتا ہے اور برائی سے باز رہتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

ان الصلٰوۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والمنکر۔

بیشک نماز ہر برائی اور بد کاری سے روکتی ہے اور انسان کو فضیلت و سعادت سے قریب کرتی ہے چنانچہ درج ذیل آیتوں میں اسی بات کی طرف اشارہ ہوا ہے:

ان الانسان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دائمون۔

انسان کو حریص اور کمزور پیدا کیا گیا ہے، جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بے تاب ہوجاتا ہے اور جب مال مل جاتا ہے تو بخیل بن جاتا ہے، سوائے ان نمازیوں کے جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

بعض مفسرین اور صاحبان لغت نے ہلوع کے معنی حریص و لالچی اور بعض نے کمزور تحریر کئے ہیں، پہلے معنی کے اعتبار سے یہاں انسان کے وجود میں تین اخلاقی منفی نکات کی طرف اشارہ ہوا ہے: حرص، جزع،فزع اور بخل و کنجوسی، اور دوسرے معنی کے لحاظ سے دو نکتے ہیں : جزع و فزع اور بخل، کیونکہ دوسری اور تیسری آیت ’’ ہلوع ‘ذ ہی کی ایک تفسیر ہے۔

اس آیت میں انسان کے وجود کی حرص و طمع اور بے صبری و کمزوری سے اصلاح کے لئے نماز کا بنیادی کردار ہے۔ نمازی نماز کے زیر سایہ اپنی اصلاح کرسکتے ہیں۔ کہ نماز انسان کی زندگی کے آغاز و انجام کی تفسیر کرتی ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے، کہاں آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔

جامع السعادات میں علامہ نراقی لکھتے ہیں : کہ ہمارے مولا امیرالمومنین ؑ سے پہلے سجدہ کے معنی دریافت کئے گئے تو آپ نے فرمایا: اس کے معنی یہ ہیں اے خدا تونے ہم کو خاک سے پیدا کیا ہے، اور اس سے سر اٹھانے کے معنی یہ ہیں : اور اسی سے ہمیں اٹھائے گا اور دوسرا سجدہ اس بات کی طرف اشارہ ہے:

اور پھر ہمیں اسی میں پہنچائے گا او ر اس سے سر اٹھانے کے معنی یہ ہیں کہ پھر ہمیں دوبارہ اس سے اٹھائے گا۔

جب انسان ایسے معنی پر توجہ کرے گا تو یقینا اپنے نفس کی اصلاح کے لئے کوشش کرے گا۔

نماز اور مال کی راہ میں رکاوٹ

شیخ محمود شبستری نے ’’ گلشن راز ‘‘ میں اس نماز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس کی قبولیت کے موانع و رکاوٹ ختم ہوجاتے ہیں اور ان موانع کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں :

موانع۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قرۃ العین۔

جب تک تم ان چیزوں کو اپنے وجود سے دور نہیں کروگے کہ جو نماز کی قبولیت میں رکاوٹ بنتی ہیں، اس وقت تک تمہارے دل میں نور نہیں آئے گا اس دنیا میں چار موانع ہیں طہارت بھی چار ہیں۔

پہلے تم حدث و نجاست سے طہارت کرو۔ پھر معصیت و شرک اور وسوسوں سے پاک ہوجاؤ تیسرے برے اخلاق سے پاک ہونا کہ بد اخلاق آدمی جانور کی مانند ہے۔ چوتھے باطن کی طہارت و پاکیزگی ہے اور یہی نقطہ کمال ہے پھر جو شخص ان چاروں طہارتوں کو بجالاتا ہے وہ بیشک خدا سے راز و نیازکرنے کا مستحق ہوجاتا ہے۔ جب تک تم خود کو پورے طریقہ سے فراموش نہیں کروگے اس وقت تک تمہاری نماز، نماز نہیں ہوگی جب تمہاری ذات ہر برائی سے پاک ہوجائے گی اس وقت تمہاری نماز آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گی۔

یہاں تک ہم نے مختصر طور پر نماز کی اہمیت، اس کے فلسفہ اور اس کے فردی، اجتماعی اور اخلاقی آثار کو بیان کیا ہے۔ اب یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ امام زین العابدین ؑ نے اپنے پیروؤں کو اپنے عمل سے نماز کا حق ادا کرنے کے معنی بتائے ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ کے زیادہ نماز پڑھنے پر آپ کے عزیز رونے لگتے تھے۔

علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں فاطمہ بنت الحسین سے نقل کیا ہے کہ وہ جابر بن عبداللہ کے پاس گئیں اور فرمایا: اے رسول ؐ کے صحابی ! آپ لوگوں پر ہمارے کچھ حقوق ہیں، ان میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ جب ہم میں سے کسی کے کثرت عبادت سے جاں بحق ہونے کا خوف ہو تو ان سے گزارش کریں کہ اپنا خیال رکھیں اے جابر! علی بن الحسین کی پیشانی پر کثرت سجود سے گھٹہ پڑ گیا ہے اور پیروں پر ورم آگیا ہے، بدن لاغر ہوگیا ہے، ان سے کہئے کہ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

جابر آئے، حاضرخدمت ہونے کی اجازت طلب کی، اجازت ملی، داخل ہوئے دیکھا کہ آپ محراب عبادت میں تشریف فرما ہیں، امام اٹھے اور جابر کو اپنے برابر میں بٹھایا، مزاج پرسی کی، جابر نے عرض کی: میریسید و سردار کیا خدا نے جنت آپ کے لئے اور جہنم آپ کے دشمنوں ک یلئے نہیں بنایا ہے؟ پھر عبادت میں اتنی جانفشانی کیوں فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے رسول ؐ کے صحابی! کیا آپ نہیں جانتے کہ خدا نے رسولؐ کی گذشتہ اور آئندہ کی تمام فروگزاشتوں کو معاف کردیا تھا اس کے باوجود آپ نے عبادت میں جانفشانی نہیں چھوڑی تھی، اتنی عبادت کرتے تھے کہ آپ کے قدم مباک ورم کر آئے تھے اور جب آپ سے یات کہی گئی کہ خدا نے آپ کی گذشتہ اور آئندہ کی فروگذاشتوں کو معاف کردیا ہے تو آپ نے فرمایا: کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ جابر سمجھ گئے کہ میری بات کا آپ پر اثر نہیں ہوا ہے، عرض کی آپ اس خاندان سے ہیں کہ جس کے وسیلہ سے خدا بلاؤں کو دفع کرتا ہے اور آسمان و زمین کی حفاظت کرتا ہے۔ آپنے فرمایا: میں اپنے آباء واجداد کی اسی طرح اقتدا کرتا رہوں گا یہاں تک کہ ان سے ملاقات کروں جابر کہتے ہیں : میں نے انبیاء کی اولاد میں کسی کو علی بن الحسین ؑ کے مثل نہیں دیکھا۔

’’ طاؤس فقیہ‘‘ کہتے ہیں : میں نے دیکھا کہ امام زین العابدین ؑنماز عشا کے بعد سے سحر کے وقت تک طواف و عبادت میں مشغول رہے اور جب یہ دیکھا کہ طواف کرنے والے کم ہوگئے ہیں اور جگہ خالی ہوگئی ہے، سر کو آسمان کی طرف بلند کیا اور عرض کیا پروردگارا! ستارے کم ہوگئے ہیں اور کچھ دیر میں غروب ہوجائیں گے، آنکھیں سو چکی ہیں لیکن تیری حمت کے دروازے مانگنے والوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ پروردگارمیں تیری چوکھٹ پر آیا ہوں تاکہ تو اپنی رحمت کو میرے شامل حال کردے اور میری کوتاہیوں کو معاف کردے اور روز قیامت مجھے میرے جدر سولؐ کا چہرہ دکھا دے، اس کے بعد آپ نے گریہ کیا اور عرض کی: قسم تیرے عزت و جلال کی ! معصیت سے میں نے تیری مخالفت و نافرمانی کا ارادہ نہیں کیا تھا اور معصیت کرتے وقت میں تجھ سے اور تیرے سزا دینے سے بے خبر نہ تھا،لیکن میرا نفس مجھے فریب دینا چاہتا ہے اور تیری رحمت کا پردہ بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ پروردگار ! کون ہے جو مجھے تیرے عذاب سے نجات دلائے ؟ اے اللہ اگر مجھ سے تیرے نجات دینے کا سلسلہ منقطع ہوجائے تو پھر میں کس سے تمسک کروں ؟ افسوس کہ کل میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور جن کے نیک اعمال کا پلہ بھاری ہے ان سے کہا جائے تم جاؤ اور جن کے نیک اعمال کا پلہ ہلکا ہے ان سے کہا جائے کہ ٹھہرو! معبود! میں نہیں جانتا کہ میرا شمار ان لوگوں میں ہوگا کہ جن کے نیک اعمال کا پلہ بھاری ہے یا ان لوگوں میں ہوگا کہ جن کے نیک اعمال کا پلہ ہلکا ہے۔

اے اللہ جتنی میری عمر بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی میری خطائیں بڑھتی جاتی ہیں اب وقت آگیا ہے کہ میں توبہ کروں اس کے بعد آپ نے گریہ کیا اور یہ دو شعر پڑھے:

اتحرقنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کجنایتی۔

اے میری آخری امید کیا تو مجھے آگ میں جلائے گا؟ تو میری امید کا کیا ہوگا اور میری محبت کا کیا ہوگا؟ میں برے اعمال کے ساتھ تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں اور دنیا میں میری خطا کی سی کسی کی خطانہیں ہے۔

اس کے بعد گریہ کیا اور سجدہ میں گئے گویا آپ پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی، طاؤس کہتے ہیں میں آپ کے سرہانے پہنچا رونے لگا، میرے آنسو کے قطرے جب آپ کے رخ انور پر گرے تو فرمایا: کون ہے جو مجھے میرے رب کے ذکر سے روک رہا ہے؟ میں نے عرض کی : اے فرزند رسولؐ میں طاؤس ہوں آپ ایسا کیوں کررہے ہیں ؟ یہ کیسی آہ و زاری ہے ؟ ہم اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ آپ کی اقتداء کریں مولا آپ کے والد کا یہ مرتبہ ہے اور فاطمہ آپ کی ماں ہیں اور رسول ؐ آپ کے جد ہیں آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:میرے ماں، باپ اور جد کی بات چھوڑ دو خدا نے جنت طاعت گزار لوگوں کے لئے بنائی ہے خواہ و ہ حبشی غلام ہو اور جہنم معصیت کرنے والوں کے لئے بنیا ہے خواہ و ہ قرشی سید ہی ہو کیا تم نے خدا کا یہ قول نہیں سنا ہے کہ فرماتا ہے : فاذا۔۔۔۔۔۔۔۔۔یتسائلون۔

نماز اور گناہوں کی بخشش

نماز کے حق کے آخر میں امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : نماز میں تم خدا سے یہ طلب کرو کہ وہ تمہارے ان گناہوں کو بخش دے جوتمہیں گھیرے ہوئے ہیں اور تمہاری ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے اس بات کی طرف اشاہ کیا جاچکا ہے کہ نماز برائیوں اور بدکاریوں سے روکتی ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ رسول ؐ نماز کو کس طرح بخشش کا سبب قرار دیتے ہیں۔

ابو بصیر نے امام محمد باقر ؑ سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا: رسول ؐ نے فرمایاہے: اگر تم میں سے کسی کے گھر کے دروازے پر نہر بہہ رہی ہو اور وہ ہر روز اس میں پانچ مرتبہ نہائے تو کیا اس کے بدن پر میل باقی رہ سکتا ہے ؟ میں نے عرض کی : نہیں : فرمایا:نماز بھی بہتی ہوئی نہر ہی کی مانند ہے جب تم کوئی نماز پڑھتے ہوتو اس وقت وہ گناہ کا اثر ختم ہوجاتا ہے جو تم نے اس پہلی نماز کے درمیان میں کیا تھا۔

رسولؐ کی اس مثال میں گناہ اس صورت میں بخشا جاتا ہے کہ جس اس کے شرائط پر عمل کیا ہو۔ نہج البلاغہ میں امیر المومنین ؑ علی بن ابی طالب ؑ فرماتے ہیں :

آپ نے اپنے اصحاب کو نصیحت و وصیت کی : نماز کے پابند ہوجاؤ او اس کا خیال رکھو۔ زیادہ نماز پڑھو اور اس کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کرو کہ یہ مومنوں پ وقت کے ساتھ واجب ہوئی ہے : کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ جب اہل جہنم سے یہ سوال کیا جائے گا کہ تمہیں کس چیز نے جہنم میں پہنچا دیا؟ تو وہ کہیں گے : ہم نماز گزا نہیں تھے۔ اس کے بعد امام ؑ نے فرمایا: نماز انسان کے بدن سے اسی طرح گناہوں کو چھڑا دیتی ہے جس طرح درخت سے پتے گرتے ہیں اور نمازی کو اس طرح خطاؤں سے آزاد کردیتی ہے جس طرح غلام، غلامی سے آزاد ہوتا ہے۔

روزہ کا حق

لیکن روز کا حق یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ روزہ ایک پردہ ہے جو خدا نے تمہاری زبان، تمہارے کان،تمہاری آنکھ،تمہاری شرم گاہ اور تمہارے پیٹ پر ڈال دیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں آگ سے بچائے پھر اگر تم نے روز ہ نہیں چھوڑ دیا تو تم نے اپنے اوپر پڑے ہوئے خدا کے پردہ کو چاک کرڈالا، اسی طرح حدیث میں بھیبیان ہوا ہے، روزہ جہنم سے بچنے کے لئے تمہاری زرہ ہے۔

اگر اس پردہ سے تمہارے اعضاء و جوارح کو آرام ملتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں یہ امید ہوگئی ہے کہ تم پردے میں ہو اور اگ تم نے اس پردہ کا پاس و لحاظ نہ کیا تو تم نے اس کے پردے میں خلل و رخنہ ڈال دیا اور جب تم نے پردہ اٹھا دیا تو تمہاری نگاہ اس چیز کو دیکھے گی کہ جس کو تمہیں نہیں دیکھنا چاہیے وہ شہوت کو بھڑکانے والی ہے۔ وہ تمہیں خدا کی پناہ سے نکال دے گی اور جہاں پردہ چاک ہوجائے اور تم اس سے باہر نکل جاؤ تو وہاں تمہیں خود کو محفوظ نہیں سمجھنا چاہیے، قوت و طاقت خدا ہی کی ہے۔

’’ الطرف ‘‘ مصدر ہے اس کی جمع اطراف آتی ہے۔ یقال۔۔۔۔۔ والاسحیائ۔کہا جاتا ہے کہ اس نے آنکھ کے ایک گوشہ سے دیکھا اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے شرم و خوف سے آنکھ کا زیادہ حصہ بند رکھا اور باقی سے دیکھا۔

’’ الجنب مصدر ہے جس کے معنی پہلو اور طرف کے ہوتے ہیں، ہتے ہیں : قعدت الی جنب فلاں میں فلاں کے پہلو میں فلاں جانب میں بیٹھا۔

فلسفۂ روزہ امام زین العابدین ؑ کی نظر میں

امام زین العابدین ؑ نے اس عبادت کا فلسفہ،ضبط نفس اور گناہ سے پرہیز کرنا بیان کیا ہے کیونکہ زیادہ تر گناہ زبان، آنکھ، کان، شکم اور جنسی میلان کی آزادی کی وجہ سے ہوتے ہیں آپ نے روز ہ کو پردہ قرار دیا ہے کہ یہ اعضاء کو گناہ سے باز رکھتا ہے۔

قرآن مجیدنے بھی روزہ کا یہی عظیم فلسفہ بیان کیا ہے چنانچہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

یاایھا الذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تتقون۔

ایمان لانے والو تم پر روزے اسی طرح لکھے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والے لوگوں پر لکھے گئے تھے ہوسکتا ہے تم تقویٰ اختیار کرو۔

اس آیت میں روزہ لکھنے کے معنی روزہ کا واجب ہونا ہے اور اس آیت میں مومنوں کو بطور خاص اس لئے مخاطب قرار دیا ہے کہ ان کے اندر قبول کرنے کی صلاحیت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے روز ہ کا فلسفہ گناہ سے بچنے اور تقویٰ اختیار کرنے کو قرار دیا ہے۔

’’ صوم‘‘ کے معنی بار رہنے اور پرہیز کرنے کے ہیں، خاموشی کو اس لئے صوم کہا جاتا ہے کہ انسان بولنے سے پرہیز کرتا ہے۔ ان معنی میں صوم سورۂ مریم میں استعمال ہوا ہے۔ فاما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انسیا۔

پھر کسی انسان کو دیکھو تو (اشارہ سے ) کہدو کہ میں نے خدا کے لئے خاموشی کے روزہ کی نیت کرلی (اور جب تک میں روزہ سے ہو ں اس وقت تک میں ) ہرگز بات نہیں کرسکتی۔

روزہ اسلام سے پہلے

آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ تمہارے اوپر اسی طرح روزہ واجب کیاگیاہے جس طرح تم سے پہلے والوں لوگوں پر واجب کیا گیا تھا یہ کوئی نیا واجب نہیں ہے اور اس عبادت کی مشقت صرف مسلمانوں ہی پر نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ ان سے پہلے والے لوگوں پر بھی تھی رہی یہ بات کہ اس امت کا روزہ گذشتہ امتوں کے روزہ کی مانند ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا ان پر بھی اتنے ہی روزے واجب تھے یا کسی اور اعتبار سے ؟ کہتے ہیں کہ اس امت کے روزہ کو گذشتہ امتوں کے روزہ سے واجب ہونے کے لحاظ سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی تم پر انھیں دنوں میں روزہ واجب کیا گیا ہے جن میں تم سے پہلے والے لوگوں پر واجب تھا لیکن ہوسکتا ہے کہ وقت زمانہ اور عدد کے لحاظ سے تشبیہ دی ہو۔

روزہ تورات کی نظر میں :

تورات میں اس طرح بیان ہوا ہے: جب میں پتھر کی تختیاں لینے کے لئے پہاڑ پر آیا اور چالیس دن اور چالیس رات وہاں رہا تو نہ میں نے کھایا نہ پیا۔

روزہ انجیل کی نظر میں :

انجیل میں تحریر ہے: جبی عیسیٰ روح کے ذریعہ بیابان میں لے جائے گئے تاکہ ابلیس ان پر اپنا حربہ استعمال کر کے دیکھے چونکہ چالیس دن رات تک روزہ رکھا تھا لہٰذا بھوکے ہوگئے۔

عیسیٰ کے بعد حواریوں کاروزہ:

پھر انھوں نے کہا: کیا سبب ہے کہ یحییٰ کے شاگرد زیادہ روزہ رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں ایسے ہی فریسیان کے شاگر د بھی ہیں لیکن آپ کے شاگرد کھاتے، پیتے ہیں ؟ ! بلکہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں ان سے داماد چھین لیا جائے گا اس وقت وہ روزہ رکھیں گے۔

مذکورہ بالا عبارتیں تورات وانجیل میں آیات کے عنوان سے نقل ہوئی ہیں اور اس سے ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ بھی روزہ رکھتے تھے اور دونوں عبارتوں میں چالیس دن رات کی مدت بیان ہوئی ہے لیکن ان کے روزہ رکھنے کی کیا کیفیت تھی یہ معلوم نہیں ہے۔

قرآن میں روزہ کا زمانہ

معین دنوں، رمضان بھر، روزہ رکھو پھر جو تم میں سے میرض ہو یا سفر میں ہوتو وہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھے اور جو لوگ زحمت ومشقت کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکیں (جیسے بوڑھے، مردو عورت، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں ) تو ہر روزہ کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جو شخص زیادہ نیکی کرے گا تو اس کے لئے یہی بہتر ہے اور تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

’’ معدودات ‘‘ یعنی معین دن ؛ ان دنوں کے بارے میں دو نظرئیے ہیں :

۱۔ اس سے مراد ماہ رمضان نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر ماہ کے تین روزے ہیں ابن عباس کے بقول ان روزوں میں عاشورہ کا روزہ بھی شامل ہے، بعض لوگوں نے ان روزوں کو مستحب اوربعض نے واجب قرار دیا ہے لیکن یہ نظریہ رمضان کے سبب منسوخ ہوگیا۔

۲۔ دوسرا نظریہ، یہ ہے کہ اس سے مراد رمضان ہے۔ اس نظریہ کو اکثر مفسرین نے قبول کیا ہے اور کہا ہے: خدا نے روزہ کو بطور اجمال بیان کیا ہے کہ ایک روزہ ہے یا دو روزے ہیں۔ پھر فرماتا ہے: ایام معدودات، بیان کیا ہے کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ یہ نظریہ صحت مند ہے اور اس پر زیادہ تر مفسرین کا اتفاق ہے اور اس میں نسخ کی ضرورت بھی نہیں ہے، وہ مسافر اور مریض جو روزہ کے شرائط کے حامل نہیں ہیں ان کا روزہ نہ رکھنا آیت سے سمجھ میں آتا ہے اور خدا نے سفرومرض میں رمضان کے روزہ کی قضا رکھی ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: قال رسول اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الحضر۔ رسول ؐ نے فرمایا: سفر میں روزہ رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے وطن میں روزہ نہ رکھنے والا۔۔ اسی سے ملتی جلتی حدیث امام صادق ؑ سے منقول ہے:

روی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الحضر۔

ماہ رمضان میں سفر میں روزہ رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے وطن میں بے وزہ صاحب تفسیر مجمع البیان نے درج ذیل آیت کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے۔

عیاشی نے مرفوع طریقہ سے محمد بن مسلم سے نقل کیا ہے کہ امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا: رسول ؐ نہ سفر میں واجب روزہ رکھتے تھے اور نہ مستحب یہاں تک ’’ کراع الغمیم‘‘ میں نماز ظہر کے وقت یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے پانی کا ظرف طلب کیا اور اس سے پانی پیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ بھی پئیں ایک گروہ نے کہا: دن تو ختم ہورہا ہے اگر روزہ پورا کرلیا جاتا تو اچھا تھا۔ رسول اللہ ؐ نے انھیں عصاۃ یعنی گناہگار کا نام دیا چنانچہ وہ لوگ رسول ؐ کے زمانہ تک اسی نام سے پکارے گئے۔

رمضان کے معنی

رمضان ’’رمض‘‘ سے مشتق ہے، اس کے معنی ریگ زاروں پر سورج کی شدید دھوپ پڑنے کے ہیں، اسی لئے مضان کا نام رکھا گیا ہے کہ عرب مہینوں کا نام اس زمانہ کی مناسبت سے رکھتے تھے کہ جس موسم میں وہ مہینہ آتا تھا چونکہ رمضان شدید گرمی کے زمانہ میں آتا تھا اس لئے اس کو رمضان کہا گیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ رمضان خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے لہٰذا حدیث میں بیان ہوا ہے کہ رمضان نہ کہا کرو بلکہ مار رمضان کہا کرو۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس مہینہ کو اس لئے رمضان کہا گیا ہے کہ یہ گناہوں کو جلا دیتا ہے۔

روزہ اور صبر

قرآن مجید میں روزہ کو صبر بھی کہا گیا ہے۔ امام صادق ؑ سے خداوند عالم کے اس قول ’’ واستعینوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں صبر سے مراد روزہ ہے اور فرمایا: جب کسی شخص کے سامنے کوئی اہم چیز آئے اور اس کو کسی حادثہ کا سامنا ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہیے کہ خداوند عالم فرماتا ہے: روزہ سے مدد حاصل کرو۔

مرحوم مجلسی نے ’’ مراۃ العقول میں اس طرح تحریر کیا ہے: صبر یعنی حبس ‘‘ روزہ کو اس لئے صبر کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کو کھانے، پینے اور ہم بستری کی لذت سے روک دیتا ہے۔

احادیث میں روزہ کی فضیلت

اب ہم حدیث اور روایات کی کتابوں کے مطالعہ کی روشنی میں روزہ کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔

۱۔ امام محمد باقر ؑ نے زرارہ سے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے، نماز، زکواۃ، حج، روزہ اور ولایت۔

مجلسی نے مراۃ العقول میں اس حدیث کو ’’ حسن ‘‘ قرار دیا ہے اور ان پانچ چیزوں کو اسلام کی بنیاد قرا دینے کے سلسلہ میں لکھا ہے: شاید یہ اسلام کو کامل کرنے والی ہوں کیونکہ ان کے بغیر اسلام متزلزل ہے یا یہ کہ ان پانچ چیزوں پر ایمان رکھنا اسلام کا جز ہے۔ یا ایمان سے مراد اسلام ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ولایت سے امامت کا اعتقاد رکھنے کے علاوہ محبت مراد ہو۔

۲۔ اسمٰعیل بن ابی زیاد نے امام صادق ؑ سے اور انھوں نے اپنے آباء کرام سے نقل کیا ہے کہ رسول ؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

کیا میں تمہیں وہ چیز بتاؤں کہ اگر تم اسے انجام دو تو شیطان تم سے اتنی دور ہوجائے جتنا مشرق و مغرب میں فاصلہ ہے؟

سب عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ بتائیے : فرمایا: رمضان کا روزہ شیطان کے چہرہ کوکالا کر دیتا ہے۔

صدقہ دینا شیطان کی کمر توڑ دیتا ہے اور خدا کے لئے محبت کرنا اور نیک عمل انجام دیتے رہنا اس کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے اور استغفار کرنا اس کے دل کی رگ کو پھاڑ دیتا ہے اور ہر چیز کی ایک زکوٰۃ ہے اور بدن کی زکوٰۃ روزہ ہے۔

۳۔ ابن ابی عمیر نے امام صادق ؑ کے بعض اصحاب سے روایت کی ہے: خدا نے موسیٰ پر وحی نازل کی : مجھ سے مناجات کرنے میں کون چیز مانع ہوئی؟ عض کی: میرے منھ کی بو چونکہ میں روزہ رکھتا ہوں۔ ندا آئی اے موسیٰ ! میں روزہ دار کی بو کو مشک کی بو سے بہتر سمجھتا ہوں۔

مجلسیؒ لکھتے ہیں :سید داماد کہتے ہیں : خلوف،خ کے پیش کے ساتھ،منھ کی بو ہے پھر لکھتے ہیں کسی کو یہ نہیں کہنا چاہیے بوئیں ایسی چیزیں ہیں جو خدا تک پہنچنے کی لیاقت نہیں رکھتی ہیں یا خدا بو سے منزہ ہے چونکہ ہم کہتے ہیں : اطیب سے مراد قبل ہے یعنی زیادہ قبول ہونیوالی اور روزہ دار کے منھ کی بو کو خدا زیادہ قبول کرتا ہے یا یہ کہ اگر خدا کے لئے طیب کا تصور کیا جاسکتا ہے تو منھ کی بو اطیب ہے۔

۴۔ رسول ؐ نے فرمایا: روزہ ایسی سپر ہے جو انسان کو آتش جہنم سے بچاتی ہے۔

روزہ اور گناہوں کی بخشش

امامحمد باقر ؑ فرماتے ہیں کہ رسولؐ نے جابر بن عبداللہ سے فرمایا: اے جابر! یہ ماہ رمضان ہے جو شخص اس کے دنوں میں روزہ رکھے اور اس کی راتوں میں عبادت کرے اور اپنے پیٹ اور شرم گاہ کو حرام سے محفوظ رکھے اور زبان پر قابو رکھے وہ اپنے گناہوں سے اسی طرح نکل جاتا ہے جس طرح ماہ رمضان سے خارج ہوتا ہے۔

جابر نے عربض کی : اے اللہ کے رسول ؐ یہ حدیث کتنی دلچسپ ہے: رسول ؐ نے فرمایا: اے جابر اس کی شرطیں کتنی سخت ہیں اس حدیث میں انھیں چیزوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جن کو امام زین العابدین ؑ نے روزہ کے حق میں بیان فرمایا ہے یعنی زبان، شکم، شرم گاہ کو محفوظ رکھنا اور گناہوں کا بخشا جانا۔

آپ ہی نے دوسری حدیث میں بیان فرمایا ہے : روزہ دار ہر وقت عبادت میں رہتا ہے بشرطیکہ وہ غیبت نہ کرے خواہ بستر پر لیٹا ہی ہو۔

روزہ اور مالدار ونادار میں مساوات

صحیح حدیث میں امام صادق ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:روزہ کو خدا نے بس اس لئے واجب کیا ہے تاکہ مالدار،فقیر ونادار مساوی ہوجائیں کیونکہ اگر روزہ نہ ہو تو مالدار بھوک کا مزہ نہیں چکھ سکتا کہ اس کے احساسات بیدار ہو ں اور وہ فقیروں کو کھانا کھلائے کیونکہ ثروت مند جو چاہتا ہے وہ اس کے لئے فراہم ہوجاتا ہے، خدا نے یہ چاہا کہ اس بندوں کے درمیان مساوات ہو جائے اور امیر بھوک کا مزہ چکھیں تاکہ وہ کمزور لوگوں پر ترس کھائیں اور بھوکے پر رحم کریں۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ماہ رمضان کے روزہ کا ایک فلسفہ اس طبقاتی فاصلہ کو کم کرنا ہے جو امیر و غریب کے درمیان ہے، ثروت معاشرہ کو ہمیشہ امیر و غریب میں تقسیم کرتی ہے اور اکثر ایساہوتا ہے مالدار اورخوش حال طبقہ کو نادار و کمزور طبقہ کے لوگوں کی تکلیفوں کا احساس نہیں ہوتا ہے لیکن جب وہ روزہ رکھتے ہیں اور انھیں بھوک لگتی ہے اور شدید پیاس لگتی ہے تو ان کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے پھر وہ بھوکے کو سیر کرنے کی سوچتے ہیں اور اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ فقہی لحاظ سے کوئی مالدار اپنا روزہ فقیر و نادار سے نہیں رکھوا سکتا۔ اگر، خاکم دہن، اس عبادت کا کوئی اور فائدہ نہ ہوتو یہی کافی تھا۔

روزہ حضرت علی ؑ کی نظر میں

نہج البلاغہ میں حضرت علی ؑ نے مختلف لفظوں میں روزہ کے بارے میں بیان کیا ہے ہم یہاں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

ایک جگہ فرماتے ہیں : ’’ وزکوٰۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ‘‘ روزہ رکھنا بدن کی زکوٰۃ ہے۔آپ جانتے ہیں کہ زکوٰۃ کے معنی رشد ونمو کے بھی ہیں اور پاکیزگی و طہارت کے بھی اس جملہ میں آپ نے روزہ کا فلسفہ بدن کی سلامتی قرار دیا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں :’’ صوم۔۔۔۔۔۔‘‘ ماہ رمضان کا روزہ عقاب خدا سے بچنے کے لئے سپر ہے۔

برادران کے بارے میں مختلف انداز میں اظہار خیال فرماتے ہیں انھیں میں سے یہ بھی ہے:

خمص البطون من الصیام،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الذاھبون۔

ان کے پیٹ روزہ رکھنے کی وجہ سے لاغر اور ان کے لب دعا کرنے کے سبب مرجھائے اور بیدار رہنے کے باث ان کے رنگ زرد، ان جے چہروں پر خشوع کا بار ہے، یہ تھے میرے بھائی جو چلے گئے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں : ’’ والصیام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ روزہ خلوص کی آزمائش کے لئے ہے دوسرے کلمہ ٔ حکمت میں فرماتے ہیں : وقال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عید۔ کسی عید میں آپ نے فرمایا: عید تو بس اسی کی ہے جس کے روزہ کو خدا نے قبول کرلیا ہے اور جس کے قیام کی قدر کی گئی اور ہر وہ دن عید ہے جس میں گناہ نہ ہو۔

آپ نے ایک وصیت و نصیحت میں فرمایا: اوصیکم۔۔۔۔۔ والصیام۔ تم کو اور اپنے تمام بیٹوں کو وصیت کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ کہ ان آدمیوں یا گروہوں میں صلح کرادینا ایک سال کے نماز وزے سے افضل ہے جن میں دشمنی ہو۔

بے بہرہ روزہ دار

آپ ہی کا ارشاد ہے: کتنے ہی روزہ رکھنے والے ایسے ہیں جن کا روزہ بھوک اور پیاس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اور کتنے ہی شب بیداری کرنے والے فضول میں زحمت اٹھاتے ہیں، ذہین لوگوں کا سونا اور ان کا افطار کرنا کتنا اچھا ہے۔

خطبہ قاصعہ میں فرماتے ہیں : نماز، زکوٰۃ اور واجب روزہ رکھنے کے سبب سے خدا اپنے مومن بندوں کی حفاظت کرتا ہے چونکہ ان اعمال کے سبب ہاتھ، پیر گناہوں سے باز رہتے ہیں اور ان کے باعث آنکھیں جھکی رہتی ہیں اور نفس قابو میں رہتا ہے، دل جھکتا ہے اور وہ غروروتکبر سے پرہیز کرتے ہیں ان کی پیشانیاں سجدے کی وجہ سے خاک آلود اور سجدے کی حالت میں ان کے اعضاء کے زمین سے اتصال کی وجہ سے چھوٹے اور ان کے شکم روزہ رکھنے کی وجہ سے کمر سے چپک گئے ہیں۔

یہ تھے روزے سے متعلق جناب امیر المومنین کے بعض اقوال جو نہج البلاغہ میں مرقوم ہیں۔

آپ نے روزہ کے مثبت و منفی آثار کو بیان کیا ہے، اس کے مثبت آثار یہ ہیں، بدن کی زکوٰۃ، جہنم سے بچانے کے لئے سپر، آزمائش و امتحان، خلوص اور گناہوں کا برطرف ہونا اور اس کے منفی آثار میں سے یہ ہے کہ روزہ سے استفادہ نہ کرنا تو صرف بھوکا رہنا ہے۔

کہتے ہیں : ایک عرب اونٹ پر سوار چلا جارہا تھا بیابان میں ایک نماز گزار کے پاس سے گزرا،اسے اس کا قیام و قعود اور سجدہ بھلا معلوم ہوا چنانچہ وہ اونٹ سے اتر کر خلوص کے ساتھ اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے کہنے لگا، تم نے کتنی اچھی نماز پڑھی ہے؟ ! صحیح معنوں میں تم ہی نمازی ہو! اس نے جواب دیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں روزہ سے بھی ہوں اس کے روزہ، نماز نے اسے شتر سوار کو مطمئن کردیا تو اس نے اپنا اونٹ امانت کے طور پر اس نمازی کے پاس چھوڑ دیا اور کہیں چلا گیا جب واپس آیا تو دیکھا کہ نہ وہاں نمازی ہے نہ اونٹ اس وقت اس عرب نے انگشت بدنداں ہو کر یہ شعر پڑھا:

صلی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الصائم

اس کی نماز نے میرا دل جیت لیا اور اس کے روزہ نے میرے خلوص میں اضافہ کردیا۔ خبردار اپنے اونٹ کو ایسے نماز کے پاس نہ چھوڑنا جو روزہ دار ہو!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں صاحب جواہر شیخ الفقہا، آیت اللہ شیخ محمد حسن کے بیان کردہ روزے کے مثبت آثار کی طرف اشارہ کردیں موصوف اس حدیث ’’ الصوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بہ۔ کے ذیل میں لکھتے ہیں :

حدیث قدسی ہے ہ خداوند عالم فرماتا ہے روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دونگا یا یہ کہ میں ہی روزہ کی جزا ہوں صاحب جواہر فرماتے ہیں کہ روزے کے خدا سے مخصوص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ روزہ ایک مخفی چیز ہے جس کو خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا ہے۔ نماز و حج کے بالکل برخلاف کہ ان کو لوگ دیکھتے ہیں لیکن روزہ و خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا ہے شاید یہ اس لئے ہو کہ روزہ سے بدن کمزور ہوجاتا ہے اور عقل قوی ہوجاتی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ خدائی الطاف اور معارف ربانیہ تک پہنچ جاتا ہے اور اسے مطلوبہ کمال حاصل ہوجاتا ہے، نفس انسانی کی بہترین حالت ہے۔

روزہ کے آثار، غزالی کی نظر میں

ابو حامد لکھتے ہیں : روزہ خدا کے لئے ہے اور یہ مخصوص شرف کا حامل ہے اگرچہ ساری عبادتیں ایسی ہی ہیں لیکن روزہ میں د و چیزیں ہیں :

۱۔ روزہ بہت سی چیزوں سے باز رہنا اور ان سے دست کش ہونا ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ جس کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا جب کہ دیگر عبادات و طاعت کو لوگ دیکھتے ہیں مگر روزہ کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے کیونکہ یہ باطنی عمل ہے جو صبر کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

۲۔ تر ک، یہ خدا کے دشمن شیطان کے لئے کاری ضرب ہے۔ کیونکہ شیطان کا ہتھیار شہوتیں ہیں اور شہوتیں کھانے، پینے سے قوی ہوتی ہیں۔ رسول ؐ فرماتے ہیں :

شیطان انسان کے اندر اس طرح چلتا ہے جیسے بدن میں خون دوڑتا ہے۔

لہٰذا شیطان کے اس راستہ کو بھوک کے ذریعہ سے بند کردو جس کے ذریعہ وہ دوڑتا ہے۔

روزہ کی حالت میں بھوکا رہنا شیطان کی کمر توڑ دیتا ہے اور اس کے راستہ میں عظیم رکاوٹ ہے اور جو شخص شیطان کو شکست دیتا ہے وہ خدا کی مدد کرتا ہے اور خدا کی مدد اپنی طرف سے اسے توفیق دینا ہے ارشاد ہے:

ان تنصرواللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اقدامکم۔

جدوجہد اور کوشش بندے کی طرف سے اور اس کی جزا خدا کی طرف سے ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے: والذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔المحسنین۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے: ان اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بانفسھم۔

بیشک خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنی حالت نہیں بدلتی ہے۔

حالت بدلنے سے مراد شہوتوں کو مغلوب کرنا ہے۔ شہوت شیطان کی چراگاہ ہے چنانچہ جب تک چراگاہ ہری رہے گی اس وقت تک وہ اس سے نہیں نکلے گا اور جب تک انسان کے وجود میں شیطان کی آمدورفت رہے گی اس وقت تک انسان پر خدا کا جلال منکشف نہیں ہوگا لہٰذا رسول ؐ نے فرمایا:

لولا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ السماء۔

اگر انسان کے دل میں شیطانوں کی آمد ورفت نہ ہوتی تو وہ آسمانوں کے ملکوت کو دیکھتے۔

روزہ اور انسا ن کی تندرستی:

روزہ واجب ہونے کا فلسفہ انسان کے بدن کی صحت و تندرستی ہے انسان کے بدن کی صحت و تندرستی کوبیان کرنے سے پہلے ہم ان بیماریوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے کہ وہ کس طرح انسان کے بدن میں سرایت کرتی ہیں ؟ اس سلسلہ میں پہلے ہم اولیاء دین کے نظریہ کو بیان کریں گے:

۱۔ رسول اللہ نے فرمایا: ’’ المعدۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘

معدہ ہر بیماری کا گھر اور پرہیز ہر دوا کا، سر ہے۔

۲۔ امام موسیٰ کاظم ؑ فرماتے ہیں : الحمیۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پرہیز ہر دواکا لب لباب اور معدہ ہر بیماری کا گھر ہے۔

آپ ہی کا ارشاد ہے : لیس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الیہ۔

جس دوا کو بھی انسان پیتا ہے وہی دوسرے مرض کو پیدا کرتی ہے اور بدن کے لئے اس سے زیادہ مفید کوئی چیز نہیں ہے کہ اس کو ان غذاؤں سے باز رکھا جائے جن کی اسے احتیاج ہے۔

۳۔ رسول ؐ فرماتے ہیں : صوموا تصحوا۔ روزہ رکھو تاکہ صحت مند و تندرست ہوجاؤ۔

ان حدیثوں میں رسول ؐ اور ساتویں امام ؑ نے کہ جن کے علم کا سرچشمہ وحی ہے، صحت و تندرستی کا طریقہ بھی بتا دیا ہے اور مرض وسستی کا راستہ بھی اور معدہ کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ ہر مرض اس سے پیدا ہوتا ہے۔

۴۔اصبغ بن نباتہ کہتے ہیں : میں نے امیر المومنین ؑ سے سنا کہ اپنے فرزند حسن مجتبیٰ سے فرماتے ہیں : بیٹا ! کیا میں تمہیں چار ایسے کلمات بتاؤں کہ جن کے ذریعہ طبیب سے بے نیاز ہوجاؤ؟ عرض کی :ہاں اے امیر المومنین ؑ فرمایا جب بھوک لگے تو کھانا اور کچھ بھوک ہ جائے تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا، کھانے کو خوب چبا کر کھانا اور سونے سے پہلے بیت الخلاء جانا اگر تم ان باتوں پر عمل کروگے تو طبیب سے بے نیاز ہوجاؤ گے یعنی تمہیں کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اس حدیث میں بھی کھانے، معدہ، پرخوری، پرہیز اور خوب چبانے ہی کو موضو ع بنایا گیا ہے، مختصر یہ کہ مرض معدہ اور کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔

بدن سے نکلنے والی چیزوں میں نظم اور اس میں داخل ہونے والی چیزوں میں بے نظمی۔

گردے، جگروکلیجی اور کھال صادر کرنے والے نمائندے ہیں او یہ منظم طریقہ سے کام کرتے ہیں گردوں کا نظم دیکھئے کہ جب انسان رات میں سوتا ہے او رپیشاب کے لئے نہیں اٹھنا چاہتا تو گردے نیند کی شدت اور تاریکی کے لحاظ سے کم پیشاب بناتے ہیں ایسے ہی کھال او رجگر و کلیجہ بھی۔ لیکن بدن میں داخل ہونے والی چیزوں میں نظم نہیں ہے کبھی انسان پاک، صاف اور حلال غذا کی بجائے، گردوغبار،دھواں اور الکحل کو بدن میں انڈیل لیتا ہے اور نتیجہ میں (Metobol)کی ٹنکی میں شگاف پڑ جاتا ہے اور آدمی کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔

بدن ایک ذخیرہ کئے گئے ڈیم کی مانند ہے اور چونکہ کھائی جانے اور پی جانے والی بہت سی چیزیں بدن میں داخل ہوتی ہیں چنانچہ بہت سے اعضاء زہر کے اثر کو ختم کرنے کے لئے مستقل طور پر ام میں لگے رہتے ہیں لہٰذا بدن کو اس لئے کچھ فرصت ملنا چاہیے کہ وہ زہر کے اثر کو دفع کرنے کے لئے اس طرح کام کرسکے۔ اور یہ روزہ رکھنے اور بدن میں داخل ہونے والی غذا کی کیفیت اور اس کے مواد کی کمیت کے منظم کئے بغیر نہیں ہوسکتا۔

غدود

الف: ترشح کرنے والے غدود کا باہم اتصال کہ اگر ان میں سے کوئی کم و زیادہ ہوجاتا ہے تو دوسرے میں خلل پڑ جاتا ہے۔

ب: ہیپو فیز : ان غدود میں سے ہے کہ جوان اہم غدودوں سے متصل ہے جو اہمیت کے حامل ہیں خصوصاً گردے کے اوپر ی جھلی سے متصل ہے۔

ج: گردوں کے اوپر کیجھلی کے ترشحات بہت اہم ہیں وہ بدن کے تمام خلیوں میں کام آتے ہیں۔ خراب کھانا اور پرخوری اس پر برا اثر ڈالتی ہے۔

د: یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ لوزالمعدہ کے غدود گردوں کے اوپر جھلی کے ساتھ عمر کے دوام میں نہایت موثر ہیں۔

ھ: یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ لوزالمدہ اور گردوں کے اوپر ے حصہ میں قریبی ارتباط ہے۔

و: اس بات کی بھی تحقیق ہو چکی ہے کہ جیسے جیسے سن بڑھتا ہے لوزالمعدہ کے ہارمون کے ترشحات گھٹتے جاتے ہیں لیکن گردوں کے اوپر کے غدود ہارمون بناتے ہیں اس پر زمانہ کے گزرنے کا کوئی اثر نہیں ہوتاہے۔

ز: کچھ زمانہ پہلے بیوکیمیکل کے استاد ’’ ولاڈ یمیری نیکی تین‘‘ نے برسوں کے تجربہ کے بعد جنگلی چوہوں پر تجربہ کیا اور اس بات کو ثابت کیا کہ چوہوں کو بھوکا رکھ ک ان کی عمر کو دوگنا بڑھایا جاسکتا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ اگر گردوں کے اوپر کے غدودوں کو ایک مدت تک بھوکا رکھا جائے تو وہ لا محالہ اضافی ہارمون کو جو ہ عدم تعادل کا باعث ہوتا ہے، کھا جائیں گے۔ بنابرایں اگر سال بھر میں غلط کھانے وغیرہ کے سبب غدود کے ترشحات کا توازن بگڑ گیا ہوگا تو روزہ ان می ں ازسر نو تعادل و توازن پیدا کردے گا۔

بوٹالسم کی تحقیق:

یہ تصور کیا جاتا ہے کہ جو چیز ہم کھاتے ہیں وہ بدن کے لئے ایندھن کا کام دیتی ہے،اس کے لئے انرجی فراہم کرتی ہے او رباہر نکل جاتی ہے، لیکن یہ تصور صحیح نہیں ہے ایسا نہیں ہے کہ ہمارا بدن حوض وٹنکی کی مانند ہو کہ جس میں ایک طرف سے کھانا داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتی ہے۔ مثلاً ایک طرف سے شکر کا مواد داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے جو چیز داخل ہوتی ہے وہ تازہ ہوتی ہے اور تازہ ہونا چاہیے اور اسے جو خارج ہوتی ہے وہ باسی تلچھٹ ہوتی ہے اسے خارج ہونا چاہیے ایسے ہی اس دنیا کی مثال ہے کہ بچے آتے ہیں اور بوڑھے ہوجاتے ہیں جو آکسیجن آج بدن میں داخل ہوئی ہے وہ چھ مہینے بعد خارج ہوگئی اور جو کیلشیم آج بدن کے اندر گئی ہے وہ چھ ماہ بعد استعمال ہوگی، اگر کھانے میں ازٹ راڈیو اکتیونہ ہو تو کئی ہفتہ بعد دوا میں اس کو دیکھا جاتا ہے۔بنا برایں یہ توقع نہیں رہنا چاہیے کہ خراب و فاسد چیزیں اتنی جلد اپنی جگہ تازہ اور نئی چیزوں کو دے دیں گی۔ بلکہ اس کے لئے پے در پے کئی روز گزرتے ہیں۔

ڈاکٹر (ژان فروموزان ) کہتے ہیں : جگر کے کلیکوزن اور خون کے پروٹین او رچربی کا ذخیرہ جو کہ مرد میں ۳۰ فیصد اور عورت میں ۲۰ فیصد ہوتا ہے وہ بدن کے لئے ایک ماہ تک کافی ہے۔

ڈاکٹرالکسیس کارل اپنی کتاب ’’ انسان موجود ناشناختہ ‘‘ میں روزہ کے متعلق لکھتے ہیں : روزہ سے جگر میں موجود خون کی شکر صاف ہوجاتی ہے اور کھال کے نیچے جمع ہوجانے والی چربی کے ذخیرہ اور عضلات و غدود اور جگر کے خلیے آزاد ہوجاتے ہیں اوربدن کے کام آجاتے ہیں بقول’’ ژان فروموزان‘‘بعض عناصر بدن ک یلئے ایک ماہ کا ذخیرہ ہوتے ہیں ان تمام باتوں ک یپیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ روزہ رکھنے والا آدمی ایک ماہ کی مدت میں ایک نیا او رفرسودگی و سموم کی قید سے آزاد بدن حاصل کرلیتاہے۔

کیا روزہ سے معدہ میں زخم ہوتا ہے؟

غلط پروپیگنڈوں اور اسلام کے خلاف تبلیغات نے جہاں لوگوں کے ذہنوں میں اور شبہات پیدا کئے ہیں وہاں ایک شبہ یہ بھی پیدا کردیا ہے کہ روزہ رکھنے سے معدہ میں زخم ہوجاتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہنا چاہیے کہ اگر روزہ رکھنے سے معد ہ میں زخم ہوتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن قوموں میں روزہ نہیں رکھا جاتا ان میں زخم معدہ والوں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ کیوں ہے؟

ہاں اگر زخم معدہ میں صرف مسلمان ہی مبتلا ہوتے اور دوسری قوموں میں یہ مرض نہ ہوتا تو یہبات طے ہوجاتی کہ یہ مرض صرف مسلمانوں میں روزہ رکھنے والوں ہی کو لگتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ زخم معدہ والوں کی تعداد مغربی ممالک میں بڑھتی ہی جارہی ہے۔

دوسرے اگر روزہ معدہ میں زخم ہونے کا باعث ہوتا تو صدیوں سے دہرائے جانے والے اس عمل سے یہ مرض مسلمانوں میں ہی محدود نہ رہتا بلکہ یہ موروثی مرض بن جاتا اور نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

زخم معدہ کے اسباب :

۱۹۶۶؁ء میں ٹوکیو میں امراض معدہ کے بارے میں ایک عالمی کانفرس ہوئی تھی جس میں اس مرض کے پیدا کرنے والے اسباب کے بارے میں بحث و تمحیص ہوئی اس کانفرس میں شرکت کرنے والے ہر نمائندے نے اس مرض کو پیدا کرنے والے ان اسبا کو جو کہ اس کے ملک کے حفظان صحت او رطبی ادارہ کی تحقیقات کا نتیجہ تھے۔ کانفرس میں پیش کیا ان رپورٹوں میں سب سے زیادہ بیڑی،سگریٹ پینے، گرمغذاؤں کا زیادہ استعمال، زیادہ پانی پینے، مستقل طور پر چائے و قہوہ نوشی، کھٹی چیزوں کا حد سے زیادہ استمال اور ایسے مشروبات کو اس مرض کا سبب بتایا گیا تھا جن میں اسپرٹ شامل ہوتی ہے۔

ترکی کے نمائندہ نے ماہ رمضان کے بعد اس طرح اظہار خیال کیا : ماہ رمضان کے روزہ سے یہ مرض جلد پیدا ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ روزہ رکھنا اس مرض کو پیدا نہیں کرتا ہے لیکن جب اس مض کے اسباب پیدا ہوجاتے ہیں تو روزہ کی وجہ سے وہ جلد پیدا ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اسلام کے آئین میں یہ بات نظر آتی ہے کہ بیماریا جس شخص کو یہ علم ہوجائے کہ اگر وہ روزہ رکھے گا تو بیمار ہوجائے گا تو اس وقت اس پر روزہ واجب نہیں ہوتا بلکہ دوسرے وقت پر موقوف ہوجاتا ہے۔

روزہ طبی تھیوری

گونا گوں اور مختلف قسم کے کھانے کی وجہ سے کچھ کھانا ہاضمہ کی مشینری سے گزر جاتا ہے اور بدن کے خلیوں کے کام نہیں آتا ہے بلکہ کھال کے نیچے اور دل کے اطراف اور حساس جگہوں میں جمع ہوجاتا ہے اس سے بدن میں عفونت پیدا ہوجاتی ہے جس سے مختلف قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں عفونت و گندگی جتنی زیادہ ہوگی بیماری اتنی ہی شدید ہوگی اور نئے نام سے پہچانی جائے گی، ان بیماریوں کی اصل اور جڑ ایک ہی ہے، اور وہ ہے ایسے میکروب اور وائرس ہیں جو کثافت و گندگی ہی کے ماحول میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ بیماریوں کا علاج کرنے اور میروب کو ختم کرنے کے لئے سب سے پہلے کوڑے کرکٹ اور گندگی کو دور پھینکنا چاہیے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ بدن کو کھانا نہ دیں بلکہ پانی پر اکتفا کریں اس صورت میں بدن خود بخود عفونت اور اضافی مواد کو جڑوں سے باہر نکال کر استمال کرے گا اس وقت بیماری کی جڑ کٹ جائے گی اور بدن ان چیزوں کے ختم ہونے کی نشانی پیش کردے گا۔ اس طریقہ کا ایک امتیا ز یہ ہے کہ یہ طبیعی طور پر بیماریوں کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور بدن کا خود بخود علاج ہوجاتا ہے۔ جب کہ دوسری صورتوں میں میکروب کو مارنے کے لئے زہریلی دواؤں کا استعمال ہوتا ہے اور یہ دوائیں بدن کی سالم ساخت پر برا اثر ڈالتی ہیں اور بدن رد عمل کرتا ہے، لیکن روزہ میں ایسا نقصان نہیں ہے۔ اس طریقہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہایک ہی دف میں ساری بیماریوں کا علاج کردیتا ہے۔

یہ تھا بیماریوں کے علاج اور صحت پانے ک یباے میں اطباء کا نظریہ کہ جس کا اہم حصہ پرہیز کرنا اور روزہ رکھنا ہے بلکہ تما م طریقوں سے بہتر روزہ رکھنا ہے۔ یہ خداوند عالم نے، جو کہ انسان کا خالق ہے، اس لئے واجب کیا ہے تاکہ انسان اس عبادت کے ذریعہ عبودیت و بندگی کی روح حاصل کرنے کے علاوہ بدن کی صحت بھی حاصل کرے۔ اور گزشتہ صفحات میں آپ یہ ملاحظہ کرچکے ہیں کہ امام زین العابدین ؑ نے روزہ کے فلسفہ میں زیادہ اعضاء وجوارح کو قابو میں رکھنے اور ان کو اس راہ میں استعمال کرنے کو بیان کیا ہے کہ جس کو خدا نے بنایا ہے۔

روزہ کے اثرات اور اس کے باطنی شرائط

علماء نے روزے کے تین مراتب بیان کئے ہیں : عام روزہ خاص روزہ اور خاص الخاص روزہ عام روزہ شکم و شرم گاہ کو شہوتوں اور جنسی لذتوں سے محفوظ رکھنا، خاص روزہ آنکھ،کان، ہاتھ، پیر اور تمام اعضاء کو گناہسے بچانا امام صادق ؑ کی حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے:

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : جب تم روزہ رکھو تو تمہارے تمام اعضاء کان، آنکھ، بال او رکھال کا روزہ ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ تمہارا روزہ رکھنا اور نہ رکھنا یکساں نہ ہو، دوسری حدیث میں فرمایا: ریا کاری اور خادم کو اذیت دینا چھوڑ دو تمہارے چال چلن پر روزہ کا اثر ہونا چاہیے۔ رسول ؐ نے سنا کہ ایک روزہ دار ورت اپنی کنیز کو گالیاں دے رہی ہے۔ آنحضرت ؐ نے اس کے سامنے کھانا رکھا اور فرمایا: کھاؤ اس نے عرض کی : میں روزہ سے ہوں آپ نے فرمایا: تمہارا کیسا روزہ ہے ؟ جب کہ تم اپنی کنیز کو گالیاں دے رہی ہو روزہ صرف کھانے سے باز رہنا ہی نہیں ہے۔

لیکن خاص الخاص روزہ، دل کا پست اور ماسوا اللہ کے خیالات سے پرہیز کرنا ہے، یہ کھانے،پینے کی طرح مبطلات روزہ میں سے نہیں ہے بلکہ غیر خدا اور دنیوی امور کے بارے میں غور کرنا ہے، یہاں تک بعض دل والوں نے یہ کہہ دیا ہے : جو شخص اس چیز کے بارے میں سوچے گا جس سے وہ افطار کرتا ہے تو یہ اس کے لئے غلطی لکھی جاتی ہے کہ یہ خدا کے فضل پر ایمان کی کمزوری اور اس رزق کا یقین نہ ہونے کی بنا پر ہوتا ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ تیسرا مرتبہ، انبیاء و صدیقین کا اوران لوگوں کا ہے جو خدا کے مقرب ہیں خدا نے اپنے رسول ؐ سے فرمایا: قل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خدا کہو اور اس کے غیر کو چھوڑ دو۔ اسی چیز کی طرف امام صادق ؑ کی حدیثوں میں بیان ہوا ہے : انہ قال:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الآخر۔ یعنی روزہ دنیوی آفتوں کے لئے سپر ہے اور عذاب آخرت سے (بچانے کے لئے ) پردہ ہے۔

حج کا حق

حج کا حق یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہوناچاہیے کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف ایک سفر اور تمہارا اپنے گناہوں سے اس کی طرف فرار ہے حج کے وسیلہ سے تمہاری توبہ قبول ہوتی ہے اور تم اس واجب عمل کو انجام دیتے ہو کہ جس کو خدا نے تم پر واجب کیا ہے۔

لفظ حج کے معنی قصد کے ہیں اسی لئے راستہ اور جادہ کو ’’ محجۃ ‘‘ کہتے ہیں جو کہ ’’ مودۃ ‘‘ کے وزن پر ہے کیونکہ یہ انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے برہان کو بھی حجت کہتے ہیں کہ یہ بحث میں مقصد کو واضح کرتی ہے لیکن مخصوص مراسم کو اس لئے حج کہتے ہیں کہ جب انسان ان مراسم میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہوتا ہے تو وہ خانۂ خدا کی زیارت کا قصد کرتا ہے۔

کعبہ سب سے پہلا گھر

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

ان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عن العالمین۔

بیشک سب سے پہلے مکان جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے وہ بابرکت اور عالمین کے لئے ہدایت ہے اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں (ان ہی میں سے )مقام ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہوجائے وہ محفوظ ہے اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس کے گھر کا حج کرنا واجب ہے اگر اس کی راہ کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو کافر ہوگیا تو خدا عالمین سے بے نیاز ہے۔

یہ گھر توحید کا اولین مرکز ہے اور روئے زمین پر سب سے پہلا عبادت خانہ ہے اس سے پہلے پروردگار کی عبادت کے لئے کوئی مرکز نہیں تھا اسلامی تواریخ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خانہ کعبہ کو حضرت آدم نے تعمیر کیا تھا پھر اسے طوفان سے صدمہ پہنچا اس کے بعد جناب ابراہیم کے بدست اس کی تعمیر نو کی دلیل سورۂ ابراہیم کی ۳۷ ویں آیت ہے جناب ابراہیم کی زبانی نقل ہوا ہے:

ربنا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔المحرم۔

ہمارے پروردگار میں نے اپنی بعض ذریت کو بے آب وگیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے نزدیک چھوڑ دیا ہے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب ابرہیم اپنے شیر خوار بچے اور اس کی ماں کے ساتھ اس سر زمین پر پہنچے تو اس وقت مکہ کی سرزمین پر خانہ کعبہ کا وجود تھا۔

اسی طرح سورۂ بقرہ ۱۲۷ ویں آیت میں آیا ہے:

واذ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔العلیم۔

اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم و اسمٰعیل خانہ کعبہ کے پایوں کو بلند کررہے تھے اور کہہ رہے تھے ؛ پروردگار ہمارے اس عمل کو قبول فرما کہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیادیں موجود تھیں بس حضرت ابراہیم و اسمٰعیل نے اس کے پایوں کو بلند کیا ہے۔ حضرت امیر المومنین ؑ کے خطبۂ قاصعہ سے بھی یہ بات روشن ہوتی ہے:

کیا تم نہیں دیکھتے کہ خداوند عالم نے اولاد آدم میں سے اگلے والوں اور بعد والوں کو اس دنیا کے ایسے پتھروں کے ذریعہ آزمایا ہے جو نفع پہنچاتے ہیں نہ نقصان جو دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں پھر خدا نے اپنے گھر کو محترم قرار دیا۔۔۔۔۔ پھر آدم کی اولاد کو یہ حکم دیا کہ وہ اس کی طرف رخ کریں۔

مذکورہ آیتوں اور حضرت علی ؑ بن ابی طالب ؑ کے خطبہ سے اس تاریخ کی تائیدہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کی پہلی تعمیر حضرت آدم کے ہاتھ سے ہوئی تھی لیکن جب وہ طوفان نوح میں منہدم ہوگیا تو حضرت ابراہیم نے اس کی تجدید کی۔

خانۂ کعبہ کے امتیازات

قرآن مجید اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ یہ توحید کا اولین مرکز ہے پھر اس کے امتیازات کو بیان کرتا ہے:

۱۔یہ کہ وہ بابرکت ہے یعنی وہ مادی و معنوی اعتبار سے برکت والا اور فائدہ رساں ہے۔معنوی تو اس لحاظ سے کہ اس کے سایہ میں خصوصاً حج کے مراسم میں خدائی اور اتحادی جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ مادی نقطۂ نظر سے یہ زمین بے آب و گیاہ ہے اور طبیعی زاویہ نگاہ سے یہ کسی اعتبار سے بھی زندگی بس کرنے کے لائق نہیں ہے جب کہ یہ ہمیشہ سے ایک بارونق اور زندگی کے لئے مناسب رہی ہے یہاں تک کہ تجارت کے لئے بہترین شہر رہا ہے۔

۲۔ ’’ھدی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ سارے جہان والوں کے لئے ہدایت ہے یہاں تک کہ بت پرست بھی اس گھر کی ہدایت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

۳۔ ’’ آیات بینات‘‘ اس گھر میں توحید اور خداپرستی کی واضح نشانیاں موجود ہیں چنانچہ ان نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ان قوی دشمنوں کے مقابلہ میں ہمیشہ ایسے قائم و ثابت رہا ہے جو اسے نابود کرنا چاہتے تھے۔

زمزم، صفا ومروہ، رکن، حطیم، حجراسود اور حجر اسمٰعیل ہرایک عظیم اور دائمی یادداشتوں کو واضح کرنے والا ہے اور یہ سب خدا کی روشن نشانیاں ہیں خانہ کعبہ کی چاروں سمتوں میں سے ہر ایک سمت کو رکن کہتے ہیں اور خانہ کعبہ کے دروازہ اور حجر اسود کے درمیان جو فاصلہ ہے اسے حطیم کہتے ہیں یہاں بہت اژدھام ہوتا ہے۔ یہی آدم کی توبہ کا مقام ہے، حجر اسمٰعیل بھی ایک مخصوص جگہ ہے جو کعبہ کے شمال مغرب میں کمان نما بنی ہوئی ہے۔

ان روشن نشانیوں میں سے ایک مقام ابراہیم ہے جس کا بطور خاص آیت میں ذکر ہوا ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں کھڑے ہوکر خانہ کعبہ بنایا تھا یا عام لوگوں کو مراسم حج کے لئے دعوت دی تھی۔

۴۔یہ امن کی جگہ ہے ’’ جو اس میں داخل ہوگیا وہ محفوظ ہے ‘‘ حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد خدا سے اس شہر کی امنیت طلب کی اور عرض کی: میرے رب اسے محفوظ شہر قرار دے، خدا نے قوانین کے اعتبار سے بھی اسے محترم شمار کیا گیا ہے کہ اس میں ہر قسم کی جنگ و جدال منع ہے یہاں تک کہ اس سر زمین کے جانور بھی محفوظ ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ انھیں ستائے اور حرم میں شکار کرنا بھاری کفارہ کا سبب ہوتا ہے۔

حج ایک خدائی فریضہ

حج عمر بھر میں ہر اس مسلمان پر ایک مرتبہ واجب ہے جس میں واجب ہونے کے شرائط پائے جاتے ہوں اور اگر وہ اپنی حیات میں حج نہیں کرسکا تو اس کے مرنے کے بعد نائب کے ذریعہ اس کا واجب حج کرنا چاہیے، فقہا نے حج کے واجب ہونے کے لئے تین شرطیں رکھی ہیں، ۱۔ بدنی لحاظ سے استطاعت رکھتا ہو۔۲۔مالی اعتبار سے استطاعت رکھتا ہو، ۳۔ حج کا راستہ کھلا ہو، اگریہ تینوں شرط ہوں تو انسان پر واجب ہے کہ وہ حج بجالائے جو آیت ہم نے پہلے بیان کی ہے وہی حج کے واجب ہونے کو بیان کررہی ہے:

وللہ علی الناس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سبیلا۔

اس آیت میں تمام لوگوں کو حج کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور حج کو ایسا قرض قرار دیا گیا ہے جو تمام لوگوں کو ذمہ ہے کیونکہ یہ کہا گیا ہے :خدا کے لئے لوگوں کے ذمہ ہے اسی آیت سے دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حج مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ سب کا فریضہ ہے کیونکہ آیت میں لفظ ناس استعمال ہوا ہے اور مشہور قاعدہ ہے ’’ الکفار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بالاصول‘‘ یعنی جس طرح اصول دین پر عمل کرنا کافروں کا فریضہ ہے اسی طرح فروع دین پر عمل کرنا بھی ان کا فریضہہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج سب پر واجب ہے لیکن اس کے قبول ہونے کے لئے اسلام لانا شرط ہے۔اسلام قبول کئے بغیر اس کے عمل کی کوئی حقیقی قیمت نہیں رہے گی بلکہ ممکن ہے شبہ میں بھی مبتلا ہوجائے۔

ابن ابی العوجاء اور اس کی بے بنیاد باتیں :

یہ کافر الحاد میں مشہور تھا،بے باک اور بد زبان خطیب تھا اس کے زمانہ کے اکثر صاحبان علم اس سے بچتے تھے، حج کے زمانہ میں ایک دن ابن ابی العوجاء اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ حاجیوں کے اعمال کو دیکھ رہا تھا۔ امام صادق ؑ بھی مسجد الحرام کے ایک گوشہ میں تشریف فرما تھے شیعہ آپ کی خدمت میں شرفیاب ہوتے اور مسائل دریافت کرتے تھے، ابن ابی العوجاء کے دوستوں نے کہا: جعفر بن محمد سے بحث کرنے کے لئے یہ بہترین موقع ہے۔ اس نے کہا: یہی کیا جائے۔

وہ امام صادق ؑ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا : اے ابو عبداللہ یہ بزم و مجلسیں امانت ہیں اس طرح امام صادق ؑ سے امن مانگ رہا تھا تاکہ اس کی کفر آمیز باتوں سے لوگوں کا غیظ و غضب نہ بھڑکے جس شخص کے سینہ میں بلغم پھنسا ہو اور اس سے اسے اذیت ہورہی ہو وہ کھانسی کے ذریعہ اسے باہر نکال کر پھینکنے پر مجبور ہے( یعنی جس شخص کے دل میں کوئی شبہ ہوتا ہے جو اسے بے چین کرتا ہے وہ مجبور ہے کہ اپنے شبہ کا اظہار کرے اور سوال کرے) اجازت ہے سوال کروں ؟ امام ؑ نے اسے سوال کرنے کی اجازت دی اس نے بے حیائی کے ساتھ کہا:

اس روندے ہوئے خرمن اور اس پتھر سے تم کب تک پناہ لیتے رہو گے اور گارے اور پتھر سے بنے ہوئے اس گھر کی کب تک پرستش کرتے رہو گے اور بھاگے ہوئے اونٹ کی مانند کب تک اس گھر کے چاروں طرف ہرولہ کرتے رہوگے؟ ! جو بھی اس کے بارے میں غوروفکر کرے گا اسے معلوم ہوجائے گا کہ اس کا حکم دینے والا عقلمند ہے نہ صاحب نظر جواب دیجئے کہ آپ اس مذہب کے راس و رئیس ہیں اور آپ کے آباء اجداد اس کے بانی اور محافظ ہیں۔

یہ ہیں اس کے جملے جن سے اس کے باطن کی خباثت آشکار ہے یہ مادی انسان ہر چیز کو مادہ کی عینک سے دیکھتا ہے یقینا برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ امام ؑ نے اس کا جواب دیا:

بیشک جس کو خدا گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کے دل کو اندھا بنا دیتا ہے او ر جس سے حقائق کو سمجھنے کی توفیق چھین لیتا ہے تو شیطان اس کا ولی و سرپرست بن جاتا ہے اور اسے ہلاکت کے گھاٹ اتار دیتا ہے کہ جہاں سے وہ کبھی نہیں نکل سکے گا۔

اس کے بعد امام ؑ نے فرمایا: اس گھر کو خدا نے بندوں کی آزمائش کا وسیلہ قرار دیا ہے اور انھیں اس کی زیارت کا حکم دیا ہے تاکہ امر عبادت میں خلوص و تسلیم کی روش کا معیار قرار پائے، یہ گھر پیغمبروں کی قیام گاہ اور نمازیوں کا قبلہ ہے۔ نہ سنگ پرستی مقصد ہے اور نہ اس گھر کی عبادت بلکہ معبود برحق خدا ہے جو آدمیوں کے جسم و جان کا خالق ہے۔

حج، انسان کے روحی سفر کی مکمل نمائش

اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ حج اور تمام عبادت کے اعمال کی صورت در حقیقت انبیاء و اولیائے خدا کے روحی و معنوی مقامات و مراتب کی تشریح ہے سالکین الی اللہ کے روحانی سیروسفر کا ایک تجزیہ کہ انھوں نے عبودیت و بندگی کی منزلوں کو کس طرح طے کیا آخر کار قرب ربوبی کے مقام پر پہنچے۔ واضح ہے کہ حقیقت عبادت، خدا کی طرف روح انسان کا سفر ہے رسول ؐ فرماتے ہیں۔

نماز، حج، طواف اور دوسرے مناسک کو انجام دینا خدا کو یاد کرنے کے لئے واجب کیا گیا ہے۔ پس جب تمہارا دل اصل مقصود مطلوب خدا کی یاد سے اور اس کے خوف و خشیت سے خالی ہوتو زبان کی حرکت اور بدن کے اعمال بجالانے سے کیا فائدہ ہوگا؟

بنابرایں،اعمال حج، انسان کامل کی منظم روحانی سیر کا نمائندہ ہیں جو نپے، تلے انداز میں عبودیت کے مراحل کو طے کرتا ہے اور خود کو مادی رشتوں اور دنیا کی سج دھج سے آزاد کرالیتا ہے اور نفس کی تاریکیوں کے غار سے خود کو کھینچ لاتا ہے اور عالم ربوبیت کے نور میں مستغرق ہوجاتا ہے۔

حقیقی حج، ایک سفر ہے جو روح میں ہوتا ہے۔ ایک سیروتبدیلی ہے جو نفس کے جوہر میں ہوتی ہے، حج ناقص کا کامل میں تبدیل ہونا ہے۔ قوہ سے فعل میں آنا ہے، خام کو پختہ کرنا ہے اور ایک دھات کو دوسری دھات میں تبدیل کرنا ہے یہ کوئی کھیل نہیں ہے جیسا کہ بعض نادانوں کا خیال ہے ان کے بچکانہ افکاروخیالات کجا اور ساکلین الی اللہ کی لرزہ براندام کرنے والی سیرو تبدیلی کجا۔

مالک ابن انس کہتے ہیں : ایک سال میں امام صادق ؑ کے ہمراہ حج کرنے گیا، جب آپ احرام کی حالت میں اپنی سوار پر سوار تھے تو آپ نے ہر چند چاہا کہ لبیک کہیں لیکن آپ کی آواز گلے ہی میں رندھ کر رہ گئی آپ سواری سے نیچے اتر آئے میں نے عرض کی : فرزند رسول ؐ ! لبیک کہئے آخر لبیک کہنا ہے فرمایا:

اے عامر کے بیٹے ! میں ’’لبیک اللھم لبیک ‘‘ کہنے کی کیسے جرأت کروں جب کہ مجھے خوف ہے کہ خدا کی طرف سے یہ ندا نہ آئے کہ میں تمہیں قبول نہیں کرتا ہوں۔

اگر انسان اپنے جوہر نفس کو محرم بنالے اور خانۂ کعبہ کے پاس جائے، حجر اسود کو ہاتھ سے مس کرے، اس کا دل عرفات کے پہاڑ میں مقیم ہو اور اس کی روح مشعر الحرام میں واصل خدا ہوجائے اور یقین کی چھری سے وہ خواہش نفس کے مینڈھے کا سر کاٹ دے اور واپسی پر وہ آسمانی لعل و یاقوت بن گیا ہوتو وہ حاجی ہے ورنہ:

حاجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ می برد

حج اور گناہوں کی بخشش

امام زین العابدین ؑ حج کے حق کے بارے میں فرماتے ہیں : ’’ وفرار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ حج گناہوں سے بھاگ کر خدا کے قرب میں پنا ہ لینا ہے جب وہ حج کرکے واپس آتا ہے تو وہ گناہوں سے ایسے ہی پاک ہوجاتا ہے جیسے روزولادت تھا، گناہوں کا بھاری بوجھ اس سے اتر جاتا ہے اس موضوع کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

امام صادق ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک بادیہ نشین نے رسول ؐ سے ملاقات کی اور عرض کی اے اللہ کے رسولؐ! میں حج کے ارادہ سے نکلا تھا لیکن کچھ رکاوٹیں پیش آجانے کی وجہ سے حج چھوٹ گیا میں مالدار آدمی ہوں مجھے حکم دیجئے کہ میں ایسا کام انجام دوں جس سے خدا مجھے اتنا ہی اجروثواب طا کرے جتنا حج کرنے والے کو عطا کرتا ہے رسولؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کوہ ابوقبیس کو دیکھو! اگر یہ پہاڑ سرخ سونے کا ہوتا اور تمہاری ملکیت میں ہوتا اور تم اس کو راہ خدا میں خرچ کردیتے تب بھی تمہیں اتنا ثواب نہ ملتا جتنا خدا حج کرنے والے کو عطا کرتا ہے۔ پھر فرمایا: جب حاجی حج کے لئے تیاری کرتا ہے تو وہ جو چیز اٹھاتا اور رکھتا ہے خدا اس کے لئے نیکی لکھتا ہے اور اس کے دس گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور خدا کے نزدیک اس کے دس درجے بلند ہوتے ہیں اور جب وہ سواری پر سوار ہوتا ہے اور وہ جو قدم اٹھاتا ہے اور زمین پر رکھتا ہے تو خدا ہر ایک کے عوض مذکورہ اجر عطا کرتا ہے اور جب وہ خانہ کعبہ کا طواف کرتا ہے تو گناہوں سے نکلتا ہے اور رمی جمرات کرتا ہے تو گناہوں سے خارج ہوتا ہے راوی کہتا ہے کہ اسی طرح رسول ؐ نے ایک ایک موقف کو شمار کرایا اور فرمایا: جب وہ موقف میں کھڑا ہوتا ہے تو اپنے گناہوں سے خارج ہوتا ہے پھر فرمایا: تمہیں اتنا ثواب کہاں سے مل جائے گا جتنا حاجی کو ملتا ہے ؟ امام جعفر صادق ؑ فرماتے ہیں :حج سے واپس آنے کے بعد حاجی کو کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا ہے اور اس کی نیکیاں لکھی جاتی رہتی ہیں مگر یہ کہ وہ کسی بڑے گناہ کا مرتکب ہو۔

حج اور خدا کے غیر سے سوال

امام زین العابدین ؑ نے سنا کہ ایک سائل لوگوں سے مانگ رہا ہے فرمایا: تمہارے اوپر افسوس ہے تم اس جگہ بھی خدا کے غیر سے مانگ رہے ہو؟ حالانکہ آج تو خدا کی رحمت ہر ایک کو شامل ہے امید ہے کہ اس کو بھی خدا کی رحمت نصیب ہوگی جو پہاڑوں کے پیٹ میں ہے اور وہ خوش بخت ہوجائے گا۔

مرحوم فیض اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں : ہر چیز کی سعادت و خوش بختی اسی کے شایان شان ہوتی ہے بنا برایں جو پہاڑوں کے پیٹ کے اند ر ہے اس کی سعادت کا مطلب یہ ہو کہ وہ جماد سے نبات بن جائے اور پے در پے تبدیلیوں سے نطفہ بن جائے اور اس سے سعید و نیک بخت انسان بن جائے دوسری روایت میں جو کہ مستدرک میں نقل ہوئی ہے الجبال کے بجائے الخبالیٰ آیا ہے جس کے معنی حاملہ عورتیں ہیں، اس صورت میں حدیث کے معنی زیادہ روشن ہو جائیں گے۔ ایک شخص نے مسجد الحرام میں امام صادق ؑ سے دریافت کیا: سب سے بڑا گناہ گار کون ہے؟ فرمایا: جو ان دونوں موقفوں عرفہ و مزدلفہ، میں ٹھہرے اور ان دونوں پہاڑوں، صفا ومروہ، کے درمیان سعی کرے اور اس گھر (کعبہ) کا طواف کرے اور مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھے اور ان تمام اعمال کے باوجود وہ یہ گمان کرے کہ خدا نے اس کو نہیں بخشا ہے یہ شخص سب سے بڑا گناہ گار ہے۔

(یعنی خدا کے بارے میں بدگمانی کرنا اور اس کی رحمت سے مایوس ہونا سب سے بڑا گناہ ہے)

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : کسی گاؤں آبادی کا جو مومن بھی عرفات میں ٹھہرتا ہے خدا اس آبادی کے تمام مومنوں کو بخش دیتا ہے اور جس مومن خاندان کا کوئی شخص عرفات میں وقوف کرتا ہے خدا اس گھر کے تمام مومنوں کو بخش دیتا ہے۔

البتہ یہ بات یاد رہے کہ ہر حدیث میں ایمان کی قید لگا دی گئی ہے اور ایمان تقویٰ کے ظاہر ہونے کا سرچشمہ ہے اس سے بے ایمان افراد خارج ہیں۔

حج کی دعوت، انسان کے اوپر خدا کا احسان:

خداوند متعال انسان پر احسان کرنے اور اس کے سر پر تاج کرامت رکھنے کے لئے اس کی سوئی ہوئی فطرت کو بیدار کرتا ہے اور اس کے اندر حق شناسی اور شکر گزاری کے جذبہ کو ابھارتا ہے اور اس کو اپنے گھر کے حج کی دعوت دیتا ہے۔’’ وللہ۔۔۔۔۔۔۔۔سبیلا‘‘

خدا کے لئے لوگوں پر خانۂ کعبہ کاحج فرض کیا گیا ہے تاکہ وہ استطاعت کی صورت میں حج کریں یعنی تم انسان ہو اور فطرتا حق شناس ہو، میں تمہارا خالق و ازق اور تمہارا منعم ہوں، لہٰذا تمہارے اوپر میرا یہ حق ہے کہ تم شکر گزاری کے عنوان سے میرے گھر آؤ تاکہ تمہاری آدمیت کا شرف محفوظ رہے۔

حج کی حیرت انگیز برکتیں

خانۂ کعبہ کے زائر وحاجی کوخدا کی طرف سے جو برکتیں اور بخششیں ملتی ہیں ان کی عظمت کو سمجھنے کے لئے اس کے ثواب کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو روایات و احادیث میں بیان ہوا ہے۔(ثواب سے متعلق کچھ حدیثیں ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں )سعد اسکاف کہتے ہیں : میں نے امام باقر ؑ کو فرماتے ہوئے سنا : جو شخص عازم حج ہوتا ہے اور حج کی تیاری کرتا ہے اور حج کی تیاری کے لئے جو قدم اٹھاتا ہے خدا اس کے عوض دس نیکیاں اور حسنہ لکھتا ہے اور اس کے دس گناہوں کو محو کرتا ہے اور اس کے دس درجات کو بلند کرتا ہے یہاں تک کہ وہ تیاری سے فارغ ہوجاتا ہے اور حج کے لئے گھر سے نکلتا ہے اور اس سے عظیم فائدہ حاصل کرتا ہے۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : واپس آنے والے حاجیوں کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو آگ و جہنم سے نجات پاتا ہے، دوسرا گناہوں سے اس طرح خارج ہوجاتا ہے جس طرح وہ پیدائش کے وقت گناہوں سے پاک تھا، تیسرا صحیح و سالم اپنے اہل و عیال کے پاس لوٹ آتا ہے یہ معمولی ثواب ہے جو حج کرنے والے کو نصیب ہوتا ہے۔

فرق کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ ان کی نیت میں اختلاف ہے اور یہ رب البیت کی معرفت کے مدارج میں اور عبادت کے اسرار و لطائف کے درک کرنے میں اور حج کے مناسک کے روح پر اثر انداز ہونے میں مختلف ہیں۔

صدقے کا حق

صدقہ کا حق، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تمہارے پروردگار کے پاس تمہارا ذخیرہ اور امانت ہے کہ جس کے لئے گواہ لانے کی ضرورت نہیں ہے اور جب تمہیں یہ معلوم ہوگیا تو جو صدقہ تم خفیہ طور پر دو گے اس سے تم اس صدقہ کی بہ نسبت زیادہ مطمئن ہو گے جو تم کھلم کھلا دیتے ہو تمہارے شایان شان یہی ہے کہ جو تم نے آشکارا طور پر کیا ہے اب اسے چھپا کر انجام دو بہر حال تم اس طرح صدقہ دو کہ اسے کان سنیں اور نہ آنکھیں دیکھیں بلکہ سر بستہ طور پ دو تمہیں اس پر یہ اعتماد ہے کہ وہ تمہای طرف پلٹ آئے گا اس شخص کی مانند نہ ہوجاؤ کہ جو صدقہ کے واپس لوٹنے پر اعتماد نہیں رکھتا ہے۔

پھر اپنے صدقہ کے ذریعہ کسی پر احسان نہ جتاؤ کیونکہ وہ تمہارا ہی ہے اگر اس پر احسان جتاؤ گے تو تم محفوظ نہیں رہو گے، بلکہ اسی بدحالی میں مبتلا ہوگے جس میں وہ شخص مبتلا ہے جس پر تم نے احسان جتایا ہے کیونکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم نے یہ نہیں چاہا کہ وہ مال تمہارا رہے اگر تم یہ چاہتے کہ وہ تمہارے لئے باقی رہے تو کسی پر احسان نہ جتاتے، طاقت صرف خدا کی ہے۔

’’ ہجن ‘‘ کے معنی فرومایہ اور پست ہوجانا ہیں ’’ ہجن الامر ‘‘ اس نے اس میں عیب نکالا اور اسے برا سمجھا۔

امام زین العابدین ؑ صدقہ کے حق کے بارے میں تین اہم مطالب کی طرف اشارہ فرماتے ہیں :

۱۔ صدقہ محفوظ شدہ ذخیرہ ہے وہ نابودہونے والا نہیں ہے۔ درحقیقت یہ نظریہ ختم ہوجاتا ہے کہ مال صدقہ دینے والے کے ہاتھ سے نکل گیا اور نابود و برباد ہوگیا بلکہ اس کے برخلاف دنیا سے حصہ لینے کے لئے ایک تشویق ہے قرآن کہتا ہے: ولا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے اسے فراموش نہ کرو۔

اس کا بہترین مصداق،صدقہ ہے وہ جاوداں اور باقی رہنے والا ہے، فانی نہیں ہے۔

۲۔ پوشیدہ طور پر دیا جانے والا صدقہ آشکار طور پر دیئے جانے والے صدقہ سے اہم ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جو صدقہ کھلم کھلا دیا جاتا ہے اس میں ریا اور تکبر کا شائبہ ہوتا ہے اور صدقہ لینے والا بھی دیکھنے والوں کی نظر میں حقیر ہوجاتا ہے۔

۳۔ صدقہ کے ساتھ احسان نہ ہو کہ احسان سے صدقہ کا اثر ختم ہوجاتا ہے یہ بات ہم بعد میں بیان کریں گے کہ صدقہ پہلے خدا کے ہاتھ میں پہنچتا ہے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ صدقہ دینے والے کے ذہن میں پہلے یہ بات آتی ہے کہ مالک حقیقی خدا ہے اور یہ صدقہ دینے والا صرف ایک وسیلہ ہے لہٰذا صدقہ دینے سے اس کے اندر عبودیت و بندگی کی روح پیدا ہوتی ہے۔

صدقہ قرآن کی نظر میں

صدقہ کے بارے میں جو کچھ امام زین العابدین ؑ نے فرمایا ہے وہی مختلف مثالوں اور تشبیہات کے ساتھ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے یہاں ہم ان میں سے بعض آیتوں کو بیان کرتے ہیں لیکن ان آیات کے بیان کرنے سے پہلے ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ صدقہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کہ انسان اپنے مال میں سے قربۃ الی اللہ دیتا ہے یہ زکوٰۃ سے اعم ہے صدقہ واجب کو بھی کہتے ہیں اور مستحب کو بھی لیکن زکوٰۃ صرف واجب کے لئے ہے۔

سورۂ بقرہ میں خداوند عالم فرماتا ہے:

مثل الذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ واسع علیم۔

جو لوگ اپنے اموال کو راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو ان کے اس مال کی مثال اس دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں نکلتی ہیں اور ہر بالی میں سودانے ہوتے ہیں اور خداوند عالم وسعت دینے والااور جاننے والا ہے۔

اس آیت میں دانہ اور اس کے اگنے کی مثال بیان کی گئی ہے اور صدقہ کی افزائش و نمو کو بیان کیا گیا ہے اور رہ خدا میں خرچ کرنے والوں کو پر برکت دانوں سے جو تشبیہ دی ہے وہ بڑی حسین و عمیق تشبیہ ہے۔

قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہر انسان کا عمل اس کے وجود کا پرتو ہے جتنی اس کے عمل میں وسعت پیدا ہوگی اتنا ہی اس کا وجود و سعت پذیر ہوگا ایسا نہیں ہے کہ انسان کا عمل اس کی قوت اور جسمی مواد کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ مثل درحقیقت ثابت شدہ یا مفروض حصہ ہے جو دوسری چیز سے مشابہت رکھتا ہے اور اس مثل کو اس لء یلایا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریہ مخاطب کے ذہن کو اس چیز کے کمال کی طرف متوجہ کیا جائے جس کے لئے مثال لائی گئی ہے اس آیت میں انفاق کرنے والوں کی مثال اس شخص سے دی گئی ہے جو ایک دانہ بوئے اور اس پر سات بالیاں لگیں اور ہر بالی میں سودانے ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ اس قصہ کی حقیقت نہ ہو اور فرضی و خیالی ہو۔ ہر آیت میں فی سبیل اللہ سے مراد وہ چیز ہے جو خدا کی رضا کا باعث ہوتی ہے۔

صدقہ، سماجی مشکلات کا حل

سماج کی ایک بہت بڑی مشکل کہ جس سے انسان ہمیشہ دوچار رہا ہے اور اس زمانہ میں صنعتی ترقی کے سبب اس شکل میں اور زیادہ شدت پیدا ہوگئی ہے اور طبقاتی فاصلہ اور زیادہ ہوگیا ہے ایک طرف فقر و تنگدستی ہے دوسری طرف ثروت اندوزی ہے واضح ہے کہ جس معاشرہ کا ایک حصہ ثروت مندی اور دوسرا حصہ فقروناداری پر استوار ہو اس میں دوام و ثبات نہیں ہوسکتا اور وہ حقیقی سعادت سے ہم کنار نہیں ہوسکتا ایسے معاشرہ میں ہمیشہ اضطراب و بے چینی اور جنگ و جدال بپا رہے گا۔

قرآن مجید کی آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا ایک مقصد یہ ہے کہ سماجی ناانصافیوں کی وجہ سے ثروت مند اور نادار طبقہ میں جو اختلافات رونما ہوتے ہیں انھیں برطرف کیا جائے اور ان لوگوں کی زندگی کی سطح کو بلند کیا جائے جو اپنی ضرورتوں کو دوسروں کی مدد کے بغیر پورا نہیں کرسکتے، کم ازکم ان کے پاس روز مرہ کے استعمال کی چیزیں تو ہوں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے اسلام نے سود خوری کو مطلق طور پر حرام قرار دیا اور اسلامی مالیات، زکوٰۃ و خمس دینے کو واجب کیا ہے اور انفاق، وقف، قرض الحسنہ اور مختلف طریقوں سے مالی مدد کرنے کی تشویق کی۔

انفاق کے گونا گوں محرکات و نتائج:

درج ذیل آیات میں صدقہ و انفاق کے گونا گوں نتائج کو تشبیہات اور مثالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے:

یاایھا الذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الکافرین۔

ایمان والو! اپنے صدقوں اور بخششوں کو احسان جتا کر اور آزار پہنچا کر برباد نہ کرو اس شخص کی مانند کہ جو لوگوں کو دکھا کر انفاق کرتا ہے او ر خدا و روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے کام کی مثال اس پتھر کی سی ہے کہ جس پر گرد پڑی ہو اور اس پر شدید بارش پڑ جائے (جس سے وہ گرد دھل جائے ) اور پتھر صاف ہوجائے وہ جوکام انجام دیتے ہیں اس کا انھیں کوئی صلہ نہیں ملے گا اور خدا کافروں کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔

’’صفوان ‘‘ جمع ہے اس کا مفرد صفوانہ ہے یعنی صاف پتھر ’’ وابل ‘‘ موٹی بوند والی شدید بارش کو کہتے ہیں ’’ صلدا‘‘ کے معنی صاف پتھر ہیں۔

ایک مضبوط پتھر فرض کریں کہ جس کے اوپر گردوخاک کی ہلکی پرت جم گئی ہو، اس خاک پر بیج بکھرے دیئے جائیں جو ہوا اور سورج کی دھوپ کی زد میں ہیں پھر اس پر موٹی بوند والی بارش پڑ جائے واضح ہے کہ شدید باش اس پتھر پر پڑی ہوئی گرد کو بیج سمیت بہا لے جائے گی اور سخت پتھر اپنی سختی کے ساتھ آشکار ہوجائے گا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آفتاب کی دھوپ، کھلی ہوا اور بارش کے پڑنے کا کوئی برا اثر ہے بلکہ بیج نامناسب جگہ بویا گیا تھا جس کا ظاہر تو صحیح تھا لیکن باطن بہت سخت تھا وہ قابل نفوذ نہ تھا، صرف اس پر گرد جم گئی تھی جب کہ نباتات زمین کی ظاہری سطح کی آمادگی کے علاوہ اس کی باطنی سطح اور گہرائی کی آمادگی بھی چاہتے ہیں تاکہ اس میں ان کی جڑیں اتر جائیں اور وہ اس سے غذا حاصل کریں۔

قرآن نے ریاکارانہ اعمال اور احسان جتانے اور آزار رسانی کے ساتھ دیئے گئے صدقہ کو سخت پتھر پر پڑی ہوئی خاک سے تشبیہ دی ہے جس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا بلکہ اس سے بیج بونے والے اور باغبان کی زحمت میں ہی اضافہ ہوگا۔ امام زین العابدین ؑ نے صدقہ کے حق کے بارے میں فرمایا ہے: ’’ ثم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ اپنے صدقہ کو کسی پر احسان نہ قرار دو کیونکہ اس کا فائدہ تمہیں کو ملے گا۔

اس آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ میں درج ذیل نکات بیان ہوئے ہیں :

۱۔’’ لا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والاذی‘‘ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ممکن ہے کہ بعض اعمال، نیک اعمال کے نتائج کو برباد کردیں یہی احباط ہے کہ جس کی وضاحت سورۂ بقرہ کی ۲۱۷ ویں آیت کے ذیل میں کی جاچکی ہے۔

۲۔ریا کارانہ عمل کو اس پتھر سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس پر خاک پڑی ہو اور اس نے پتھر کو ڈھانک لیا ہو یہ نہایت ہی بولتی ہوئی تشبیہ ہے، کیونکہ ریا کار لوگ اپنے باطن کی سختی وقساوت کو نیک اعمال کے ذریعہ چھپاتے ہیں اور وہ جو اعمال انجام دیتے ہیں ان کے وجود میں اس کی جڑ نہیں ہوتی ہے۔ لیکن زندگی کے حوادث اس پردہ کو ہٹا دیتے ہیں اور ان کے باطن کو آشکار کر دیتے ہیں۔

قرآن ہی سے دوسرے مثال:

ومثل الذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انفسھم۔

جو لوگ اپنے اموال کو خدا کی رضا حاصل کرنے اوراپنے نفس کے اطمینان کے حصول کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی مثال اس باغ کی سی ہے جو کسی بلندی پر ہو اور تیز بارش اس کے پھل کو دوگنا کردے اور اگر تیز بارش نہ برسے تو معمولی بارش ہی اس کے لئے کافی ہو جائے اور خدا تمہارے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے۔

ایک سر سبز اور ہرے بھرے درخت کو فرض کریں جوزرخیز وبلند جگہ پر کھلی ہو اور دھوپ میں واقع ہو اور نفع بخش بارش اس پربرستی ہو اور جب بارش نہیں برستی تو پھوار اور شبنم ہی باغ کی شادابی کے لئے کافی ہو جاتی ہے نتیجہ میں ایسا باغ دوسرے باغات کی بہ نسبت دوگنا پھل دیتا ہے چونکہ بلندی پر واقع ہے کھلی ہوا اور آفتاب کی دھوپ سے مالا مال ہے۔ اس کا حسین منظر ہر دیکھنے والے کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرلیتا ہے اور سیلاب کے خطرہ سے محفوظ رہتا ہے چنانچہ ان لوگوں کی مثال اس باغ کی سی ہے جو اپنے اموال کو خدا کی رضا اور اپنے دل میں ایمان و یقین کے جاگزیں ہونے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

تفسیر نمونہ میں اس آیت کے ذیل میں دونکات بیان ہوئے ہیں :

۱۔یہ جملہ ’’ ابتغاء۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ خدا کے لئے کئے جانے والے انفاق کے محرکات کو بیان کررہا ہے، وہ دو ہیں :خدا کی رضا کا حصول، روح ایمان کی تقویت اور دل و روح میں سکون کو جاگزیں کرنا،اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ : حقیقی معنی میں انفاق کرنے والے وہ لوگ ہیں جو صرف خدا کی رضا حاصل کرنے اور انسانی فضائل و کمالات کو پروان چڑھانے اور محروموں کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کے احساس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اضطراب سے آرام پانے کے لئے انفاق کرتے ہیں :

۲۔ ’’واللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ‘‘ اس بات سے خبردار کرتا ہے کہ جو بھی نیک عمل انجام دینا چاہتا ہے اس کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ نیت یا طریقہ کار کے لحاظ سے معمولی سی آلودگی بھی پیدا نہ ہونے پائے کہ خداوند عالم ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

پوشیدہ اور آشکار صدقات

امام زین العابدین ؑ نے پوشیدہ طور پر صدقہ دینے کی زیادہ تاکید فرمائی ہے اور وہ اس طرح کہ صدقہدینے میں کانوں اور آنکھوں کو گواہ نہ بناؤ، شاید اس کا تعلق مستحب صدقات سے ہے ورنہ واجب صدقات، جیسے زکوٰۃ کوکھلم کھلا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے سورۂ بقرہ میں خداوند عالم اس طرح ارشادفرماتا ہے:

ان تبدوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خبیر۔

اگر تم علی الاعلان صدقہ دو گے تو بھی ٹھیک ہے اوراگر اسے چھپا کر ناداروں کو دوگے تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہترہے اس سے تمہارے بہت سے گناہ بھی بخش دیئے جائیں گے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے خوب باخبر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آشکار اور مخفی صدقات دونوں ہی کا اچھااثر ہوتا ہے آشکار صدقہ اگر واجب ہو تو قطع نظر اس کے کہ نیک کام کی طرف لوگوں کی تشویق ہوگی یہ الزام بھی نہیں رہے گا کہ وہ اپنے واجب فریضہ پرعمل نہیں کرتے ہیں ؛ اور اگر مستحب ہے تو یہ ایک قسم کی عملی تبلیغ ہے اس سے بھی نیک کام، محروم لوگوں کی حمایت اور رفاء عام قسم کے کاموں کی طرف لوگوں کی تشویق و ترغیب ہوتی ہے۔

جو صدقہ مخفی طور پر، اور لوگوں سے چھپا کر دیا جاتا ہے یقینا اس میں خود نمائی اور ریا کاری کم اور خلوص زیادہ ہوتا ہے اور اس سے محروموں کی آبرو کی اچھی طرح حفاظت ہوتی ہے۔

بعض احادیثمیں اس بات کی تصریح ہوئی ہے کہ واجب صدقات کو ظاہر کرنا اور مستحب صدقات کو چھپانا بہتر ہے۔ یہ چیز علی بن ابراہیم کی تفسیر سے مجمع البیان میں نقل ہوئی ہے۔

الزکوٰۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فضل۔

اورجملۂ یکفر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے راہ خدا میں انفاق کرنے کا گناہوں کی بخشش میں گہرا اثر ہوتا ہے البتہ اس سے سارے گناہ نہیں بخش دیئے جاتے۔ صدقہ دینے اور انفاق کرنے میں جو چیز موث ہے وہ پاک نیت اور باخلوص عمل ہے لوگوں کے جاننے یا نہ جاننے کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے خدا جانتا ہے یہی کافی ہے کیونکہ وہی انسان کے اعمال کی جزا دیتا ہے وہ ہ پوشیدہ و آشکار سے آگاہ ہے۔

انسان کی زندگی پر صدقہ کا اثر

لیس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تظلمون۔

ان کی ہدایت کی ذمہ داری آپ کی نہیں ہے لیکن خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور مال میں سے جو تم خرچ کرتے ہو وہ تمہاے ہی لئے ہے لیکن خدا کے علاوہ کسی کے لئے انفاق نہ کرو اور مال میں سے تم جو خرچ کرتے ہو وہ تمہیں واپس لوٹا دیا جائے گا اور تم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر مجمع البیان میں اس آیت کی شان نزول میں ابن عباس سے منقول ہے کہ مسلمان غیر مسلموں پر خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو یہ اجازت دی گئی کہ جہاں ضروری ہو وہاں یہ کام انجام دو۔

جملۂ ’’وما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انفاق و صدقہ کا فائدہ ہے وہ خود صدقہ دینے والے ہی کو ملتا ہے اس طرح قرآن انفاق کرنے والوں کو اس انسانی عمل کی طرف رغبت دلاتا ہے یہ بات یقینی ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کے کام کا پھل خود اسی کو ملے گا تو وہ اس کام میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔

صدقہ و انفاق کے مادی مو معنوی دونوں اعتبار سے اہم اثرات ہیں، معنوی لحاظ سے یہ انفاق کرنے والے کے لئے موثر ذریعہ ہے اور مادی اعتبار سے اس کے سبب طبقاتی فرق و فاصلہ کم ہوتا ہے جیسا کہ ہم اس بات کی طرف پہلے بھی اشارہ کرچکے ہیں کہ معاشرہ میں نادار و محروم لوگوں کا وجود ایک خطرناک دھماکہ کا باعث ہوتا ہے جو مالدار اور نادار دونوں کی زندگی کو دشوار بنا دیتا ہے بنابرایں انفاق و صدقہ اجتماعی و سماجی، اقتصادی حفاظت او ر مادی و منوی لحاظ سے خود انفاق کرنے والے کے حق میں ہے۔

معنی ٔ وجہ اللہ لغت میں وجہ کے معنی چہرہ کے ہیں کبھی ذات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ممکن ہے یہ معنی ہوں کہ انفاق کرنے والوں کی نظر پروردگار کی ذات پر ہونا چاہیے لفظ وجہ کنایہ کے طور پ خدا کی ذات کے لئے استعمال ہوا ہے کیونکہ خداوند عالم نہ جسم رکھتا ہے نہ صورت و چہرہ۔

جملۂ ’’ وما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ تم یہ نہ سوچو کہ تمہیں انفاق وصدقات کامختصر نفع ملے گا بلکہ جو تم صدقہ دیتے ہو وہ پورا پورا ملے گا اور تم پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا یہ آیت تجسم اعمال کی ایک دلیل ہوسکتی ہے کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے :جو چیز تم نے انفاق کی ہے تمہیں وہی دی جائے گی۔ اب ہم اس سلسلہ میں وارد ہونے والی احادیث میں سے بعض کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

صدقہ کے اثرات احادیث کی روشنی میں

احادیث و روایات میں صدقہ کے بہت سے آثار و فوائد نقل ہوئے ہیں لیکن ہم ان میں سے بعض کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں :

صدقہ روزی میں اضافہ کا باعث:

صدقہ رزق میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ اس اثر کی طرف درج ذیل تین حدیثوں میں اشارہ ہوا ہے:

عن السکونی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رحمکم اللہ۔

سکونی نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ رسول ؐ نے فرمایا: صدقہ دو، بیشک صدقہ مال میں برکت و اضافہ کا باعث ہوتا ہے صدقہ دو خدا تم پر رحم کرے گا۔

عن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حضرت امام موسیٰ کاظم ؑ فرماتے ہیں :صدقہ کے ذریعہ رزق اتارو!

عن الرضا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

امام رضا ؑ نے اپنے آباء سے روایت کی ہے کہ رسول ؐ نے فرمایا: انسان کا بہترین مال اور اس کا ذخیرہ صدقہ ہے۔

صدقہ بیماری سے شفا:

قال رسول ؐ :

رسول ؐ نے فرمایا: اپنے بیماروں کا صدقہ کے ذریعہ علاج کرو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیماروں کا دوا کے ذریعہ بھی علاج ہوسکتا ہے اور صدقہ کے ذریعہ بھی۔

عن عبداللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شیطان۔

عبداللہ بن سنان کہتے ہیں کہ امام صادق ؑ نے فرمایا: صدقہ کے ذریعہ اپنے بیماروں کا علاج کرو اور دعا کے وسیلہ سے بلاؤں کو دفع کرو اور صدقہ کے ذریعہ رزق اتارو کیونکہ صدقہ انسان کو سات سو شیطانوں کی ملامت و سرزنش سے محفوظ رکھتا ہے۔

عن عبداللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ید عولہ۔

عبدا للہ بن سنان کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق ؑ کو فرماتے ہوئے سنا : مستحب ہے کہ بیما اپنے ہاتھ سے سائل کو صدقہ دے اور سائل سے یہ کہا جائے کہ وہ اس کے لئے دعا کرے۔

صدقہ بلاؤ ں سے بچاتا ہے:

عن موسیٰ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بلقمۃ۔

موسیٰ بن حسن نے امام رضا ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:بنی اسرائیل میں سالہا سال شدید قحط پڑا ایک عورت کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا تھا جس کو اس نے کھانے کے لئے منھ میں رکھا ہی تھا کہ سائل نے آواز دی : اے خدا کی کنیز ! میں بھوکا ہوں، عورت نے اپنے دل میں سوچا یہ وقت صدقہ دینے کا ہے اس نے ٹکڑا منھ سے نکال کر سائل کو دیدیا اس عورت کا ایک کمسن لڑکا تھا جو صحرا میں لکڑی چننے گیا تھا ایک بھیڑیا اس پر جھپٹا ایک شور بلند ہوا ماں شور کی آواز سن کر دوڑی خدا نے جبریل کو بھیجا، جبریل نے اس کے بچہ کو بھیڑئیے کے منھ سے نکال کر ماں کے سپرد کردیا اور عورت سے فرمایا:کیا تم لقمہ کے عوض لقمہ سے راضی ہو؟

صدقہ کے حق کے سلسلہ میں امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : خدا اس کی حفاظت کرتا ہے اور تمہیں کو لوٹادے گا۔ صدقہ کا ایسا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ صدقہ کے اثر کے ذریعہ بلا اور اس کے تلخ نتیجہ کے دفع ہونے کو بیان کرتا ہے۔

اس داستان سے ملتی جلتی دوسری داستان رسول ؐ سے منقول ہے۔

علی بن ابراہیم نے احمد بن محمد سے انھوں نے سالم بن مکرم سے انھوں نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے ایک یہودی کی داستان نقل کی جو کہ رسول ؐ کے زمانہ میں کہیں جارہا تھا، اس کے بارے میں رسول ؐ نے فرمایا: اس یہودی کو ایک کالا سانپ ڈسے گا اور یہ مر جائے گا امام صادق ؑ فرماتے ہیں : یہودی گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جمع کی ہوئی لکڑیوں کا بار اٹھائے ہوئے واپس آگیا رسول ؐ نے فرمایا: لکڑیوں کے اس با کو نیچے رکھو، یہودی نے بار اتار کر زمین پر رکھدیا، اس سیایک کالا سانپ نکلا، رسول نے فرمایا: اے یہودی آج تو نے کیا کام کیاہے؟ اس نے عرض کی : میں نے ان لکڑیوں کے اکٹھا کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا ہے۔ ہاں میرے پاس دو روٹیاں تھیں ان میں سے ایک میں نے کھائی اور دوسری کو ایک بینوا کو صدقہ دیدی۔ رسول ؐ نے فرمایا: اسی صدقہ کے سبب خدا نے تم سے بلا کو دفع کردیا۔ پھر فرمایا: صدقہ انسان کو بری موت مرنے سے بچاتا ہے۔

حنان بن سدیرنے اپنے والد سے اور انھوں نے امام محمد باقر ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: بیشک صدقہ دنیوی بلاؤں میں سے ستر بلاؤں کو دفع کرتا ہے اور صدقہ دینے والے کو بری موت مرنے سے بچاتا ہے اس کے علاوہ اس کے لئے آخرت میں ثواب ذخیرہ ہوجاتا ہے۔

جس طرح قرآن کی آیتوں میں ہماے لئے یہ نقل ہوا ہے کہ مخفی اور آشکار دونوں صورتوں میں صدقہ دینا ثواب ہے اور صدقہ دینے کی تاکید کی گئی ہے اسی طرح روایات و احادیث میں بھی اس کی تاکید کی گئی ہے:

امام صادق ؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: خفیہ طور پرصدقہ دینا غضب پروردگار کو خاموش کرتا ہے۔

عمربن یزید نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: علانیہ صدقہ ستر قسم کی بلاؤں کو دفع کرتا ہے اور خفیہ طور پر دیا جانے والا صدقہ رب کے غضب کو خاموش کرتا ہے۔

فضل بن حسن طبرسی نے مجمع البیان میں تحریر کیا ہے:امام ؑ نے فرمایا: پوشیدہ، صدقہ پروردگار کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور گناہوں کو اسی طرح ختم کرتا ہے جس طرح پانی آگ کوبجھادیتا ہے اور بلا کے ستر دروازوں کو بند کرتا ہے۔

امام صادق ؑنے رسول ؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:مومن کی جائے قیام کے علاوہ زمین قیامت آگ ہوگی۔

امیرالمومنین ؑ فرماتے ہیں :پوشیدہ صدقہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور آشکار صدقہ مال میں اضافہ کرتا ہے۔

صاحب مجمع البیان نقل کرتے ہیں کہ امام نے فرمایا: روز قیامت جس دن کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ سات قسم کے لوگ پروردگار کے سایہ کے نیچے ہونگے پھر فرماتے ہیں :ان میں سے وہ شخص بھی ہے جس نے پوشیدہ طور پر اس طرح صدقہ دیا کہ اس کے دائیں ہاتھ کو یہ خبر نہ ہو کہ بائیں سے کیا دیا۔

قربانی کا حق

قربانی و ہدی کا حق یہ ہے کہ تم اسے اپنے پروردگار کے لئے خالص کرو اور اسے اس کی رحمت و قبولیت کے لئے پیش کرو لوگوں کو کھانے کے لئے نہیں اگر تم اس طرح قربانی کروگے تو خود کوزحمت میں نہیں ڈالو گے اورنہ تکلف کروگے کیونکہ اس سے تمہارا مقصد قربانی ہے جان لو کہ تم خداوند عالم کی بارگاہ میں آسانی سے باریاب ہوگے اور زحمت و مشقت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جیسا کہ خدا نے بندوں کی تکلیف کو آسان کردیا ہے انھیں سختی میں مبتلا نہیں کرنا چاہا۔

اسی طرح اس کی بارگاہ میں تمہارا فروتنی کرنا تمہارے لئے تکبر کرنے سے بہتر ہے کیونکہ کلفت و مشقت جاہ و منصب کے بھوکے لوگوں کے لئے ہے لیکن فروتنی اور درویش منشی میں کوئی تکلیف ہے اور نہ کوئی خرچ کیونکہ یہ فطرت و سرشت کے مطابق ہے اور طبیعت میں موجود ہے اور طاقت و قوت صرف خدا ہی کی ہے۔

ہدی کے لغوی معنی

’’ ہدی‘‘ ’’ فلس ‘‘ کے وزن پر ہے یعنی حج اور بیت اللہ الحرام سے مخصوص قربانی ؛ دوسری قربانی کو ’’ اضحیہ‘‘ کہتے ہیں : شاید اس کی وجہ تسمیہ یہ ہو کہ خانہ کعبہ سے منسوب ہونے کی وجہ سے قربانی کا خاص احترام و اکرام ہے کہ ہدی اور ہدایت میں لطف کے معنی ہیں :یا اس کی یہ وجہ تسمیہ اس لئے ہے کہ اسے کعبہ و حرم کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ’’ ھدی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ یعنی دلہن کو شوہر کے کمرہ کی طرف لے جانا۔ قرآن مجید میں آیا ہے’’ ولا تحلقو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘

جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ تراشو!

جیسا کہ مفردات سے سمجھ میں آتا ہے ہدیہ کو اس لئے ہدیہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک کا دوسرے پر لطف و مہربانی ہے مثلاً ملکہ ٔ سبا نے حضرت سلیمان ک یلئے ہدیہ بھیجا تھا اور قرآن مجید میں یہ قصہ موجود ہے: وانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں ان کے لئے ایک تحفہ بھیجونگی تاکہ یہ دیکھوں کہ بھیجے ہوئے افراد کس چیز کے ساتھ لوٹتے ہیں۔

قرآن مجید میں سات جگہ ’’ ہدی‘‘ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ حج و عمرہ کی قربانی کے بارے میں آیا ہے، اس کا واحد ’’ ہدیۃ ‘‘ ہے جیسے تمر وتمرۃ اور جم ہدی ّ ہے۔ فعیل کے وزن پر۔

قربانی

جو لوگ حج تمتع کرتے ہیں ان کے لئے منیٰ میں دوسرا واجب عمل قربانی کرنا ہے اور چونکہ یہ عمل عبادت ہے اور خدا سے قریب ہونے کا وسیلہ ہے اس لئے اس کو قربان کہتے ہیں۔مجمع البحرین میں مرقوم ہے ’’ والقربان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ ہر نیک عمل کو قربانی کہا جاتا ہے کہ اس کا مقصد خدا کی رحمت سے قریب ہونا ہے۔

ہم یہاں ھدی کے حق کے سلسلہ میں امام زین العابدین ؑ کے بیان کی تشریح کرنا چاہتے ہیں لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی ہدی کا ذکر ہوا ہے اسے یہاں بیان کردیا جائے تاکہ اس موضوع کی اہمیت واضح ہوجائے۔

حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے تمام کرو پھر اگر گرفتار ہو جاؤ تو جو قربانی ممکن ہو وہ دیدو اور جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ منڈانا پھر اگر تم میں سے کوئی بیمار ہے یا اس کے سر میں درد ہے تو روزہ یا صدقہ یا گوسفند کا کفارہ دینا چاہیے جب تم دشمن اور بیماری کی طرف سے مطمئن ہو جاؤ تو جس نے عمرہ سے حج تمتع کا ارادہ کیا ہے تو اسے جو قربانی میسر ہو دیدے۔

اس آیت میں خدا نے تین بار ہدی کے موضوع کو بیان کیا ہے۔۱۔ جب احرام باندھ لیا جائے لیکن بیماری یا راستہ میں رکاوٹ آجائے تو یہاں لازم ہے کہ ایک قربانی دی جائے۔۲۔ عید کے دن سر منڈانے سے پہلے اور کنکری مارنے کے بعد قربانی کی جائے اور جب تک قربانی نہ کی جائے سر منڈانا جائز نہیں ہے۔۳۔ اطمینان حاصل ہونے کے بعد جو حاجی حج تمتع کرنا چاہتا ہے اسے منیٰ میں قربانی کرنا چاہیے۔

ایمان لانے والو! خدا کی نشانیوں (حج کے اعمال و مراسم) کی بے حرمتی نہ کرنا اور نہ حرمت والے مہینوں اور نہ بے پٹے کے قربانی کے جانو اور نہ پٹے والے قربانی جانور کی بے حرمتی کرنا اور نہ ان لوگوں کی بے حرمتی کرناجو خدا کافضل ڈھونڈنے ک یلئے خانہ کعبہ کی طرف آتے ہیں۔

اس آیت میں آٹھ حکم بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک ہدی و قربانی کا موضوع ہے حج کی قربان کو، خواہ پٹے دا ر ہو یا بے پٹے کے ہو، ہدی کہتے ہیں اور اس کی جمع ہدیہ ہے یعنی وہ حیوان جن کو قربانی کے لئے خانۂ خدا کو اھداء کیا جاتا ہے۔

قلائد ’’ قلادۃ ‘‘ کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو انسان یا کسی جانور کے گلے میں ڈالدی جاتی ہے اس آیت میں وہ چوپائے مراد ہیں جن پر حج کی قربانی کے لئے نشان لگا دیئے جاتے ہیں۔

درج ذیل آیت میں بھی یہی موضو ہے:

جعل اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والقلائد۔

خدا نے کعبہ کو جو حرمت کا گھرہے لوگوں کے لئے جائے قیام قرار دیا ہے اسی طرح قربانی کے عام جانوروں کو اوران جانوروں کو کہ جن کے گلے میں پٹہ ڈال دیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

ایمان لانے والو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو!اورجو تم میں سے جان بوجھ کر شکار مارے گا اس کی سزا و کفارہ ایسا ہی جانور ہے جیسا اس نے ماراہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل افراد کریں اور اس قربانی کوکعبہ تک جانا چاہیے۔

اس کفارہ کے جانور کو کہاں ذبح کیا جانا چاہیے ؟ فرماتا ہے کہ اسے کعبہ تک پہنچنا چاہیے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ ہماریزمانہ کے فقہا کے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ عمرہ کے احرام کی حالت میں شکار کرنے کے کفارہ کے جانور کو مکہ میں ذبح ہونا چاہیے اور حج کے احرام کی حالت میں کئے گئے شکار کے کفارہ کے جانور کو منیٰ کی قربان گاہ میں ذبح ہونا چاہیے۔

درج ذیل آیت میں بھی ’’ ہدی ‘‘ ہی بیان ہوا ہے:

ھم الذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محلہ۔

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر اختیار کیا اور آپ ؐ کو مسجد الحرام میں نہیں داخل ہونے دیا اور ہدی یعنی قربانی کے جانوروں کو روک دیا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ سکیں۔

یہ تھے وہ سات مقامات جن میں خدا نے ہدی کے موضو کو بیان فرمایا اور اس کی اہمیت کو گوش گزار کیا اس سے ہم اس بات کی طرف متوجہ ہوگئے کہ قربانی خدا کے حکم کو بجالانے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے وہ بھی کعبہ یا قربان گاہ پہنچانے کے لئے۔

قربانی کی تاریخ

جن چیزوں کے بارے میں ہر شخص جاننا پسند کرتا ہے ان میں سے ایک قربانی ہے کہ قربانی کی رسم کب سے شروع ہوئی ہے ؟ تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے قربانی مختلف قوموں اور ملتوں میں مختلف صورتوں میں رہی ہے۔

خوش قسمتی سے قرآن مجید نے اس کی ابتداء کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ قربانی کی رسم انسان کی خلقت کے بعد آدم کے بیٹوں سے شروع ہوئی ہے سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

انھیں آدم کے دونوں بیٹوں کی داستان حق کے ساتھ سنا دیجئے جب ان میں سے ہر ایک نے تقرب خدا کے لئے قربانی پیش کی تو ایک کی قربانی کو قبول کرلیا گیا اور دوسرے کی قربانی کو قبول نہیں کیا گیا پھر جس کی قربانی کو قبول نہیں کیا گیا اس نے کہا:

خدا کی قسم میں تمہیں ضرور قتل کرونگا۔ اس نے کہا:خدا بس پرہیز گاروں کی قربانی کو قبول کرتا ہے۔

اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خدا کے تقرب کا ایک طریقہ قربانی کرنا ہے اور آدم کے بیٹوں نے قرب خدا کے معیار کو اسی طریقہ سے سمجھا تھا۔

حضرت ابراہیم ؑ فرماتے ہیں :صدقہ دے کر خدا کا تقرب حاصل کرو، چنانچہ توریت کے سفر تکوین سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم کو حیوانات ذبح کرنے کا حکم دیا اور حضرت ابراہیم کے بیٹوں نے قربانی، ہدی اور ذبیحہ کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کیا۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں ذبیحوں کی دو قسمیں تھیں ایک کو ذبح کیا جاتا تھا اور دوسری کو راہ خدا میں چھوڑ دیا جاتا تھا ذبح کی جانے والی قسم کی تین قسمیں تھیں۔

۱۔جلایا جانے والا ذبیحہ

۲۔گناہ کا کفارہ ذبیحہ

۳۔سلامتی کا ذبیحہ

پہلی قسم کے ذبیحہ کا گوشت جلایا جاتا تھا اور کھال کاہن کو دی جاتی تھی، دوسری قسم کے ذبیحہ کانصف گوشت جلایا جاتا تھا اور نصف کاہن کا حصہ ہوتا تھا، تیسری قسم کا ذبیحہ سب کے لئے حلال تھا۔

روم والے بھی اپنے خداؤں کے لئے قربانی کرتے تھے اور ان کے کاہن قربان کے وقت،پانی،گلاب اور شہدچھڑکتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان نے اس قسم کی قربانی کے سلسلہ میں صرف بھیڑ اور جانوروں ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ کبھی انسانوں کو بھی قربانی کے عنوان سے ذبح کیا ہے۔ بعض فینیقین، کنعانین، صوریین، فارس اور روم کے باشندوں کی یہی عادت تھی یہاں تک کہ ۶۵۷؁ء میں روم کے سربرآوردہ افراد کی ایک کمیٹی نے اس پر پابندی لگائی۔

کہا جاتا ہے کہ مصر والے ماہ قبطی میں ہرسال ایک باکرہ لڑکی کو سجا سنوار کر اس لئے دریائے نیل کی بھینٹ چڑھاتے تھے تاکہ اس عمل کے ذریعہ وہ اپنے خداؤں کا تقرب حاصل کریں۔ یہ رسم اسی طرح جاری تھی یہاں تک عمروبن عاص نے، عمر بن خطاب کی موافقت سے اس پر پابندی لگائی۔ یہ بات صاحب رسالۃ الحقوق نے جامعہ ازہر کے استاد احمد جرجانی کی کتاب ’’ حکمۃ التشریع وفلسفۃ ‘‘ سے نقل کی ہے۔

اسلام نے ان تمام قربانیوں کو ممنوع قرار دیا جو بتوں اور انسانوں کے لئے دی جاتی تھیں اور اپنے ماننے والوں کو صحیح قربانی سکھائی جس کو ہم نے آیات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ درحقیقت اسلام نے آدمی کی فطرت اور اس کے ضمیرکو،کہ جس میں خدا پرستی کا اعتقاد رچا بسا ہوا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ خدا کی بارگاہ میں قربانی پیش کرے،قربانی کرنے کا طریقہ اوراس کی قسم کی تعلیم دی ہے :تم یہ گمان نہ کرو کہ تمہارے اس ذبیحہ کا گوشت یا خون خدا تک پہنچے گا ہرگز، بلکہ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان خدا سے قریب ہو جائے، لہٰذا قربانی میں قصد قربت ہونا چاہیے اور ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا چاہیے۔

ہدی ایک شرعی اور عقلی چیز ہے

گذشتہ بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہدی ایک عقلی بات ہے لہٰذا شارع مقدس نے بھی اس کو پسند اور تسلیم کیا ہے کہ اس سے روح سنورتی ہے اور معاشرہ کی اقتصادی بنیاد مضبوط ہوتی ہے، قربانی کا مقصد یہ ہے کہ اس کا گوشت ناداروں کو دیاجائے اور یہ صرف خدا کے لئے کی جائے۔ یہ بات اس روایت سے سمجھ میں آتی ہے جو علل الشرایع میں نقل ہوئی ہے۔

امام جعفر صادق ؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا نے قربانی کو معاشرہ کی اقتصادی خوشحالی اور ناداروں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے قرار دیاہے انھیں اس کا گوشت کھلاؤ۔

ابو بصیر کہتے ہیں : میں نے امام صادق ؑ کی خدمت میں عرض کیا: قربانی کرنے کاکیا فلسفہ ہے؟فرمایا:قربانی کے خون کے اولین قطرہ کے زمین پر گرتے ہی قربانی کرنے والے کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور یہ کہ معلوم ہوجائے کہ غیب سے کون ڈرتا ہے۔ خداوند عالم کا ارشادہے:اس کا گوشت خدا تک پہنچتا ہے اور نہ اس کا خون کیونکہ خدا اس کا محتاج نہیں ہے بلکہ قربانی تقویٰ اور پرہیز گاری کی نشانی ہے پھر فرمایا: غور کرو کہ خدا نے ہابیل کی قربانی کو قبول کرلیا اور قابیل کی قربانی کو رد کردیا۔

اس حدیث میں ثواب، قربانی کرنے والے کے گناہوں کی مغفرت اور اس کے خلوص کو پہچاننے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوجاتا کہ قربانی میں کیا عظمت و راز ہے تو وہ قرض لے کر قربانی کرتے قربانی کے اولین قطرہ کے زمین پرگرتے ہی قربانی کرنے والے کے گناہوں کو بخش دیا جاتا ہے۔

وسائل الشیعہ میں منقول ہے کہ رسول ؐ نے اپنی دختر حضرت فاطمہ ؐ سے فرمایا: اپنی قربانی کے ذبح کیوقت تم موجود رہو بیشک اس کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی خدا تمہاری فروگزاشتوں کو معاف کر دے گا۔ یہاں تک کہ فرمایا :یہ ثواب عام مسلمانوں کے لئے ہے۔

حضرت موسیٰ بن جعفر سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:رسول ؐ کا ارشاد ہے:اپنی قربانی کے جانوروں کو فربہ بناؤ کہ یہ پل صراط سے گزرنے کے لئے تمہاری سواریاں ہیں۔

حاکم کا حق

پیشوائے حکومت کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اس کے لئے آزمائش و امتحان کا سبب قرار دئیے گئے ہو اور اس کاجو تسلط تم پر ہے وہ بھی اس کے ذریعہ آزمایا جاتا ہے لہٰذا اس کی بات کو تم خلوص کے ساتھ سنو اور اس سے اس وقت جھگڑا نہ کرو جب وہ تمہارے اوپر تسلط رکھتا ہو کہ اس صورت میں تم اپنی اور اس کی ہلاکت کا سبب بنو گے اس کے ساتھ اتنی نرمی اور فروتنی سے پیش آؤ کہ اس کی رضا حاصل کرلو تاکہ وہ تمہارے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچائے اور اس سلسلہ میں تم خدا سے مدد طلب کرو اس پر برتری حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو اور اس سے دشمنی نہ کرو اگر ایسا کروگے تو اسے بھی نقصان پہنچاؤ گے اور خود کوبھی، اسے اپنی طرف سے متنفر کروگے اور اسے معرض ہلاکت میں پہنچاؤ گے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم ضرر میں اس کے معاون ہو جاؤ اور وہ جو بھی تمہارے ساتھ کرے اس کے شریک ہو جاؤ اور خدا کے علاوہ کوئی قوت و طاقت نہیں ہے۔

لغت میں ’’ سلطہ ‘‘ کے معنی قدرت کے ہیں، مفردات اوراقرب الموارد میں سلطہ کے معنی قہر و غلبہ کے ساتھ تمکن و قدرت لکھے ہیں : سلّطہ علیہ، یعنی اسے دوسرے پر غالب کیا۔

اس جملہ میں امام زین العابدین ؑ معاشرہ کے حکام کے حقوق کو بیان کرتے ہیں پہلے معاشرہ کے حاکم و سلطان کے حق کو بیان کرتے ہیں اور سلطان سے مراد صاحب قدرت ہے یعنی جس کے ہاتھ میں امورکی زمام ہے۔

اس بات کو بھی سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ معاشرہ میں حاکم و سلطان کا وجود ضروری ہے تاکہ اس کی حکومت کے زیر سایہ اجتماعی قوانین و مقررات کا اجراء ہو اور نظم و نسق کا بول بالا ہو سکے اور معاشرہ میں فتنہ وفساد، جنگ و خونریزی کا سد باب ہو اور معاشرہ کے لوگ اپنے تکامل کے سفر کو جاری رکھیں۔

حضرت علی ؑ کی نظر میں حاکم کی ضرورت

لوگوں کے لئے ایک حاکم و امیر کاہونا ضروری ہے خواہ وہ نیک ہویابد، مومن اس کی حکومت میں طاعت میں مشغول رہتا ہے اور کافر اپنے لحاظ سے فائدہ و لذت اٹھاتا ہے اور اس کے زمانہ میں خدا ہر ایک کی اجل کو مقدر کرتا ہے، اسی کے ذریعہ فیٔ و مالیات جمع ہوتے ہیں،اور دشمن سے جنگ ہوتی ہے، راستے محفوظ ہوتے ہیں زبردست و قوی سے کمزور کا حق لیا جاتا ہے یہاں تک کہ نیک آرام پاتا ہے اور بد کا رسے محفوظ رہتا ہے۔

یہ جملے آپ نے اس وقت بیان فرمائے ھے جب خواج نے لا حکم الا للہ کا شور مچا رکھا تھا۔ اس خطبہ سے آپ نے یہ ثابت کیا تھا کہ حاکم کا وجود ناگزیر ہے کیونکہ اسی وقت معاشہ میں آرام و حین ہوتا ہے کہ جب میں قوی و طاقتور حکومت ہوتی ہے۔

امام رضا ؑ کے نقطۂ نگاہ سے

معاشرہ میں حاکم کے وجود کی ضرورت کے سلسلہ میں مضل بن شاذان نے امام رضا ؑ سے ایک مفصل حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں :

اس کا فلسفہ یہ بھی ہے کہ ہم کو فرقوں میں سے کوئی فرقہ اور ملتوں میں سے کوئی ملت ایسی نہیں ملتی کہ جس نے رئیس و رہبر کے بغیر زندگی گزای ہو کیونکہ ان ک یلئے دین و دنیا میں اس کا وجود ضروری ہے لہٰذا حکیم کی حکمت میں یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے لوگوں کو حاکم و رہبر کے بغیر چھوڑ دے کہ ان کے لئے اس کا وجود ضروری ہے اور اسی پر ان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اسی کے ذریعہ وہ دشمن سے جنگ کرتے اور غنیمت تقسیم کرتے ہیں، اپنا جمعہ اور جماعت قائم کرتے ہیں اور اپنے مظلوم سے ظالم کو دفع کرتے ہیں۔

امام رضا ؑ کے اس کلام سے معاشرہ میں حاکم کے وجود کی ضرورت کا فلسفہ واضح ہوجاتا ہے۔

عادل امام و پیشوا اور ان کے مخصوص صفات

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے، رہبر دو قسم کے ہیں۔ عادل اور ظالم ان دونو ں کے کچھ مخصوص صفات ہیں ان کو یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے:

اور ہم نے ان کو امام بنایا وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان کو نیک کام کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی ہے اور وہ ہمارے ہی عبادت گزار تھے۔

اس آیت میں خدا نے امام بنانے کی نسبت اپنی طرف دی ہے اور ان کے یہ خصوصیات بیان کئے ہیں کہ وہ لوگوں کی ہدایت و راہنمائی کرتے ہیں، ان پر خدا کی طرف سے یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ وہ نیک کام کریں،نماز قائم کریں جو کہ خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ ہے، زکوٰۃ دیں کہ نادار و مالداروں کے درمیان رابطہ ہے اور ان کی آخری خصوصیت یہ ہے کہ وہ عبادت گزار تھے چنانچہ جب انھوں نے عبودیت کی منزل سر کی تو ان کو لوگوں کی قیادت و رہبری ملی۔

قیادت کامیابی کا سبب

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ قدرت و اقتدار عادل امام کے لئے ہے اس سلسلہ میں اس نے کچھ نمونے بیان کئے ہیں ان میں ایک طالوت کا قصہ بھی ہے، طالون دراز قد، طاقتور اور حسین و جمیل تھے، قوی ہیکل اور ذہین و زیرک تھے بعض لوگوں نے ان کے دراز قد ہونے ہی کو ان کے انتخاب کا سبب سمجھا ہے۔

کیا تم نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں سے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جب انھوں نے اپنے نبی سے کہا: آپ کسی کو ہمارا زمامدار مقرر کردیجئے تاکہ ہم اس کی قیادت میں راہ خدا میں جہاد کریں۔

ان کے نبی نے ان سے کہا: بیشک خدا نے تمہارے لئے زمامدار مقرر کردیا ہے انھوں نے کہا: وہ ہم پر کیسے حکومت کرسکتے ہیں جب کہ ہم ان سے زیادہ حکومت کے حقدا ہیں ان کے پاس مال بھی ہم سے زیادہ نہیں ہے؟ نبی نے کہا: خدا نے انھیں تمہارے اوپر مقرر کیا ہے اور ان کے علم و جسم میں وسعت دی ہے خدا جس کو چاہتا ہے اپنا ملک عطا کرتا ہے اور اللہ صاحب و سعت اور علم والا ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ قیادت و رہبری کامیابی کا سبب ہے بشرطیکہ وہ طاقتور اور باتدبیر ہو، یہی بات اس آیت میں واضح طور پر نظر آتی ہے کہ جب بنی اسرائیل میں سے بعض لوگوں نے اپنے نبی سے رہبر مقرر کرنے کا تقاضا کیا تو نبی نے بھی ان کے لئے ایسے شخص کو رہبر بنایا جو علم و جسم کے لحاظ سے قوی تھا اور جن لوگوں نے طالوت کے رہبر بننے پر اعتراض کیا تھا ان کے جواب میں خدا نے فرمایا: مال کی کمی کا قیادت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، بلکہ عملی و جسمی طاقت و تواناتی اہم چیز ہے۔

طالوت اور سپہ سالاری:

طالوت نے فوج کے سپہ سالاری قبول کرلی اور تھوڑی ہی مدت میں یہ ثابت کردیا کہ وہ امور مملکت اور سپہ سالاری کی صلاحیت و لیاقت رکھتے ہیں۔پھر طالوت نے ان لوگوں کو اس دشمن سے جنگ کرنے کی دعوت دی کہ جس سے ان کی ہر چیز کو خطرہ لاحق تھا او رلوگوں سے یہ فرما دیا کہ میرے ساتھ وہی آئے جو جہاد کرنا چاہتے ہے چنانچہ بنی اسرائیل، قوی رہبر کے وسیلہ سے جالوت پر فتحیاب ہوئے۔

اس قصہ میں قیادت کے بنیاد شرائط، خدا کا انتخاب، علم و دانائی اور طاقت و قوت بیان ہوئے ہیں رہبر و قائد اپنے علم سے معاشرہ کی فلاح و سعادت کی تشخیص کرتا ہے اور اس کے اصول بناتا ہے اور اپنی طاقت و قدرت سے ہر وقت ان کا اجراء کرتا ہے۔ ان اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والجسم۔

امام زین العابدین ؑ نے رہبر و پیشوا کے حق کے سلسلہ میں یہ فرمایا: وانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ السلطان۔ اس کی سلطنت و پیشوائیش کو خدا نے قرار دیا ہے اور اس کی قدرت وطاقت کے بارے میں فرمایاہے: ’’ وقد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ وہ تمہارے اوپر اختیار رکھتا ہے اسے تم پر بالا دستی حاصل ہے اور اس کی قدرت و اختیار سے بے اعتنائی کرنا تمہاری ہلاکت کا سبب ہوگا۔

امام زین العابدین ؑ ایک اور بات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں : پیشوا اور اس کے پیروؤں دونوں کی آزمائش ہوتی ہے طالوت کے قصہ میں آزمائش و امتحان کا ذکر بھی ہوا ہے:

جب طالوت اپنے سپاہیوں کے ساتھ بستی سے باہر گئے تو ان سے فرمایا: یقینا خدا ایک نہر کے ذریعہ تمہارا امتحان لے گا پھر جو لوگ اس نہر کا پانی پئیں گے وہ مجھ سے نہیں ہیں او جو اس سے چلو بھر پئیں گے وہ مجھ سے ہیں چنانچہ چند افراد کے علاوہ سب نے اس کا پانی پیا۔

طاقت کا بہترین استعمال، ذوالقرنین کا قصہ:

قرآن مجید دوسری قوم کے رہبر کی داستان سناتا ہے وہ بھی طاقتور و توانا تھا اور اس نے لوگوں کو نجات دلانے کے سلسلہ میں بہترین طریقہ سے اپنی طاقت سے استفادہ کیا تھا اور وہ ہے ذوالقرنین۔

یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان میں پہنچا تو وہاں اس نے ان دونوں کے علاوہ ایک او قوم کو دیکھا وہ لوگ کوئی بات نہیں سمجھتے تھے۔

یعنی وہ ایک پہاڑی علاقہ میں پہنچے اور وہاں مشرق و مغرب کے لوگوں کے علاوہ کچھ لوگ دیکھے کہ جن کا کوئی خاص تمدن و تہذیب نہی ں تھی اگر یہ کوئی بات کہتے تھے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ بشریت کے واضح تمدن، یعنی بات کہنے، سے بھی عاجز تھے یا وہ فکری اعتبار سے پست تھے۔

ان لوگوں نے اسکندر سے خونخوار دشمن یاجوج و ماجوج کی شکایت کی کہ یہ لوگ ہمارے علاقہ میں فساد پھیلاتے ہیں۔ ہم آپ کو پیسہ دیتے ہیں آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار اور سد بنا دیجئے۔

انھوں نے کہا: اے ذوالقرنین ! یاجوج و ماجوج ہمارے سر زمین پر فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے بجٹ فراہم کردیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سدویوار بنا دیں ؟ (اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی مالی حالت بہتر تھی لیکن صنعت وغیرہ سے وہ نابلد تھے) ذوالقرنین نے کہا: خدا نے جو کچھ مجھے دیا ہے وہ بہتر ہے مجھے تمہارے پیسہ کی ضرورت نہیں ہے اپنی طاقت و قوت سے میی مدد کرو تاکہ میں تمہارے اور ان دو قوموں کے دمیان دیوار و سد بنا دوں۔

’’ ردم ‘‘ بروزن ’’ مرد‘‘ کے معنی شگاف کو پتھر سے بند کرنا تھے لیکن پھر یہ وسیع معنی میں استعمال ہونے لگا اور ہر سد و رکاوٹ یہاں تک کپڑے پر پیوند لگانے کو بھی ردم کہا جانے لگا، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ردم مضبوط و ٹھوس چیز کو کہا جاتا ہے اور سد اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہوتی ہے۔

پھر ذوالقرنین نے حکم دیا : تم میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ۔ ’’زبر‘‘ زبرہ کی جمع ہے جس کے معنی لوہے کے بڑے اور ضخیم ٹکڑے کے ہیں۔ جب لوہے کے ٹکڑے فراہم ہوگئے تو ان کو ایک دوسرے کے اوپر رکھنے کا حکم دیا یہاں تک دو پہاڑوں کے درمیان کا درہ پورے طریقہ سے پر ہوگیا اور صدف کے منی پہاڑ کے کنارہ کے ہیں اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پہاڑ کے دو کناروں کے درمیان میں ایک شگاف تھا اسی سے یا جوج و ماجوج آتے تھے۔

ذوالقرنین نے آخری فرمان یہ دیا کہ اسے اتنا پھونکو کہ یہ آگ ہوجائے اور میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ تاکہ اس کو میں اس سد پر ڈال دوں اور اس طرح اس دیوار کو پگھلے ہوئے تانبے سے ڈھانک دیا تاکہ وہ ہوا کے نفوذ اور گلنے سے محفوظ رہے۔

ذوالقرنین نے اگرچہ یہ بہت بڑا کام انجام دیا ہے اور تکبر کرنے والوں کی مانند انھیں اس پرفخر کرنا چاہیے تھا، یا ان لوگوں پر احسان جتانا چاہیے تھا لیکن چونکہ وہ اللہ والے تھے اس لئے یہ کہتے ہیں : یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے۔

اس داستان میں قومی رہبر نے اپنی طاقت کو معاشرہ کے فائدہ کے لئے استعمال کیا تو لوگوں نے ان کا شکریہ ادا کیا؛ یہ تھے اس عادل و قوی رہبر کے صافت کہ جس کو حضرت علی ؑ نے اپنے کلام میں معاشرہ کو نجات دلانے ولا قرار دیا ہے۔

فان الرعیۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الفاجر۔

نیک لوگ عادل امام کے ذریعہ نجات پاتے ہیں اسی طرح فاجر و بدکار لوگ فاجر و بدکار حاکم و امام کے ذریعہ ہلاک ہوتے ہیں۔

عادل رہبر کی پہچان اور اس کی اطاعت

امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

امام حسین ؑ اپنے اصحاب کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: لوگو! خدا نے بندوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے تاکہ وہ اسے پہچانیں پھر جب وہ اسے پہچان لیتے ہیں تو اس کی عبادت کرتے ہیں اور خدا کے غیر ی عبادت سے بے نیاز ہوجاتے ہیں ایک شخص نے عرض کی : فرزند رسول ؐ ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! معرفت خدا کیا ہے؟ فرمایا: لوگوں کا اپنے زمانہ کے اس امام کو ہپچاننا کہ جس کی اطاعت ان پر واجب ہے۔

اس حدیث میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ خدا کی معرفت عادل امام کی معرفت ہی سے ہوسکتی ہے۔

عادل و عالم امام کے سبب مصر والوں کی نجات:

قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ جب حضرت یوسف قید سے آزاد ہوئے اور مصر کے حاکم کے نزدیک آپ کی صلاحیت و لیاقت واضح ہوگئی تو اس نے آپ سے بڑی ذمہ داری قبول کرنے کی درخواست کی، حضرت یوسف نے اس سے فرمایا:

اجعلنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ علیم۔

مجھے ملک مصر کا وزیر خزانہ بنا دیجئے کہ میں ان دو خصوصیتوں یک بنا پر اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں۔

۱۔ میں لوگوں کے مال کا محافظ ہوں، اور امانت داری جو کہ امامت و رہبری کی شرط ہے، وہ میرے اندر موجود ہے۔

۲۔ علم اور اقتصاد کی مہارت، میں جانتا ہوں کہ ملک کو آمد و خرچ ک یلحاظ سے کس طرح چلایا جاتا ہے۔ بادشاہ مصر نے یہ حساس و نازک عہدہ ان کے سپرد کردیا اور حضرت یوسف نے قحط کے سالوں میں ملک کا نظم ونسق کچھ اس طرح برقرار رکھا کہ معاشرہ کو قحط سے نجات ملی اور قرآن نے انھیں شائستہ و لائق زمام داروں کی فہرست میں رکھا ہے۔

عادل بادشاہ لائق احترام ہے

بادشاہ کے احترام اور اس کا حق ادا کرنے کے بارے میں رسول ؐ اور ائمہ معصومین سے بہت سی حدیثیں نقل ہوئی ہیں جو کہ حاکم اور عادل بادشاہ سے مربوط ہوتی ہیں یہاں ان میں سے بعض یہ ہیں :

۱۔ رسول ؐ نے فرمایا: سلاطین اور بادشاہوں کا احترام کرو کیونکہ اگر وہ عادل ہیں تو روئے زمین پر خدا کا سایہ ہیں (عادل حاکموں کا احترام کرو ظالم و جابر کا نہیں )

۲۔کہتے ہیں : میں نے رسول ؐ سے عرض کی : مجھے ان حاکموں کے بارے میں خبر دیجئے کہ جن کے سامنے گردنیں خم ہوتی ہیں اور جسم جھکتے ہیں ؟ فرمایا: جو روئے زمین پر خدا کا سایہ ہیں اگر نیکی کریں تو ان کے لئے اجر ہے اور تمہارے لئے بھی اس کا شکریہ اداکرنا ضروری ہے اور اگر وہبدی کریں تو تم صبر اور بردباری سے کام لو۔

اس حدیث میں رسول ؐ نے ادل بادشاہ کا شکریہ ادا کرنے کو لازم قرا دیا ہے۔

۳۔حضرت موسیٰ بن جعفرسے منقول ہے کہ آپ نے اپنے شیعوں سے فرمایا: حاکموں کے حکم و فرمان کو ٹھکرا کر ذلت و خواری کے اسباب فراہم نہ کرو اگر وہ عادل ہے تو خدا سے اس کو باقی رکھنے کے لئے دعا کرو اور اگر ظالم ہے تو خدا سے دعا کرو کہ اس کی اصلاح کردے، کیونکہ بادشاہ ہی کی بھلائی میں تمہاری بھلائی ہے، عادل بادشاہ مہربان باپ کی مانند ہے اس کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جو اپنے لئے پسند نہ کرو اسے اس کے لئے بھی پسند نہ کرو۔

اس حدیث میں ساتویں امام نے عادل بادشاہ کو مہربان باپ کی مانند قرار دیا ہے بالکل ایسے ہی جیسے نیک و شریف باپ معاشرہ کی خدمت میں نیک و شریف بیٹا پیش کرتا ہے اسی طرح عادل بادشاہ بھی معاشرہ کو کمال کی طرف لے جاتا ہے۔

۴۔ رسول ؐ نے فرمایا: خدا نے تین چیزوں، سورج، چان اور ستاروں کے ذریعہ آسمان کو زینت دی ہے، زمین کو بھی تین چیزوں علماء، بارش اور عادل بادشاہ سے آراستہ کیا ہے۔

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسانی معاشرہ عادل و شائستہ حاکم کے وجود کے سایہ میں آباد و شاداب رہتا ہے۔

ہلاکو خان کا استفتا:

۶۵۶ئ؁ میں جب ہلاکوخان نے بغداد کو فتح کیا او یہ حکم دیا کہ بغداد کے علماء سے یہ معلوم کروکہ کافر عادل بادشاہ افضل ہے یا ظالم مسلمان بادشا ہ؟ مدرسۂ مستنصریہ میں علماء جمع ہوئے اور اس سوال کو دیکھا تو اس کا جواب دینے سے انکار کردیا اس مجلس میں رضی الدین علی بن طاؤس موجود تھے اور علماء کو ان کی شخصیت کا اعتراف تھا جب انھوں نے یہ دیکھا کہ علماء اس سوال کا جواب دینے سے پہلو تہی کررہے ہیں تو انھوں نے قلم اٹھایا اور تفصیل سے تحریر کیا: کافر عادل، ظالم مسلمان سے بہتر و افضل ہے اور یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو رسول ؐ سے نقل ہوئی ہے۔

الملک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مع الایمان۔

کافرعادل بادشاہ کے ہوتے ہوئے ملک و حکومت باقی رہ سکتی ہے لیکن ظالم بادشاہ کے ہوتے ہوئے حکومت باقی نہیں رہ سکتی خواہ وہ مسلمان ہی ہو۔

حکومت کے امور سے آگاہی

اچھے اسلامی حاکم کی ایک خصوصیت یہ ہے وہ حکومت کے امور سے آگاہی رکھتا ہو اور طالوت کے قصہ میں یہ بیان ہوچکا ہے کہ وہ جسمانی لحاظ سے قوی او قیادت و معاشرہ کے مسائل سے آگاہ تھے، حکومت کے امور سے حاکم کا آگاہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے مشعل راہ کہ جو اسے تاریکی میں گرنے سے بچاتا ہے۔

بعض حکماء کا قول ہے:اگرحاکم وقائد کے پاس علم نہ ہو تو وہ اس ہاتھی کی مثل ہ یجو حملہ کے وقت کسی چیز کا خیال نہیں کرتا ہر ایک کوکچل دیتا ہے کیونکہ نہ اس کے پاس عقل ہوتی ہے اور نہ علم ؛ عقل اور علم دونوں ہی ظلم سے باز رکھتے ہیں۔

خوف و ہراس

اچھے حاکم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا ہو، خوف خدا ہر خوبی کی اساس اور برکت کی کنجی ہے۔ جب بادشاہ کے اندر یہ صفت ہوتی ہے تو رعیت اس کے شر سے امان میں رہتی ہے۔حضرت علی ؑ کے حالات میں بیان ہوا ہے کہ ایک روز آپ نے کسی غلام کو آواز دی اس نے اعتناء نہ کی آپ نے دوبارہ آواز دی پھر اس نے کوئی جواب نہ دیا آپ نے پھر آواز دی اسی اثنا میں ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی :اے امیر المومنین ! وہ دروازہ کے پیچھے کھڑا ہے مگر جواب نہیں دے رہا ہے۔

اسی دوران غلام بھی آگیا۔ آپ نے اس سے معلوم کیا، کیا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی ؟ عرض کی : سنی تھی، تو تم نے جواب کیوں نہیں دیا؟ اس نے کہا: چونکہ میں آپ کے ظلم و سزا سے محفوظ تھا۔ آپ نے فرمایا: شکر خدا کہ اس نے مجھے ان لوگوں میں قرار دیا کہ جن سے اس کی مخلوق امان میں ہے۔

عفو و بخشش

حاکم کی ایک اور بہترین خصوصیت، عفو و درگزرکرنا اور لوگوں کی چھوٹی موٹی لغزشوں سے چشم پوشی کرنا ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: اور تمہیں ماف کرنا اور در گزر کرنا چاہیے کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تمہارے گناہوں کو بخش دے۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : جب تم دشمن پر فتحیاب ہوجاؤ تو اس پر تمہاری فتحیابی کا شکریہ، یہ ہیکہ اسے معاف کردو۔

اور مالک اشتر کے نام اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں :خبردار عفودرگزر کرنے پر پشیمان نہ ہونا اور سزا و عقاب دین یپر خوش نہ ہونا۔

پھر اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں :اپنی عفو و بخشش سے انھیں اس طرح مالا مال کردو جس طرح تم خدا کی بخشش و در گزر سے مالا مال ہوناچاہتے ہو، کیونکہ تم ان سے بلند رتبہ پر فائز ہو اور ولی امر تم سے اوپر ہے اور خدا اس پر حاکم ہے جس نے تم کو ولی و حاکم مقرر کیا ہے۔

وفائے عہد

جو نمایاں صفات حاکم میں ہونا چاہیے ان میں سے اس کا عہد وفا کرنا اور وعدہ وفائی کرنا ہے اس سلسلہ میں خداوند عالم فرماتا ہے : واوفو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مسؤلا۔

اور اپنے عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

ملک وملت کی حالت سے آگاہی

حاکم کی ایک اور بہترین خصوصیت یہ ہے کہ ملک کے امور پر اس کی نگاہ ہو اور معاشرہ کے حالات پر اس کی نظر ہو، مثلاً لوگ کس پریشانی میں مبتلا ہیں، ان کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ ان کی ترقی کے لئے زمین ہموار کرنا اور ان کے مشکلات کو برطرف کرنا اس سلسلہ میں مالک اشتر سے فرماتے ہیں :

اے مالک! لوگوں سے زیادہ دن تک پوشیدہ نہ رہو کیونکہ حاکم کا رعیت سے زیادہ دنوں تک مخفیرہنا ایک قسم کی تنگی اور ان کے امور سے نادانی و بے خبری ہے۔ اور حاکم پر لوگوں کے موجودہ حالات پوشیدہ ہوں اور انھیں ایک دوسرے کی خب نہ ہوتو حاکم ان حقائق سے محروم ہو جائے گا جن سے واقف ہونا اس کے لیے ضروری ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان کے نزدیک چھوٹی چیز بڑی اور بڑی چھوٹی ہو جائے گی اور اچھی چیز بری اور بری چیز اچھی ہو جائے گی اور حق و باطل میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

حضرت علی ؑ نے اس خط میں حاکم و عوام کے روابط کو بیان کیا ہے۔ حاکم کو معاشہ کے امور اور اس پر گزرنے والے حالات سے باخبر ہونا چاہیے یہی چیز حاکم کی کامیابی کا راز سمجھی جاتی ہے۔ یہ تھی عادل بادشاہ کی خصوصیت اب ظالم و استبداد گر بادشاہ کی خصوصیت اور معاشرہ پر اس کا اثر ملاحظہ فرمائیں۔

سرکش حکام

قرآن مجید نے حاکموں کی دو قسمیں بیان کی ہیں :خدائی نمائندے عادل امام، جہنم کے ظالم امام، سرکش حاکموں کے کردا کو قرآن مجید اس طرح بیان کرتا ہے : وجعلنا ھم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ینصرون۔

ہم نے ان کو امام و پیشوا بنایاہے وہ لوگوں کو جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور قیامت کے دن ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

یہاں یہ سوال پید ا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا باطل کے پیشوا و امام مقر رکرے جب کہ انبیاء کا یہ کام ہے کہ وہ نیکی و سعادت کی طرف راہنمائی کریں ؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ : ائمہ ضلال (گمراہی کے امام )در حقیقت ان کے اعمال کا نتیجہ ہے اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ ہر سبب کا اثر خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ انھوں نے ایسا راستہ اختیار کیا ہے کہ جو گمراہ لوگوں کی امامت پر منتہی ہوتا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ دوزخ والوں کے ہاتھ کا کھلونا ہیں جس طرحوہ دنیا میں گمراہ لوگوں کے ہاتھ کا کھلونا تھے۔ لہٰذا وہ دنیا و آخرت میں ملعون ہیں اسی آیت کے بعد خداوند عالم فرماتا ہے:

واتبعنا ھم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔المقبوحین۔

اور ہم نے دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت میں وہ روسیاہ ہونگے۔

خدا کی لعنت یہ ہے کہ ان کو رحمت سے دور کردیا گیا ہے اور فرشتوں اور انسانوں کی لعنت و نفرین ہے جو ان پر ہمیشہ پڑتی رہتی ہے۔خداکے نمائندے معصوم امام، سیدھے راستہ کی طرف بلاتے تھے اور یہ گمراہی وہ جہنم کی طرف بلاتے تھے۔

ان دونوں اماموں کے خصوصیات امام صادق ل کی حدیث میں اس طرح بیان ہوئے ہیں، پہلا گروہ خدا کے حکم کو مخلوق کے حکم پر اور اپنے ارادہ پر مقدم کرتا ہے اور اس کے حکم کو بلند سمجھتا ہے جب کہ دوسرا گروہ اپنے حکم و فرمان کو خدا کے فرمان پر مقدم تصور کرتا ہے۔

بالکل اسی طرح جیسے ہر سیاست مدار دنیا میں ایک گروہ کو اپنے پیچھے، پیچھے لے کر چلتا ہے آخرت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ بشر بن غالب نے امام حسین ؑ سے روایت کی ہے کہ میں نے آپ سے اس آیت ’’ یوم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ‘‘ کی تفسیر معلوم کی تو فرمایا:

ایک وہ امام ہے جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے اور کچھ لوگ اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں اور ایک امام وہ ہے جو ضلالت و گمراہی کی طرف بلاتا ہے اور ایک گروہ اس کی دعوت کو قبول کرتا ہے۔ پہلا گروہ جنت میں اور دوسرا جہنم میں جائے گا اور یہی خدا کے قول کے معنی ہیں کہ ایک گروہ جنتی ہے اور ایک گروہ جہنمی ہے۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

ان فی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ والفساد

ظالم و جابر حاکم کی حکومت میں حق فرسودہ و پرانا ہوجاتا ہے اور باطل زندہ ہوجاتا ہے اور ظلم و جور اور فتنہ و فساد آشکار و ظاہر ہو جاتا ہے۔

رسول ؐ فرماتے ہیں : لکل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السوئ۔

ہر چیز کے لئے ایک آفت ہے جو اسے خراب کردیتی ہے اور دین کی آفت برے بادشاہ اور ناہنجار پیشوا ہیں۔

امام محمد باقر ؑ : لیس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الفسق

تین افراد کا معاشرہ میں کوئی احترام نہیں ہے ایک بدعت گزاری کی ہوس رکھنے والا، دوسرے ظالم راہنما و حاکم تیسرے وہ فاسق جو کھلم کھلا بدکاری کرتا ہے۔

مذکورہ حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرکش حاکم کے وجود سے معاشرہ میں حق نابود اور باطل زندہ ہوجاتا ہے او ر معاشرہ میں فتنہ و فساد کا پھوٹ پڑتا ہے۔

طاغوتی نظام، روشنی سے نکلنا اور تاریکی میں داخل ہونا:

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: والذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الی الظلمات۔

جو لوگ کافرہوگئے ہیں ان کے سر پرست طاغوت ہیں جو ان کو نور سے نکال کر تاریکی میں کھینچ لے جاتے ہیں۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

اس شخص کا کوئی دین نہیں ہے جو ظالم امام کی ولایت و حکومت کے سایہ میں جاتا ہے اور اس شخص کو کوئی خوف نہیں ہے جو خدا کی طرف سے منصوب عادل امام سے قریب ہوتا ہے، ابن ابی یعفور کہتے ہیں میں نے امام سے دریافت کیا: کیا ان لوگوں کا کوئی دین نہیں ہے اور ان لوگوں کے لئے کوئی خوف نہیں ہے؟ فرمایا: ان کا کوئی دین نہیں ہے اور ان کے لئے کوئی خوف و باک نہیں ہے۔ کیا تم نے خدا کا قول نہیں سنا کہ فرماتا ہے: خدا ان مومنوں کا ولی ہے جو تاریکی سے نکل کر نور و روشنی میں آئے ہیں (لیکن اس کے برخلاف کافر سرپرست لوگوں کو روشنی و نور سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔)

علی کی نظر میں خیانت کار حاکم

حضرت علی ؑ نے ’’ ارد شیرحرہ ‘‘ کے حاکم مصقلہ بن ہبیرہ شیبانی کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ہے: میں نے تمہارے بارے میں ایک بات سنی ہے اگر تم نے ایسا کیا ہے تو اپنے خدا کو غضبناک کیا اور امامت سے روگردانی کی:

مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم نے اس مال کو، کہ جس کو مسلمانوں نے اپنے نیزوں اور گھوڑوں کے ذریعہ اور اپنا خون بہا کر جمع کیا ہے، اپنے ان عرب رشتہ داروں کے درمیان تقسیم کیا ہے جنھوں نے تم کو منتخب کیا ہے۔ اس خدا کی قسم جن نے دانہ کو شگافتہ اور انسان کو پیدا کیا ہے اگر یہ خبر سچی ہوگی تو تم مجھ سے اچھا سلوک نہیں دیکھو گے اور میرے نزدیک تمہارا کوئی وزن نہیں رہے گا۔ پس اپنے پروردگار کے حق کو حقیر نہ سمجھو اور اپنے دین کو برباد کرکے اپنی دنیا کو آباد نہ کرو کہ گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوجاؤ گے۔

بحار میں اس خط کی عبارت اس طرح ہے:

بیشک امت سے خیانت کرنا بہت بڑی خیانت ہے اور بہت بڑا مکروحیلہ ہے یہ امام سے خیانت ہے تمہارے پاس مسلمانوں کے حقوق میں سے پانچ سو درہم ہیں، جب تمہارے پاس میرا قاصد آئے توانھیں میرے پاس بھیج دینا۔

چونکہ مصقلہ نے مسلمانوں کے مال پر دست تعدی دراز کیا تھا اس لئے حضرت علی ؑ نے اسے اس خط میں ملامت و سرزنش کی ہے، حضت علی ؑ کی نظر میں حاکم کا خیانت کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

ابوذر کی درخواست کا رد کیا جانا

ابوذر کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے رسول ؐ کی خدمت میں عرض کیا: کیا مجھے حکومت کا منصب نہیں دیجئے گا ؟ ابوذر کہتے ہیں : آپ نے میرے شانے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابوذر تم ضعیف ہو اور حکومت ایک امانت ہے اور قیامت کے روز یہ شرمندگی اور رسوائی کا باعث ہوگی مگر اس شخص کے لئے جو اسے حق کے ساتھ لے اور حق کے ساتھ ادا کرے۔

اس قصہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود یکہ ابوذر حضرت رسول خدا ؐ کے خاص افراد میں سے تھے لیکن رسول ؐ ان سے یہ فرماتے ہیں : تمہارے اندر حکومت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ حاکم کے اتنے ہی حقوق کے بیان کرنے پر اکتفاء کی جاتی ہے۔

استاد کا حق

تمہارے اوپر معلم و استاد کا حق یہ ہے کہ اس کی تعظیم کرو اور اس کے درس کی مجلس کا احترام کرو اور اس کے درس کو غور سے سنو اور ہمہ تن گوش اس کی طرف متوجہ رہو، اس کی مدد کرو تاکہ وہ تمہیں اس چیز کی تعلیم دے جس کی تمہیں ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں تم اپنی عقل کو آمادہ کرو اور اپنے فہم و شعور اور دل کو اس کے سپرد کردو او ر لذتوں کو چھوڑ کر اور خواہشوں کوگھٹا کر اپنی نظر کو اس پرمرکوز کردو تمہیں یہ جان لینا چاہیے کہ جو چیز وہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے اس میں تم اس کے قاصد ہو چنانچہ تمہارے اوپر لازم ہے کہ اس چیز کی تم دوسروں کو تعلیم دو اور اس فرض کو تم بخوبی ادا کرو اور اس کا پیغام پہنچانے میں خیانت نہ کرو اور جس چیز کو تم نے اپنے ذمہ لیا ہے اس پرعمل کرو اور طاقت و قوت صرف خدا کی طرف سے ہے۔

کتاب مکارم الاخلاق میں یہ جملے نقل ہوئے ہیں :

اور استاد کے مقابلہ میں اپنی آواز بلند نہ کرو اور اس سے سوال کرنے والوں میں سے کسی کا جواب نہ دو یہاں تک کہ وہ خود اس کا جواب دے اور اس کی مجلس میں کسی سے بات نہ کرو اور کسی سے اس کی غیبتنہ کرو اور جب تمہارے سامنے اس کا ذکر بدی کے ساتھ کیا جئے تو تم اس کا دفاع کرو اور کے عیوب کی پردہ پوشی کرو اور اس کے دوست سے دشمنی نہ کرو، اگر تم ایسا کروگے تو خدا کے فرشتے گواہی دیں گے کہ تم نے خدا کا قصد کیا تھا اور تم نے خدا کے واسطہ اس کا علم سیکھا تھا نہ کہ لوگوں کے لئے۔

امام زین العابدین ؑ نے معلم و استاد کے جو حقوق بیان کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔استاد کی تعظیم و تکریم۔

۲۔تحصیل علم کے سلسلہ میں استاد سے مدد لینا۔

۳۔استاد سے علم حاصل کرنے کے لئے دل کو آمادہ کرنا۔

۴۔اپنی آواز کو استاد کی آواز پربلند نہ کرنا۔

۵۔جب اس سے سوال کیا جائے تو اس سے پہلے جواب نہ دینا۔

۶۔استاد کے سامنے کسی سے بات نہ کرنا۔

۷۔کسی سے غیبت نہ کرنا۔

۸۔اگراستاد کی بد گوئی کی جائے تو اس کا دفاع کرنا۔

۹۔اپنے استاد کے عیوب کو چھپانا۔

۱۰۔اس کے فضائل و مناقب کوآشکارکرنا۔

۱۱۔استاد کے دشمن کے پاس نہ بیٹھنا۔

۱۲۔ اس کے دوست سے دشمنی نہ کرنا۔

علم کی اہمیت

معلم و استاد کے حق سے بحث کرنے سے پہلے لازم ہے کہ مختصر طور پر اسلام و قرآن کی نظ میں علم کی اہمیت کو بیان کردیا جائے علم کی اہمیت تو ہر ایک پر ورشن ہے اور ہر شخص فطری طور پر علم کو دوست رکھتا ہے اور علم و عالم کا احترام کرتا ہے۔ رسول ؐ پر اولین وحی میں اورمبدا عالم سے ارتباط میں علم کو پیش کیا جاتا ہے:

اقراء۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خلق۔ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام سے کہ جس نے پیدا کیا۔

رب اور تربیت اور مسئلہ خلقت اہم ترین علوم کے مسائل میں شمار ہوتا ہے، پھر قلم کے ذریعہ تعلیم کو بیان کیا گیا ہے۔ الذی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یعلم۔ تعلیم ؛پڑھنا لکھنا او آخر میں یہ کہ انسان کچھ بھی نہیں جانتا تھا یہ اہم موضوع وحی کے آغاز میں انسان کا علم کے بلند ترین مرتبہ پر پہنچنے سے پہلے اور عالم ناسوت سے عالم لاہوت کی طرف پرواز اور خدا تک رسائی کے شرو ع میں بیان ہوا ہے۔

رسد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آدمیت۔

علم و دانش کے بارے میں قرآن مجید انسان کے ضمیر سے فیصلہ چاہتا ہے۔

کیا وہ لوگ جو جاتے ہیں اور وہ لوگ جو نہیں جاتے دونوں برابر ہیں ؟ اس بات کو عقل والے ہی سمجھتے ہیں۔(واضح ہے کہ دونوں کو ہرگز کو برابر نہیں سمجھا جاسکتا۔)

قرآن کہتا ہے : قل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والطیب۔ خبیث و پلید اور پاک و صاف برابر نہیں ہیں۔

وما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والحرور۔ اور نہ اندھا اور دیکھنے والا اور نہ نو و ظلمت اور نہ سایہ و گرمی برابر ہیں۔ طیب، بصیر، نوروظل سے مراد علم ہے جیسا کہ خبیث، اعمی اور ظلمات و حرور سے مراد جہالت و نادانی ہے۔

قل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الکتاب۔ کہدیجئے کہ تمہارے اور میرے درمیان خدا اور وہ شخص گواہ ہے جس کے پاس علم کتاب ہے۔ اس آیت میں ’’ عالم ‘‘ شاہد کے عنوان سے خدا کے ساتھ بیان ہوا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم کو خدا کا تقرب حاصل ہے۔

یرفع۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ درجات۔

خدا تم میں سے ان لوگوں کے کہ جو ایمان لائے ہیں اور ان لوگوں کے درجات بلند کرتا ہے جن کو علم دیا گیا ہے۔

یہ تھی علم کی اہمیت اور اس کی قدروقیمت اب معلم کی اہمیت و عظمت ملاحظہ ہو۔

معلم کی اہمیت

رسول خدا ؐ فرماتے ہیں : علما کی زیارت و ملاقات خدا کے نزدیک خانۂ کعبہ کے ستر طوافوں سے زیادہ محبوب ہے، اور ستر مقبول حج و عمہ سے افضل ہے اور خدا علماء کی زیارت کرنے والے کے ستر درجات بلند کرتا ہے اور خدا اس پر رحمت نازل کرتا ہے اور فرشتے یہ گواہی دیتے ہیں کہ اس پر جنت واجب ہوگئی ہے۔

اس حدیث میں رسولؐ نے لوگوں کو علماء کے درس میں شریک ہونے کی ترغیب دلائی ہے۔

رسول ؐ نے فرمایا: اے ابوذر! عالم کے پاس اس وقت ایک گھنٹہ بیٹھنا جب وہ علمی مذاکرہ میں مشغول ہو خدا کے نزدیک ان ہزار راتوں سے زیادہ محبوب ہے جن میں سے ہر رات میں ہزار رکعت نماز پڑھی ہو۔ اے ابوذر عالم کے پاس بیٹھنا جب کہ وہ علمی مذاکرہ کررہا ہو خدا کے نزدیک ہزار جنگوں میں شرکت کرنے اور پورے قرآن کی تلاوت کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔

رسول ؐ کا ارشاد ہے: جو مومن ایک گھنٹہ عالم کے پاس بیٹھتا ہے اسے اس کا پروردگار ندا دیتا ہے تم میرے حبیب کے پاس بیٹھے ! قسم ہے مجھے میری عزت و جلال کی میں تمہیں اس کے ساتھ جنت میں جگہ دونگا اور اِس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

اس بیان میں اس استاد کو خدا کا حبیب و دوست قرار دیا گیا ہے جو علمی مذاکرہ میں مشغول ہو اور اس کا یہ مرتبہ بیان کیا گیا ہے کہ جو طلبہ اس کے درس میں شرکت کرتے ہیں ان سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ البتہ یہ کہنا چاہیے یہ ثواب اس استاد و شاگرد کو ملے گا جو خدا کے لئے درس دے گا اور جو خدا کے لئے درس پڑھے گا۔

استاد کا کردار

امام محمد تقی ؑ فرماتے ہیں جوکہنے والے کی بات کو سنتا ہے وہ اس کی پرستش کرتا ہے، اگر کہنے والاخدا کی طرف سے ہوتا ہے تو وہ خدائی بات کہتا ہے اور سننے والا خدا کی عبادت کرتا ہے اور اگر کہنے والا شیطان کی زبان سے بولتا ہے تو سننے والا شیطان کی عبادت کرتا ہے۔

اس حدیث میں بیان کییہ تاثیربیان کی گئی ہے کہ اگر سننے والا کہنے والے کو استاد سمجھتا ہے تو وہ اس کی باتوں کو بہت اہمیت دیتا ہے اور کبھی تو اسے وحی منزل سمجھتا ہے۔

مالک اشتر کو علی ؑ کی نصیحت:

اے مالک علماء کے پاس بیٹھو اور حکماء سے گفتگو کرو اور ملک کے امور کو برقرار رکھنے میں اور جو تم سے پہلے لوگوں نے کیا ہے اسے قائم کرنے میں ان کے بیان سے استفادہ کرو۔

ایک استاد کا کردار:

۱۔ عمر بن عبدالعزیز جو کہ بنی امیہ سے تھا، بچوں کے ساتھ کھیلتے وقت حضرت علی ؑ پرسب وشتم والی اس رسم بد کو دہراتا تھا جو معاویہ نے جای کی تھی۔ ایک روز اس کا استاد اس کے پاس سے گزرا اور اس کی زبان سے سب و شتم سنی تو درس کے جلسہ میں اس سے سختی سے پیش آیا جب عمر بن عبدالعزیز نے نااض ہونے کا سبب معلوم کیا تو معلم نے کہا: بیٹا آج میں نے سنا کہ تم حضرت علی ؑ پر سب و شتم کررہے تھے تمہیں یہ کب معلوم ہوا کہ وہ لعنت کے مستحق ہوگئے تھے؟ ! عمر بن عبدالعزیز نے استاد سے وعدہ کیا کہ اب ایسا نہیں کرے گا یہ سلوک اس بات کا سبب ہوا کہ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوا تو اس نے اس رسم کو ممنوع قرارد یا اور اس کی جگہ آیہ: ان اللہ۔۔۔۔۔ کو پڑھنے کا حکم دیا یہ تھا معلم کے کردار کا معمولی اثر۔

جب یزید کا بیٹا معاویہ تخت خلافت پر بیٹھا تو لوگوں کو بلایا اور منبر پر گیا اور خلافت سے استعفیٰ دے دیا اس کی ماں اور مروان نے اس کو بہت سمجھایا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا آخر کار وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ معاویہ نے خلافت سے استعفیٰ کیوں دیا ہے؟ تحقیق کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ معاویہ کی فکر کو بدلنے میں اس کے استاد، عمرالمقصوص کا اہم کردار ہے۔ انھوں نے اسے طلب کیا اور اس سے کہا: تم نے اس کے دل میں علی کی محبت کو کیوں زندہ کیا؟ اس جرم کی پاداش میں اس کو ایک گڑھے میں زندہ دفن کر دیا۔

یہ ہے معلم کا کردار کہ کسی بھی شخص کی زندگی کی ڈگر کو بدل دیتا ہے جس کے نتیجہ میں قوم کی زندگی کی ڈگر بدل جاتی ہے۔

کس استاد کا انتخاب کریں ؟

اس چیز کو خداوند عالم نے قرآن مجید میں ہمارے لئے روشن کر دیا ہے کہ ہم کس استاد سے سبق لیں اور اپنے لئے کیسے استاد کا انتخاب کریں۔

انسان کو اپنے کھانے کو دیکھنا چاہیے ہم نے پانی کو نیچے اتارنے کی طرح نیچے اتارا پھر ہم نے زمین و شگافتہ کرنے ی طرح شگافتہ کیا پھ ہم نے اس میں دانے اگائے۔

بظاہر یہ آیتیں آدمی ی جسمانی غذا کے بارے میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ اس میں بارش، شگافتہ رنا زمین اور اناج کا اگنا بیان ہوا ہے لیکن قرآن ووحی کیعالم ائمہ ہدیٰ نے اسے آیت کو انسان کی معنوی و روحانی غذا پر حمل کیا ہے۔ مرحوم فیض کاشانی تفسیر صافی میں اس طرح نقل کرتے ہیں جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

امام محمد باقر ؑ سے خدا کے اس قول فلینظر۔۔۔۔۔۔۔۔۔حبا۔ کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ طعام کے یہاں کے معنی ہیں ؟ فرمایا: اس سے علم مراد ہے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ کس استاد سے علم حاصل کررہے ہو۔

اس کے بعد مرحوم فیض لکھتے ہیں : طعام کی دو قسمیں ہیں جسمانی اور روحانی چونکہ انسان جسم و روح سے مل کر بنا ہے لہٰذا جس طرح اسے جسمانی غذا کے بارے میں یہ سوچنا چاہیے کہ کس طرح بارش ہوئی، زمین شگافتہ ہوئی اور دانے سخت زمین سے اگے اسی طرح اسے روح و جان کی غذا کے بارے میں غور کرنا چاہیے کہ علم کس طرح وحی کی صورت میں زمین نبوت اور قلب پیغمبر پر نازل ہوا ہے اور جن لوگوں کے دلوں میں تربیت پانے کی قابلیت ہے وہ باران وحی سے کس طرح استفادہ کرتے ہیں اور اس غذا سے مراد یہ ہے کہ اہل بیت صلوات اللہ علیہم اجمعین کی راہ سے علم حاصل کرو۔

واضح ہے کہ جس طرح ناقص و زہریلی غذا آدمی کے بدن پر غلط اثر ڈالتی ہے اور کبھی اسے موت کی منزل تک پہنچا دیتی ہے اسی طرح سنی جانے والی باتیں اور یادی النظر میں بھلی لگنے والی چیز بھی انسان کی فکر کو متاثر کرتی ہیں اور اسے منحرف کردیتی ہے اور آدمیت کی سعادت و کامیابی کے محل کو ویران کر دیتی ہیں اور انسان کی دنیا و آخرت کو تباہ کردیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم کان اور سنی جانے والی چیزوں کے بارے میں پہلے بیان کرچکے ہیں۔

استاد کے حقوق کی رعایت امام محمد باقر ؑ کی نظر میں

حضرت امام محمد باقر ؑ فرماتے ہیں : جب تم کچھ سننے کے لئے استاد کے سامنے بیٹھو توتم کہنے سے زیادہ سننے کی حرص کرو اور اچھی طرح سننے کا طریقہ سیکھو جس طرح تم اچھی طرح بولنا سیکھتے ہو اور کسی کے بولتے وقت اس کے کلام کو قطع نہ کرو۔

کسی کے سلسلہ ٔ کلام کو قطع کرنا مذموم اور خلاف اخلاق ہے خصوصا اگر استاد بول رہا ہے تو ادب اقتضا یہ ہے کہ صبر کرو تاکہ استاد کی بات مکمل ہوجائے اس کے بعد اپنی کہو۔ اس حدیث میں امام محمد باقر ؑ نے ان بعض حقوق کی طرف اشارہ کیا ہے جو امام زین العابدین ؑ نے بیان فرمائے ہیں۔

استاد کا حق حضرت علی ؑ کی نظر میں

حضرت امام صادق ؑ فرماتے ہیں : حضرت علی ؑ فرمایا کرتے تھے استاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس سے زیادہ سوال نہ کو اس کا لباس نہ پکڑو اس کے پاس جاؤ اور اس کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوں تو تم سب کو سلام کرو اور استاد کو خاص طور پر سب سے الگ سلام کرو اس کے سامنے بیٹھو اس کے پیچھے نہ بیٹھو اور نہ آنکھ سے اشارہ کرو اور نہ ہاتھ سے۔ اس کے سامنے اس کے قول کے خلاف زیادہ بات نہ کرو اور اس کے پاس زیادہ نہ بیٹھو کہ وہ اکتا جائے، عالم کی مثال تو بس اس پھل دار درخت کی سی ہے جس سے پھل گرنے کی توقع رہتی ہے۔ انسان کو استاد کے ذہن کی طرف نظر رکھنا چاہیے کہ کب اس کے دہن سے علم کا گوہر نکلے۔

حضرت علی ؑ کی اس حدیث میں بھی ان بعض حقوق کی طرف اشارہ ہوا ہے جو امام زین العابدین ؑ نے بیان فرمائے ہیں۔ اب ہم ان استاد و شاگرد کا قصہ بیان کرتے ہیں جو خدا کے اولوالعزم پیغمبر ہیں کہ انھوں نے استاد کے حقوق کی رعایت کس طرح کی اور سب کو سوال کرنے اور لم سیکھنے کا سلیقہ سکھایا۔

استاد کا احترام قرآن کی نظر میں

حضرت موسیٰ اور جناب خضر کی دلچسپ داستان قرآن کے سورۂ کہف میں بیان ہوئی ہے حضرت موسیٰ کو حکم ہوتاہ ے کہ استاد تلاش کرو اور جو نہیں جانتے اس سے سیکھو قرآن مجید نے صریح طور پر خضر کا نام نہیں لیا ہے بلکہ ’’ عبدا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہا ہے یعنی ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ لیکن احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس استاد کا نام خضر ہے۔

موسیٰ اگرچہ کلیم اللہ ہیں صاحب رسالت اور اولوالعزم ہیں اور صاحب شریعت ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انھیں یہ حکم ہوتا ہے کہ استاد کے پاس جائیں موسیٰ بنی اسرائیل کے رشید و شجاع یوشع بن نون، کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں اور استاد کوتلاش کرتے ہیں اور اسے پالیتے ہیں۔

آخر کار موسیٰ اور ان کے ساتھی نے اس استاد کو تلاش کرلیا۔ اس عظیم استاد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عبودیت کے بلند و رفیع مرتبہ پر فائز ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ خدا نے اسے اپنا علم تعلیم کیا ہے۔

یہ تو طے ہے کہ یہ شاگر د بعضباتوں میں استاد سے افضل ہے لیکن استاد ہوتے ہوئے بھی وہ یہ جانتے ہیں کہ انھیں تمام علوم نہیں دئیے گئے ہیں، اس سفر کی مشقت اٹھاتے ہیں تاکہ استاد کے مخصوص علوم سے بہرہ مند ہوں جب استاد سے ملاقات ہوئی تو نہایت ہی ادب کے ساتھ اس طرح گزارش کی:

کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ آپ مجھے ان حقائق کیتعلیم دیں جو آپ کو سکھائے گئے ہیں ؟

وہ کہتے ہیں : تم میرے ساتھ صبر نہیں کرسکوگے اور تم اس چیز پر کیسے صبر کرسکتے ہو جس کو تم نہیں جانتے؟ موسیٰ نے کہا: انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے حکم کی مخالفت نہیں کرونگا۔

سوال و جواب کے اس سلسلہ میں کچھ آداب نظر آتے ہیں جن کی رعایت کرنا شاگرد کے لئے ضروری ہے:

۱۔ موسیٰ خود کو استاد کا تابع قرار دیتے ہیں لہٰذا اپنے مرتبے کو استاد کے مرتبہ سے کم جانتے ہیں۔

۲۔ یہ بہت بڑا مبالغہ ہے کہ استفہامیہ انداز میں اجازت چاہتے ہیں (کیا اجازت ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہ کر علم حاصل کروں ؟ اپنے استاد کے سامنے انتہائی خاکساری کا اظہار کرتے ہیں۔)

۳۔ یہ شاگرد خود کو استاد کے سامنے ہیچمداں ظاہر کرتے ہیں اور ’’ ان تعلمن ‘‘ کے ذریعہ اس کے بلند مرتبہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۴۔ استاد کے لئے شاگرد کے فریضہ کی طرف اشارہ ہوا ہے: پیروی، تعلیم، خدمت، یعنی شاگرد کو پہلے مرحلہ میں استاد کے تابع ہونا چاہیے تاکہ علوم کے آخری درجہ پر پہنچ سکے۔

۵۔ ’’ ان تعلمن ‘‘ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موسیٰ صرف طالب علم ہیں، جاہ ومنصب اور مال کے طلبگار نہیں ہیں، یہ اہم نکتہ ہے اس سے تما م طلبہ کو دوران تعلیم استفادہ کرنا چاہیے اور استاد سے علم کے غلاوہ اورکسی چیز کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔

۶۔ ’’ مما علمت ‘‘ موسیٰ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ خضر کے پاس وہ علوم ہیں جو انھیں خدا نے تعلیم کئے ہیں اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ استاد ایک الٰہی منصب ہے اور انسان نے خدا سے علم لیا ہے۔

۷۔ کلمہ ’’ رشد ‘‘ درخواست دار شاگرد کی حکایت کررہا ہے، موسیٰ چاہتے ہیں کہ خضر کے ارشاد و ہدایت سے استفادہ کریں۔

استاد کی باتیں تربیتی نکات

۱۔ ’’ انک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے عجلت و بے صبری سے علم حاصل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ علم حاصل کرنے کے لئے انسان کو ہر مشکل کا مقابلہ کرنا چاہیے دوسرے یہسمجھنا چاہیے کہ صبر کرنے والوں کا بڑا مرتبہ ہے۔

۲۔ استاد موسیٰ کے صبر کی نفی کررہے ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ خضر کے کاموں کے فلسفوں کو سمجھنے کے لئے عجلت سے کام نہ لیں۔

۳۔ اس سفر کی زحمت کو بردایت کرکے موسیٰ کیا چیز تلاش کررہے ہیں ؟ لائق و شائستہ استاد ڈھونڈ رہے ہیں، اس سے ہمیں یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ اچھا استاد تلاش کرنے کے لئے رنج ومشقت اٹھانا چاہیے جیسا کہ گذشتہ احادیث میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ائمہ نے یہ حکم دیا ہے: ہ شخص سے علم نہ لو بلکہ ہمیں مکتب ولایت سے علم حاصل کرنا چاہیے۔

موسیٰ علمی سفر میں اپنے استاد کے کاموں پر اس وقت اعتراض کرتے ہیں جب استاد کشتی میں سوراخ کرتے ہیں، بچہ کو مار ڈالتے ہیں اور ٹوٹی، پھوٹی دیوار کو بنا دیتے ہیں سب پر موسیٰ اعتراض کرتے ہیں لیکن بعد میں ان کے فلسفہ و اسرار سے واقف ہوجاتے ہیں۔ یہ داستان سورۂ کہف میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

استاد کا مرتبہ غزالی کی نظر میں :

محمد غزالی کہتے ہیں : انسان جن علوم کو حاصل کرتا ہے ان میں اس کی چار حالتیں ہوتی ہیں جیسے مال جمع کرنے والے کی۔

۱۔مال جمع کرنے کی حالت

۲۔ مال ذخیرہ کرنے کی حالت

۳۔ مال سے خود استفادہ کرنے کے حالت

۴۔راہ خدا میں خرچ کرنے اور دوسروں کی مدد کرنے کی حالت یہ مال کسب کرنے والے کی بہترین حالت ہے اسے سخی کہا جاتا ہے۔

عالم بھی پہلے علم حاصل کرتا ہے کسب کنندہ ہے لیکن مال کا نہیں۔ دوسرے علم کو ذخیرہ کرتا ہے تیسرے وہ خود علم سے استفادہ کرتا ہے چوتھے وہ حاصل کئے ہوئے علم کو دوسروں کو تعلیم دیتا ہے یہ حالت سب سے بہترین حالت ہے کہ اس سے وہ معاشرہ کو ہلاکت سے نجات دلاتا ہے۔

یعنی غزالی اس بات کے معتقد ہیں کہ عالم کی بہترین حالت یہ ہے کہ وہ درس دے اور دوسرے اس کے علم سے استفادہ کریں اور وہ لوگوں کو بصیرت و فکری رشد کے طریقے سکھائے۔

استاد یا ماہر نفسیات

شاگرد کو چاہیے کہ وہ استاد کو ماہر نفسیات سمجھے جس طرح ڈاکٹر دوا اور علاج کے ذریعہ مریض کو صحت و سلامتی کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح استاد بھی شاگرد کو عقل ودین کی سلامتی اور کمال انسانیت کی طرف بلاتا ہے اوراس سلسلہ میں شفا بخش دواؤں، وعظ و نصیحت سے استفادہ کرتا ہے۔ لہٰذا شاگردوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ استاد کی باتوں کو اچھی طرح سنیں تاکہ تعلیم حاصل کرنے کے ضمن میں وہ طمع و تکبر اور غرور ایسے امراض سے نجات پائے۔

استاد کی تعظیم علم کی تعظیم ہے:

علمائے سلف میں سے ایک عالم جب استاد کے جلسہ میں شرکت کے لئے وانہ ہوتے تھے تو فقیر کو کچھ صدقہ دیتے تھے اور کہتے تھے: اے اللہ ! میری نظر سے میرے استاد کے عیوب کو مخفی رکھ اور ان کے علم و دانش کو برکتوں سے مجھے محروم نہ کر۔

دوسرے عالم کہتے ہیں : میں استاد کی ہیبت کی وجہ سے کتاب کا ورق میں آہستہ سے کھولتا تھا تاکہ کاغذ کی آواز سے استاد کو تکلیف نہ ہو۔ البتہ اس قسم کی مراعات اسے شخص سے مربوط ہوتی ہیں جس نے خود کو پالیا ہو۔

خویش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آب حیات

حمدان اصفہانی کہتے ہیں : میں ’’ شریک‘‘ کے پاس موجود تھا کہ اچانک خلیفہ عباسی یعنی مہدی کا بیٹا داخل ہوا اور دیوار سے ٹیک لگا کر استاد سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا۔ لیکن شریک نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اس نے اپنی بات کی تکرار کی پھر بھی شریک نے کوئی اعتناء نہ کی۔

خلیفہ کے بیٹے نے شریک کو مخاطب کرکے کہا: کیا آپ خلفا کی اولاد کی توہین کرتے ہیں ؟ شریک نے کہا: نہیں، مگر یہ کہ علم کا مرتبہ خدا کے نزدیک اس سے کہیں بلند ہے کہ میں اسے دوسروں ے حسب منشاء تباہ کروں۔ خلیفہ کا بیٹا آگے بڑھا اور شریک کے سامنے زانو ئے ادب تہ کیا۔ اس وقت شریک نے کہا: اس طرح علم حاصل کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : شاگرد کو استاد کے سامنے فروتنی کرنا چاہیے : استاد و معلم، روحانی باپ ہے جو شاگرد کو روحی وفکری غذا دیتا ہے اس لئے اس کے اوپر استاد کا احترام لازم ہے۔ یہ غذا استاد قوت سامعہ کے ذریع ہشاگرد کے اندر منتقل کرتا ہے۔ لہٰذا طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھی طرح استاد کی باتیں سنے۔

شاگرد کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ معلم و استاد اس کا علمی باپ شمار ہوتاہے اور علمی باپ کا احترام جسمی باپ کے احترام سے کم نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ ہے اس لئے اس کی آواز پر آواز بلند نہیں کرنا چاہیے بلکہ استاد کے سامنے باتیں کرنے میں بھی احتیاط کرنا چاہیے۔

شاگرد کو چاہیے کہ وہ استاد کے عیوب کو چھپائے اور اس کے فضائل و خوبیوں کو ظاہر کرنے میں کوشاں ہے۔ اسکندر سے کہا گیا : آپ اپنے استاد کا اتنا احترام کرتے ہیں اسے اپنے ماں باپ سے زیادہ سمجھتے ہیں ؟ اس نے جواب دیا: استاد میری حیات ابدی کا سبب ہے جب کہ ماں،باپ میری دنیوی اور فانی زندگی کا سبب ہیں۔

اجتماعی تکامل کا ایک مرحلہ جو کہ معاشرہ کے حصہ میں آتا ہے، اچھا اور لائق استاد ہے۔ اساتذہ معاشرہ کو زندہ کرنے اور اسے جہالت و نادانی اور فکری و ثقافتی لٹیروں سے بچانے کے لئے اٹپھے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنا عظیم سرمایہ یعنی اپنی عمر کو قربان کیا ہے، سقراط کو قید کردیا جاتا ہے تو اس کے شاگرد اسے رہا کرانے کے لئے جان کی بازی لگانے کا اقدام کرتے ہیں لیکن اسنے قانون شکنی پر موت کا جام پینے کو ترجیح دی اور شاگردوں کو اس کی اجازت نہ دی۔

آخر میں ہم امام حسین ل کے طریقہ کار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی’’ نے امام حسین کے کسی بچہ کو سورۂ حمد یاد کرایا تو آپ ؑنے اسے ہزار اشرفی اور ہزار جامے عطا کئے اور اس کا منھ موتیوں سے بھر دیا۔ بعض لوگوں نے اس عطا کو زیادہ خیال کیا آپ ؑ نے فرمایا: یہ عطا اس کی عطا کا جبران و تلافی نہیں کرسکتی، قرآن کی تعلیم کے عوضجتنا بھی دیا جائے کم ہے۔

مولا کا حق

لیکن اس شخص کا حق جو تم پ سلطنت رکھتا ہے (مالک کا حق، بادشاہ کے حق کی مانند ہے)

وہ بادشاہ ہی کی مانند ہے مگر یہ کہ مالک خاص حق رکھتا ہے جو بادشاہ نہیں رکھتا اور اس کا یہ مخصوص حق ہر کم وبیش میں تم پر اس کی اطاعت کو لازم کرتا ہے۔بشرطیکہ اس کا حق خدا کے واجب حق کے برخلاف نہ ہو اور تمہارے اور خدا کے حق کے درمیان حائل نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتو خدا کا حق مقدم ہے۔ اور جب تم خدا کا حق ادا کردو گے تو پھر مالک کے حق کی نوبت ہے اس کو ادا کرو۔خدا کی طاقت و قوت کے علاوہ کوئیطاقت نہیں ہے۔

مکارم الاخلاق میں اس طرح نقل ہوا ہے:

لیکن مالک کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو اس کی نافرمانی نہ کرو مگر اس چیز میں جو خدا کی ناراضگی و غضب کا باعث ہو کیونکہ خدا کیمعصیت میں کسی بندہ کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔

امام زین العابدین ؑ کے بیان سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مالک اور بادشاہ کا حق ایک جیسا ہے مگر یہ کہ مالک کا حق اپنے غلام پر زیادہ حق ہے وہ اسے مطیع بنا لیتا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حق کی شرح میں یہ بیان کیا جائے کہ غلامی کا آغاز کس زمانہ سے ہوا ہے اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ البتہ یہاں عام ملکیت مراد ہے صرف غلامی ہی نہیں۔

غلامی کی تاریخ

غلامی کی تاریخ کہاں سے شروع ہوئی ہے یہ واضح نہیں ہے اس کے سر چشمہ کے بارے میں مختلف نظریات کا اظہار ہوا ہے ’’ منٹسکیو ‘‘ غلامی کے عوامل کے بارے میں لکھتا ہے : ممکن ہے غلامی کا امل درج ذیل عوامل میں سے کوئی ایک ہو۔

۱۔ بین الاقوامی قانون یہ رہا ہو کہ جنگی قیدی غلاموں کے خکم میں ہیں تاکہ وہ قتل ہونے سے بچ جائیں۔

۲۔ جو لوگ اپنا قرض ادا نہیں کرسکتے تھے ان کو روم کے قانون نے یہ اجازت دی تھی کہ وہ خود کو فروخت کرکے اپنا قرض ادا کرسکتے ہیں یا قرض خواہ کیقرض کے عوض اس کے غلام بن جائیں۔

۳۔ قانون تبیعت غلام باپ کے بچہ کو بھی غلام بنا دیتا ہے بنابرایں بچہ باپ کے تابع ہے۔

۴۔ غلامی کے حق کا سرچشمہ ایک قوم کا دوسری قوم کو حقیقر سمجھنا ہے جس کی بنیاد عادات و رسوم کا اختلاف ہوتا ہے۔

۵۔ اس کا اصلی سرچشمہ انسانی معاشرہ میں قوی وکمزور افراد کا وجود ہے۔

اس کے بعد منٹسکیو لکھتے ہیں :

ارسطو یہ ثابت کرنے چاہتے ہیں : غلام فطرتا غلام تھا اور رہے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے بعض انسانوں کو غلام پیدا کیا ہے تاکہ وہ دوسروں کے غلام رہیں۔ اگر ہم اس فلسفی کی بات کو قبول کرلیں اور غلامی کو فطریسمجھ لیں تو غلاموں کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا بے فائدہ اور فطرت کے خلاف ہوگا۔ یہ تھی وہ تاریخ جو منٹسکیو نے روح القوانین میں غلامی کی بحث میں تحریر کی ہے۔

غلامی کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اسلام کے آئین میں غلامی فطری نہیں ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے، ارسطو کی منطق کے خلاف، انسان کو آزاد پیدا کیا گیا ہے:

قال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بالعبودیۃ۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : سارے انسانو کو آزاد پیدا کیا گیا ہے مگر یہ کہ کوئی شخص اپنے خلاف غلامی کا اقرار کرے(یا ایسا کام کرے جس سے غلامی کے اسباب فراہم ہوجائیں )

دوسرے بیان میں فرماتے ہیں :

لا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسروں کے غلام نہ بنو جب کہ خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔

یہ تھے انسان کے آزاد ہونے کے سلسلہ میں آپ کے دو اقوال انسان ماں کے شکم سے آزاد پیدا ہوتا ہے غلام بنتا ہے تو خارجی عوامل کی بنا پر بنتا ہے اور اس کی غلامی وقتی ہوتی ہے نہ کہ دائمی،ماضی میں غلاموں پر کیا گزری ہے؟

تاریخ روم کے مولف البرمالہ غلاموں کے بارے میں رومیوں کے عقیدے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :

قانون کی نظر میں غلام ؛ انسان یا آدمی نہیں ہے بلکہ غلام کی حیثیت ایک بے جان چیز یا اس اوزار کی سی ہے جو بات کرسکتا ہے بنابرایں وہ کوئی حق نہیں رکھتا ہے۔

منٹسکیو لکھتا ہے : افلاطون کے قانون میں یہ لکھا تھا کہ غلام اپنا دفاع نہیں کرسکتا چنانچہ جب اس پر حملہ ہوتا تھا تو اس سے اس کے فطری دفاع کے حق کوبھی سلب کرلیا جاتا تھا اور اسے شہری حق بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ عدالت میں حاضر ہوکر شکایت نہیں کرسکتا تھا۔ اسپارٹ میں غلام عدالت میں جا کر اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی شکایت نہیں کرسکتے تھے اسپارٹ کے غلام اتنے مظلوم تھے کہ وہکسی ایک آدمی کے غلام نہیں بلکہ پورے معاشرہ کے غلام سمجھے جاتے تھے۔

پستی کی انتہا:

روم کے شرفاء کی یہ بھی ایک تفریح ہوتی تھی کہ وہ غلاموں اور بھوکے درندوں کو ایک میدان میں چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی دندہ کسی غریب و بے چارہ غلام کو دبوچ لیتا تھا اور وہ فریاد کرتا اور چلاتاتھا تو روم کے مالدار خوشی سے اچھل پڑتے تھے۔

اسی طرح ان شریف و نجیب لوگوں کی ایک تفریح یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ غلامو ں کی دو جماعتوں میں برہنہ شمشیر کے ساتھ جنگ کراتے تھے تاکہ وہ ایک دوسرے کو زخمی کرکے لہو لہان کردیں اور ظالم مالدار کہ جن کو شفاء کہا جاتا تھا اس سنسنی خیز منظر کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور اگر غلام اس کام کو انجام دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے تو ان کو وہ سپاہی ٹکڑے ٹکڑے کردیتے تھے جو ان کو گھیرے رہتے تھے۔

روم کے شرفاء کی دوسری تفریح یہ تھی کہ وہ غلاموں کو بھڑ، کے چھتے یا بچھوؤں کے جھرمٹ میں ہاتھ ڈالنے پر مجبور کرتے تھے تاکہ ان کے آقا ان کے چہوں کے تشنجات کو دیکھ کر مسرو ہوں اور ہنسیں۔

غلام حیوانات کی مانند سخت و مشکل کام کرتے تھے،جیسے خندقوں اور راستوں کو صاف کرنا کانٹوں کو تراشنا باغات میں پھاؤڑا چلانا، چراگاہوں سے نقصان دہ گھاس کو اکھاڑنا،گیہوں کو کوٹنا اور بیت الخلاء کو صاف کرنا وغیرہ اگر کوئی غلام ایسا کام کرنے سے انکار کرتا تھا تو اسے سخت سزا بھگتنا پڑتی تھی، کوڑے اور لاٹھیا کھاتا تھا، قید کردیا جاتا تھا، اونٹ اور گھوڑے کی مانند چکی میں جوت دیا جاتا تھا، کان کنی میں لگا دیا جاتا تھا، تاریک تہ خانوں میں بند کردیا جاتا تھا یہاں تک عید کے روز چوپایوں کو کام سے چھٹی مل جاتی تھی لیکن غلاموں کو چھٹی نہیں ملتی تھی۔

اسلام میں غلاموں کی تدریجی آزادی

یہ بات تاریخ کے مسلمات میں سے ہے کہ اسلام نے غلام سازی سے جنگ کیاور غلاموں کو تدریجی طور پر آزاد کیا ہے اگر یہسوال کیا جائے کہ اسلام نے غلاموں کو تدریجی طور پر کیوں آزاد کیا ہے یکبارگی کیوں نہیں آزاد کیا؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے:

۱۔ جس زمانہ میں اسلام آیا تھا اس زمانہ میں عرب کے تاریک ماحول میں غلامی معاشرہ کے اقتصادی ارکان میں شمار ہوتی تھی اور بہت سے لوگوں کی تجات اور زندگی غلاموں کی خرید وفروخت ہی سے چلتی تھی لہٰذا رسول اسلام یکبارگی اس رسم کو بند نہیں کرسکتے کیونکہ اقتصادی نظم ونسق بگڑ جاتا، اس کے علاوہ جن لوگوں نے اپنی ساری ثروت کے غلام خرید رکھے تھے وہ اس رسم کو بند کرنے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ کچھ تن پرور اور بیکار لوگ اس کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے تھے اسلام نے پہلے تو لوگوں کے سامنے کام کرنے کے ثواب اور بیکاری و تن پروری کی مذمت کی وضاحت کی اور کام کو اپنی عبادت کا جز قرار دیا اور کام کے نتیجہ کو کام کرنے والے ہی کا حق قرار دیا کہ جس سے بیکار لوگ بھی رفتہ رفتہ کام کرنے لگے اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ دوسروں کے خون پسینہ کی کمائی کو تاراج نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ اگر اسلام غلاموں کو یکبارگی آزاد کردیتا تو ممکن تھا وہ اپنے اس عقیدہ سے متاثر ہو کر جو کہ ان کے اندر پیدا ہوگیا تھا خونی انقلاب برپا کردیتے جس سے امن عالم کو خطرہ لاحق ہوجاتا تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں : منٹسکیو، یکبارگی غلاموں کو آزاد کرنے کے مفاسد و خرابیوں کے بارے میں لکھتا ہے :

ایک قانون بنا کر بے شمار غلاموں کو آزاد کرنا بہتر نہیں ہ یکیونکہ اس سے معاشرہ کا نظم ونسق درہم و برہم ہوجائے گا وہ کہتا ہے: مثلا ’’ ولسینی‘‘ میں جب خلام آزاد ہوئے اور انھیں الیکشن و انتخابات و ووٹ دینے کا حق مل گیا اور انھوں نے اکثریت حاصل کرلی تو آزاد شدہ غلاموں نے ایک قانون بنایا کہ آزاد لوگوں میں سے جو بھی شادی کرے گا اس کی دلہن پہلی رات میں کسی غلام کے پاس رہے گی دوسری رات میں اصلی شوہر کے سپرد کی جائے گی۔

تیسری دلیل کے طور پر اس بات کو پیش کیا جاسکتا ہے جو ’’ گوسٹالوبون ‘‘ نے لکھی ہے وہ یہ ہے: چونکہ غلاموں نے ایک زمانہ تک غلامی کی زندگی بسر کی ہے اس لئے وہ طفیلی زندگی گزارنے کے سبب نا تجربہ کار او ر بے استعداد رہ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام سارے غلاموں کو یک بارگی آزاد کر دیتا تو وہ کافی تجربہ نہ رکھنے کے سبب مستقل طور پر زندگی نہیں گزار سکتے تھے اور وہ امریکہ کے غلاموں کی مانند آزاد ہونے کے بعد مذکورہ لت کے تحت نابود ہوجاتے۔

مذکورہ علل کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے یک بارگی غلاموں کو آزاد نہیں کیا بلکہ تدریجی طور پ ان کی آزادی کے اسباب فراہم کئے اب دیکھا جائے کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کی رہائی کے لئے کون سے راستے اختیار کئے ہیں پہلے ہم اس راستہ کو بیان کرتے ہیں جس کو اسلام نے قانونی حیثیت دی ہے اور اسلام کی فقہ میں بیان ہوا ہے پھر اخلاقی طریقوں کو بیان کریں گے۔

فقہی نقطۂ نظر سے غلاموں کی آزادی کے طریقے

۱۔مکاتبہ: ایک معاہدہ ہے جو غلام و مولا کے درمیان ہوتا ہے اور اس میں یہ طے پاتا ہے کہ غلام کچھ پیسہ ادا کرے گا تو آزاد ہوجائے گا اور اگروہ طے شدہ پیسہ دینے سے عاجز ہوگا تو حاکم شرع بیت المال (سرکاری خزانہ) سے پیسہ دے کر اسے آزاد کرائے گا۔

۲۔ تدبیر: یعنی مولا یہ کہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا غلام آزاد ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص اپنے باپ، ماں، دادا، دادی، بیٹے، پوتے، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی کا آقا و مال ہوجائے تو وہ فورا آزاد ہوجاتے ہیں۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کے بعضحصہ کو آزاد کرے تو وہ پوا غلام آزاد ہوجائے گا۔

۵۔ اگرکنیز کے شکم سے اس کا بچہ پیدا ہوگا تو وہ آزاد ہوجائے گی۔

۶۔ اگ وئی غلام بلاد کفر میں اپنے مولا و آقا سے پہلے مسلمان ہوجائے تو وہ آزاد ہے۔

۷۔ اگر مولا اپنے علام کا کان یا ناک یا کوئی دوسرا عضو کاٹے تو اس سے غلام آزاد ہوجائے گا۔

۸۔اگر کوئی غلام اندھا مجذوم مبروص، لنگڑا اور اپاہج ہوجائے تو وہ آزاد ہوجائے گا اور اس کے اخراجات بیت المال سے پورے ہونگے۔

۹۔ اگر ایسا مالدار مرجائے کہ جس کے وارث نہ ہوں تو اس کے غلام کو اس کے پیسہ سے خرید کر آزاد کیا جائے گا اور اس ا مال اس آزاد شدہ غلام کو ملے گا۔

۱۰۔وسائل الشیعہ میں ایک باب قائم کیا ہے کہ جس کی حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مومن غلام سات سال خدمت کرنے کے بعد آزاد ہوجاتا ہے۔

۱۱۔ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے ایک، غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا ہے۔

۱۲۔ اگر کوئی شخص اپنی نذر و عہد کو پورا نہ کرے یا قسم توڑ دے یاعمدا اپنا وزہ کو توڑ دے یا غلطی سے کسی کوقتل کردے یا ظہار کرے تو اسے کفارہ دینا چاہیے اور کفارات میں سے غلام آزاد کرنا بھی ہے۔

عملی اور اخلاقی طریقے

دین اسلام نے عملی اور اخلاقی لحاظ سے غلاموں کو آزاد کرنے کا وسیلہ فراہم کیاہے۔ مثلاً ہم رسول ؐ اور ائمہ معصومین ؑ کی عملی زندگی کو دیکھتے ہیں :

مورخین لکھتے ہیں :رسولؐ نے متعدد غلاموں کو آزاد کیا ہے جیسے ’’ زید بن حارثہ‘‘پھر یکے بعد دیگر، مسلمانوں نے رسول ؐ کی تاسی کی اور غلاموں کو آزاد کیا۔ رسول ؐ نے زید بن حارثہ کو آزاد کرنے کے علاوہ زینب بنت حجش کے ساتھ ان کی شادی بھی کردی کچھ مدت تک انھیں اپنے ساتھ رکھا پھر ان کے بیٹے، اسامہ بن زید کو لشکر اسلام کا سپہ سالار مقرر کیا اور بڑیبڑے مہاجرین و انصار کوان کے لشکر میں شریک ہونے کا حکم دیا۔

حضرت علی ؑ نے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے ہزار غلام آزاد کئے۔

جرجی زیدان لکھتے ہیں : عبداللہ بن عمر نے ہزار غلام اور محمدبن سلیمان نے ستر ہزار کنیزیں اور غلام آزاد کئے ہیں۔

اخلاقی دستورات:

جولوگ اپنے غلاموں کو آزاد کرتے ہیں اسلام ان کے لئے اتنی اخروی جزا قرار دیتا ہے جس سے دوسرے مسلمانوں کو اپنے غلاموں کو آزاد کرنے کی تشویق ہوتی ہے۔ سورۂ بلد میں ارشاد ہے:

الم نجعل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ذامتربۃ۔

کیا ہم نے اس کے لئے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو لب نہیں قرار دیئے اور اسے دوراہوں کی ہدایت نہیں کی ؟ پھر اس نے مشکل کام کے لئے کیوں قدم نہیں اٹھایا؟ کیا تم جانتے ہو کہ مشکل کام کیا ہے؟ کسی غلام کو آزاد کرنا یا بھوک کے دن میں قریبی یتیم یا خاکسار مسکین کو کھانا کھلائیں۔

رسول ؐ فرماتے ہیں :جو شخص مسلمان غلام کوآزاد کرے گا خداوند عالم اس کے ہر عضو کے عوض آزاد کرنے والے کے اعضاء کو جہنم کی آگ سے آزاد کرے گا۔

امام رضا ؑ نے اس شخص کے بارے میں فرمایاجس نے اپنا غلام آزاد کیا تھا : خداوند عالم اس کے ہر عضو کے عوض آزاد کرنے والے کے عضو کو آزاد کرے گا۔

آخر میں ہم امام زین العابدین ؑ کے اس قول کو نقل کرتے ہیں جو اس زمانہ سے مربوط ہے کہ جس میں غلام ابھی آزاد نہ ہوا ہو اور اس پر اس کے مولا کا ایسا حق ہو جیسا کہ بیان ہوا ہے۔ یہ بحث وسیع ہے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ماتحتوں کے حق

لوگوں کے حقوق:

لیکن جب رعیت پر تمہاری حکومت ہو تو اس وقت تمہارے اوپر اس کے یہ حقوق ہیں، تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے اپنی زیادہ طاقت سے انھیں اپنی رعیت بنا لیا ہے تو یہ ان کی کمزوری و عاجزی تھی جس نے انھیں رعیت کی جگہ پہنچا دیا تو اس کا کیا حق ہے کہ جس کے ضعف و ذلت نے تمہیں اتنا بے نیاز کر دیا کہ اسے تمہاری رعیت بنا دیا اور اس پر تمہارے حکم کو نافذ کردیا، اب وہ اپنی طاقت و عزت کے ساتھ تمہارے سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا، اسے تمہارے ترحم و حمایت اور صبر وتسلی کے علاوہ تمہاری جوبات ناگوار گزرتی ہے تو اس میں وہ خدا ہی سے مدد چاہتا ہے اور جب تمہیں یہ معلوم ہو کہ خدا نے تمہیں کتنی عزت و قوت عطا کی ہے کہ جس کے ذریعہ تم دوسروں پر غالب آگئے تو اس وقت تمہارا کیا فریضہ ہے؟ سوائے اس کے کہ تم خدا کے شکر گزار ہوجاؤ اور جو خدا کا شکر ادا کرتا ہے خدا اس کو زیادہ نمت عطا کرتا ہے اور خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مکارم الاخلاق میں اس طرح تحریر ہے:

لیکن جو لوگ تمہارے زیر تسلط ہیں ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنی کمزوری اور تمہاری طاقت کی وجہ سے تمہایر رعیت بن گئے ہیں ؛ پس تمہارے اوپر واجب ہے کہ ان کے درمیان عدل کرو اور ان کے لئے مہربان باپ جیسے بن جاؤ اور ان سے بھولے سے جو غلطی ہوجائے تو اسے ماف کردو اور ان کے کسی غلط کام کی سزا دینے میں جلدی نہ کرو اور خدا نے ان پر جو قوت تمہیں دی ہے اس کا شکر ادا کرو۔

امام زین العابدین ؑ بادشاہ کے حق کے سلسلہ میں فرماتے ہیں : رعیت و اس کا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہیے اس سے دشمنی نہیں کرنا چاہیے اور اس کے حق کے مقابلہ میں فرماتے ہیں اور بادشاہ کو جو قوت و غلبہ حاصل ہے اس کے سبب اسے عدل سے کام لینا چاہیے اور رعیت کا پورا خیال رکھنا چاہیے : اس حق میں امام زین العابدین ؑ نے چند اہم موضوع بیان فرمائے ہیں۔ اول: بادشاہ کا عادل ہونا۔دوسرے :بادشاہ کا مہربان باپ کی مانند ہونا، تیسرے : رعیت سے لغزش اور خطا ہوتی ہے اسے معاف کرنا۔ چوتھے: خدا نے جو تمہیں طاقت و غلبہ عطا کیا ہے اس کا شکر ادا کرنا۔

قائد کو عادل ہونا چاہیے

لوگ اس شخص کو عادل کہتے ہیں جو اپنی حکومت کے زمانہ میں کسی کے لئے برا ارادہ نہیں کرتا، دوسروں کے حقوق کو غصب نہیں کرتا اور ان کے درمیاں طبقاتیت کا قائل نہیں ہوتا اور اپنی حکومت کے زمانہ سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو شخص دوسروں کے حقوق کو غصب کرتا ہے او جہاں تک اس کی حکومت ہے وہاں تک وہ لوگوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتا : ظالموں کا ساتھ دیتا ہے اور کمزور مظلوم کو کچلتا ہے تو اسے ظالم کہتے ہیں :

بنابرایں یہ کہا جاسکتا ہے : ہر صاحب حق کو اس کا حق دینے کو بشری ماشہ کی اجتماعی عدالت کہا جاتا ہے ہ جس کی بشری قانون میں رعایت ہونا چاہیے۔ مولوی اپنے مشہور اشعار میں کہتے ہیں :

عدل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خاردا

خواجہ نصیر الدین نے ایک رباعی میں، کہ جس کو ریاض العارفین میں نقل کیا ہے، کہا ہے:

جزحکم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بایدنیست

خدا نے سارے انسانوں کو عدل کرنے کی دعوت دی ہے ؛ ان اللہ۔۔۔۔۔۔ بے شک خدا عادل و احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

رسول ؐ نے فرمایا: الملک۔۔۔۔۔۔۔

بادشاہت کفر کے ساتھ باقی رہتی ہے لیکن ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔

رسول ؐ نے فرمایا: عدل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

جود اورعدل کا فرق

جود و عدل کے فرق کے سلسلہ میں حضرت علی ؑ کا بہترین قول ہے، جب آپ سے سوال کیا گیا: عدل بہتر ہے یا سخاوت و بخشش؟ تو آپ نے فرمایا:

عدل چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھتا ہے اور بخششیں انھیں ان کی جگہ سے باہر نکالتی ہے(سخی استحقاق سے زیادہ دیتا ہے) عدل سب کا خیال رکھتا ہے جب کہ جود کسی خاص فرد سے متعلق ہوتا ہے پس عدل زیادہ افضل و برتر ہے۔

انبیاء اور دعوت عدل

معاشرۂ انسانی کے لئے مبعوث ہونے والے انبیاء نے آدمی کے کمال و سعادت کو اخلاق و عدل کے تکامل کے سایہ میں جانا ہے ہم یہاں دل کے بارے میں نازل ہونے والی آیتوں میں سے بعض آیتیں نقل کرتے ہیں :

۱۔ یا ایھا الذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تعملون۔

اے ایمان والو! خدا کے لئے قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو خبر دار کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو عدل و انصاف کرو کہ یہ تقوے سے زیادہ قریب ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو بیشک خدا تمہارے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے۔

اسلام میں جتنی اہمیت عدل کو دی گئی ہے اتنی اہمیت شاید ہی کسی مسئلہ کو دی گئی ہو کیونکہ عدل بھی توحید کی مانند اسلام کے تمام اصول و فروع میں پھیلا ہوا ہے۔ جس طح عقیدتی و عملی، فردی و اجتماعی اور اخلاقی و حقوقی مسائل خدا کی توحید و وحدانیت سے جدا نہیں ہیں اسی طرح ان میں سے کوئی بھی عدل سے الگ نہیں ہے لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ عدل کو اصول مذہب اور مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ قرار دیا گیاہے۔

اس آیت میں جس موضوع کو اہمیت دی گئی ہے وہ دل و انصاف سے انحراف ہے۔ مسلمانوں کو خبر دار کیا جارہا ہے کہ کینہ توزی، قومی تعصب اور نجی حساب کی بے باقی ایسی چیز ہے جو عدل نہیں کرنے دیتی اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے کا سبب ہوتی ہے اور دالت ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔

قول میں عدل:

۲۔ولا تقربوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تذکرون۔

اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر بہتر طریقہ سے یہاں تک کہ وہ ر شید و توانا ہوجائے اور ناپ تول میں پورا پورا دو اور ہم کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے ہیں اور جب تم کوئی بات کہو تو انصاف کو ملحوظ رکھو خواہ اپنے زیز کے خلاف ہی ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو اسی کی تم کو وصیت کی ہے کہ شاید تم عبرت حاصل کرسکو۔

اس آیت میں خداوند عالم یتیم کے مال کے سرپرستوں، فروخت کرنے والوں اور تولنے والوں کو عدل کی دعوت دیتا ہے بلکہ بات کہنے میں دل کا خیال رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ بنابرایں آیت میں، قول میں عدل، معاملہ میں عدل اور معاشرہ کے بے سرپرست لوگوں ے ساتھ عدل کرنے پر زور دیا ہے۔

یتیم کے مال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے قریب نہ جاؤ ایسے ہی قرآن میں بعض گناہوں ے بارے میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ان گناہوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے جو وسوسہ انگیز ہیں جیسے زنا، بدکاری اور یتیموں کا مال، ان کے بارے میں لوگوں کو خبر دار کیا جارہاہے کہ ان کے قریب نہ جاؤ تاکہ وسوسوں کی زد میں نہ آؤ۔

حکومت میں عدل:

۳۔ ان اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بصیرا۔

بیشک خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں تک پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ و حکم کرو تو دل کے ساتھ کرو بیشک خدا تمہیں بہترین چیز کی نصیحت و وعظ کرتا ہے۔ یقینا خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں امانت کو اس کے اہل کے سپرد کرنے کے بعد حکومت میں عدل کا مسئلہ بیان ہوا ہے اور حکومت میں عدل کے مسئلہ کو امر کے پہلو کے علاوہ اسے بہترین و عظ و نصیحت قرار دیا گیا ہے یہ بیان ہوا ہے کہ خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاکم کو یہ جان لینا چاہیے کہ خدا اس کے ہر قول و فعل کو دیکھ رہا ہے۔

دوسری آیت میں عدل و احسان کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے:

۴۔ ان اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تذکرون۔

بیشک خداوند عالم عدل و احسان کا حکم دیتا ہے اور قرابت داروں کو ان کا حق دینے کا حکم دیاتا ہے بدکاری اور برائی اور تجاوز و سرکشی سے روکتا ہے ان چیزوں کے بارے میں خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

۵۔ یاداؤد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یوم الحساب۔

اے داؤد ہم نے تمہیں روئے زمین پر خلیفہ بنایا ہے پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں راہ خدا سے ہٹا دے گی بیشک جو لوگ راہ خدا سے بھٹک جاتے ہیں وہ روز حساب کو بھول جاتے ہیں اس لئے ان کے لئے شدید عذاب ہے۔

اس آیت میں پہلے تو یہ بیان ہوا ہے کہ داؤد کو خدا نے خلیفہ بنایا ہے دوسرے عدل سے منحرف ہونا تیسرے یہ کہ عدل کی ایک آفت خواہش نفس کی پیروی ہے اور گمراہیاں روز حساب کو فراموش کرنے کا نتیجہ ہیں۔

ان پانچ آیتوں کو ہم نے نمونہ کے طور پر نقل کیا ہے کہ عدل کتنا اہم موضوع ہے اور اسلامی حاکم کو معاشرہ کے تمام افراد کے ساتھ عدل کرنا چاہیے اب ہم احادیث کی روشنی میں عدل کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں نمونے کے طور پر درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

ابو علی اشعری نے حسن بن علی کوفی سے انھوں نے عبیس بن ہشام سے انھوں نے عبدالکریم سے انھوں نے حلبی سے انھوں نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: عدل اس پانی سے بھی زیادہ خوشگوار ہے جو پیاسے کو ملتا ہے اگر عدل سے کام لیا جائے تو اس کا دامن بہت وسیع ہے اگرچہ اس کے موارد کم ہیں۔

حسن بن علی نے ابن محبوب سے انھوں نے معاویہ بن وہب سے انھوں نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: عدل شہد سے زیادہ شیریں ہے اور مکھن سے زیادہ نرم ہے اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔

من لا یحضرہ الفقیہ میں اپنی اسنا د سے ابن ابی یعفور سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے ابن ابی یعفور سے عرض کی : مرد کی عدالت مسلمانوں کے درمیان کس چیز کے ذریعہ پہچانی جاتی ہے تاکہ ان کے حق میں یا ان کے خلاف اس کی گواہی قبول کی جاسکے؟ آپ نے فرمایا: وہ شرم گاہ کو چھپانے، پاک دامنی اختیار کرنے اور شکم و شرم گاہ کو حرام سے بچانے، زبان و ہاتھ پر قابو رکھنے او رشراب خوری، زناراری، سود خوری، والدین کی نافرمانی اور محاذجنگ سے بھاگنے کے گناہوں سے پرہیز کرنے سے پہچانی جاتی ہے کہ جن پر خدا نے عذاب دینے کا وعدہ کیا ہے، ان تین حدیثوں میں عدل کی اہمیت بیان ہوئی ہے۔

حاکم اور لوگوں کے ایک دوسرے پر حقوق

اس سلسلہ میں نہج البلاغہ میں حضرت علی ؑ کا ارشاد ہے:

اے لوگو! تم پر میرا ایک حق ہے اور تمہارا بھی مجھ پر ایک حق ہے میرے اوپرتمہارا یہ حق ہے کہ میں تمہیں نصیحت کروں او رتمہاری غنیمت و فئی کو مساوی طور پر تمہارے دمیان تقسیم کروں اور تمہیں تعلیم دوں تاکہ تم نادان نہ ہو اور تمہاری تربیت کرنا ہے تاکہ تم سیکھ لو اور تمہارے اوپر میرا حق یہ ہے کہ تم بیعت پر باقی و ثابت رہو اور پوشیدہ و آشکارا طور پر خیر خواہ رہو اور جب میں تمہیں پکاروں تو لبیک کہو اور جب تمہیں حکم دوں تو اطاعت کرو۔

حاکم و محکوم کے اس حق میں آپ نے معاشرہ میں نصیحت و موعظت اور اس کے مالی واقتصادی مسائل، تعلیم و تربیت اور انسانوں کی پرورش کی طرف اشارہ کیا ہے : حاکم پر واجب ہے کہ وہ معاشرہ کی مالی حالت اور لوگوں کی تعلیم کا ہر لحاظ سے بندوبست کرے لیکن معاشرے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ حاکم کی بیعت پر باقی رہیں اور ظاہر و باطن میں اس کے خیر خواہ رہیں اس کی آواز پر لبیک کہیں اور اس کے حکم کے تابع رہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں :

خداوند عالم نے ان حقوق میں سے جو سب سے بڑا حق واجب کیا ہے وہ حاکم کا حق ہے جو رعیت پر اور رعیت کا حاکم پر حق ہے یہ ایک واجب عمل ہے جو خدا نے ہر ایک کے لئے دوسروں پر واجب کیا ہے اوران حقوق کی رعایت کو ان کی الفت و محبت اور ان کے دین کی زت قرا دیا ہے اور رعیت کے امور کی اصلاح نہیں ہوسکتیمگر ان کے ولی و حاکم کے صالح ہونے سے اور حاکم کی اصلاح نہیں ہوسکتی مگر رعیت کی ثابت قدمی سے اگر یہ دونوں ایک دوسرے کا حق ادا کریں تو ان کے درمیان حق عزیز ہوجائے اور دین کے طریقے قائم ہوجائیں اور عدل کے نشان استوار ہوجائیں اور سنت الٰہی اپنی ڈگر پر جاری ہوجائے ان حقوق و اصول کی رعایت سے زمانہ کی اصلاح ہوجائے اور حکومت زیادہ باقی رہے اور دشمنوں کی امیدیں یاس میں بدل جائیں۔

آگے چل کر فرماتے ہیں،

لیکن اگر رعیت حاکم کے حکم کی اعتنا نہ کرے یا حاکم رعیت پر ظلم کرے تو اس وقت اختلاف ہو جائے گا اور ظلم و ستم کی نشانیاں ظاہر ہوجائیں گی اور دین میں ایسی چیزیں داخل ہوجائیں گی جو دین کی تباہی کا سبب ہوتی ہیں او رسنت الٰہی اپنی ڈگر سے ہٹ جائیں گی اور ہوا و ہوس پر عمل ہوگا اور احکام کو چھوڑ دیا جائے گا۔ فردی و اجتماعی امراض پھیل جائیں گے پھر چھوڑے گئے حقوق کی عظمت کا کوئی خوف نہیں رہے گا اور بڑے گناہوں کی برائی ختم ہوجائے گی نتیجہ میں نیک لوگ ذلیل اور شر پسند لوگ معزز ہونگے اور بندوں کے مشکلات خدا کے نزدیک عظیم ہونگے۔

اس خطبہ میں حضرت علی ؑ حکومت کی بقا و دوام اور حاکم و رعیت کی صلح و صفائی اور اس کے نتیجہ میں معاشرہ کی کامیابی و سعادت کو بیان فرماتے ہیں اور اس خطبہ کے دوسے جز میں، حکومت کے سقوط و نابودی اور معاشرہ میں اکرام و امن کا فقدان معاشہ سے شریف و نیک لوگوں کے نکلنے اور معاشہ پر شر پسند لوگوں کے مسلط ہونے اور نتیجہ میں دین کی نشانیوں کے مٹنے اور ضلالت و گمراہی کے پرچم کے بلند ہونے اور معاشرہ کی تباہی کو بیان کرتے ہیں۔

حضرت علی ؑ سرحد کی حفاظت کرنے والوں کو ایک خط میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں :

امابعد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اخوانہ۔

اما بعد والی وحاکم کا ہر ایک کی گردن پر جو حق ہے وہ یہ ہے کہ اسے رعیت پر جو فضیلت حاصل ہے اس سے رعیت کو محروم نہ کرے اسے نہ بدلے اور اسے جو مخصوص نعمت ملتی ہے اس سے رعیت کو بھی نوازے اور جو نعمت خدا نے اس کے نصیب میں لکھی ہے اس میں سے اس کے بندوں کو بھی دے اور اپنے بھائیوں پر لطف و کرم کرے۔

حضرت علی ؑ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے آپ خود بھی اس پر عمل فرماتے تھے حقیقت یہ ہے آپ کی حکومت، عدل کی حکومت تھی آپ ماشہ کے لئے مہربان باپ تھے فرماتے تھے: اقنع نفسی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الدھر۔ یا میں اسی پر قناعت کرلوں کہ مجھے امیر المومنین کہا جائے اور میں ان پرپڑنے والی زمانہ کی سختیوں میں ان کا شریک نہ بنوں ؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

حضرت امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : حاکم کو معاشرہ کے لئے مہربان باپ کی مانند ہونا چاہیے تاکہ وہ ان کو اپنی اولاد سمجھے اور ان کے درمیان مساوات قائم کرے ایسا حضرت علی ؑ کی حکومت کے دوران ہوا ہے جیسا کہ آپ نے مالک اشتر کے نام اپنے مشہور خط میں تحریر کیا ہے:

اور رعیت کے لئے اپنے دل کو نرم و مہربان بناؤ ان کے لئے درندہ نہ بنو کہ جو ان کو چٹ کرجانے کو غنیمت سمجھتا ہے کیونکہ لوگوں کی قسمیں ہیں یا تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں یا وہ خلقت و پیدائش کے لحاظ سے تمہیں جیسے انسان ہیں۔

حضرت امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : رعیت اور عوام دونوں سے لغزش ہوتی ہے حاکم کو اس سے چشم پوشی کرنا چاہیے او ر انھیں معاف کردینا چاہیے حضرت علی ؑ مالک اشتر کو لکھتے ہیں :

فان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔لک۔

بیشک لوگوں میں عیب ہوتے ہیں اور حاکم ان کو چھپانے کا زیادہ حقدار و سزاوار ہے اور ان کے ان عیوب کی ٹوہ میں نہ لگو جو تم پر پوشیدہ ہیں تمہارا کام تو بس اس چیز پر پردہ ڈالنا ہے جو تم پر آشکار ہوگئی ہے۔

ان جملوں میں جان بوجھ کر غافل بننے اور لوگوں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرنے کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور یہان صفات میں سے جن سے حاکم اور معاشہ کے سربراہ کو متصف ہونا چاہیے۔

رعیت کے حق کے آخر میں امام زین العابدین ؑ ایک اور موضوع کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور وہ ہے کہ حاکم کو اس کا نعمت کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اسے لوگوں پر حکومت حاصل ہے اور اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا کچھ نہیں ہے یہ اقتدار اسے خدا نے عطا کیا ہے وہ تو ایک حقیر وکمزور بندہ ہے۔ حضرت علی ؑ مالک اشتر کو حکم دیتے ہیں، اگر تم اپنی حکومت کے عہد میں اپنے اندر غرور وتکبر کا احساس کرو تو خدا کی عظمت و بزرگی کا خیال کرو کہ سب کچھ اسی کا ہے یہ حکومت تمہیں اس لئے دی ہے تاکہ تمہیں آزمایا جائے بہتر ہے کہ حاکم خدا کی اس نعمت کا شکریہ ادا کرتا رہے۔

شاگردکا حق

لیکن تمہاری علمی رعیت، شاگردوں کاحق یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خدا نے تمہیں جو علم عطا کیا ہے اور حکمت کا جو خزانہ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں شاگردوں کا سرپرست بنایا ہے پھر اگر تم نے اس سرپرستی کے حق کو اچھی طرح ادا کردیا اور ان کے لئے مہربان خزانچی اور خیر خواہ مولا قرار پائے جو کہ صابر خدا خواہ ہے جب وہ کسی ضرورت مند کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے پاس موجود اموال میں سے اسے دیتا ہے تم رشد یافتہ اور باایمان خادم ہو ورنہ خدا کے خیانت کار اور اس کی مخلوق کے لئے ظالم اور عزت و نعمت کے سلب ہونے کا سبب ہو۔

اورمکارم الاخلاق میں کچھ اس طرح تحریر ہے:

پھر اگر تم لوگوں کو تعلیم دینے میں نیکی کروگے اور ان کے ساتھ سختی و بد خلقی سے پیش نہیں آؤ گے تو خدا اپنے لطف وکرم سے تمہاے علم میں اضافہ کرے گا اور اگر تم لوگوں کو اپنے علم سے محروم کرو گے اور سبق لیتے وقت ان کے ساتھ سختی وبد خلقی سے پیش آؤ گے تو خدا کو یہ حق ہے کہ وہ تم سے علم چھین لے او لوگوں کے دلوں سے تمہاری عظمت و منزلت کو ختم کردے۔

اس عبارت میں امام زین العابدین ؑ نے درج ذیل حقوق کی طرف اشارہ فرمایا:

۱۔ جو علم و حکمت استاد نے حاصل کیا ہے وہ خدا کے لطف و عنایات سے حاصل کیا ہے۔ ذاتی طور پر اس کا کچھ نہیں بھی ہے، یہ چیز استاد کے علمی غرور کو برطرف کرتی ہے۔

۲۔ اس علم و حکمت میں استاد دوسروں کا خزانچی ہے اور اس علم و حکمت کو تقسیم کرتے وقت اسے مہربانی و خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیے۔

۳۔امام زین العابدین ؑ استاد کو علم و حکمت کا خزانہ دار سمجھتے ہیں اور علم کے خزانے کو خرچ کرنے کو مال خرچ کرنے کے برابر سمجھتے ہیں کہ اس میں کنجوسی نہیں کرنا چاہیے۔

۴۔ اگراستاد اپنے فریضہ کو اداکرتا ہے تو اس کی مثال اس امانت دار کی سی ہے جو امانت کو بچانے اور اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے ور اگر اپنے فریضہ پر عمل نہیں کرتا ہے تواس کی مثال خیانت کار لوگوں کی سی ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور انھیں ان کی عزت وحقوق سے محروم رکھتے ہیں۔

استاد کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو شائستہ اوربہترین طریقہ سے تعلیم دے تاکہ ان کے دل میں لم کا شوق پیدا ہو۔استاد کی سختی و بدخلقی اور غصہ سے طلبہ کی امنگ پر اوس پڑ جاتی ہے کبھی تو وہ انھیں باتوں کی وجہ سے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ استاد اپنے اس عمل کے ذریعہ اپنے علم و حکمت کا ذخیرہ اندوز بن جاتا ہے اور شاگردوں کو علم سکھانے میں بخل کرتا ہے۔

استاد کے خصوصیات

ایک بہترین استاد اور اچھا معلم وہی ہے کہ جس میں استادی، تدریسی اور شاگرد سے اچھی طرح پیش آنے کے خصوصیات ہوں شائستہ استاد اور لائق استاد وہ ہے جو درج ذیل خصوصیات کا حامل ہے:

۱۔ بہترین استاد وہ ہے کہ جو اہلیت و قابلیت پیدا کرنے سے پہلے مسند درس پر نہ بیٹھے اس سلسلہ میں اس منزل پر پہنچ جائے کہ نیک و شریف لوگ اس کے استاد ہونے کی تصدیق کریں۔

۲۔ ذلت و حقارت کا باعث نہ ہو یعنی نا اہل لوگوں کو علم نہ دیں۔

۳۔ استاد اپنے علم پر بھرپور طریقہ سے عمل کرے اور اس کے وجود سے علم کی روشنی حاصل کی جاتی ہو اگر اس کے اندر یہ خصوصیات نہ ہوں تو وہ اس آیت کا مصداق ہوگا:اتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو۔

انما یخشی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کے بارے میں امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

من صدق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عالم وہ ہے جس کا فعل اس کے قول کے مطابق ہو اور جس کا قول اس کے فل کی تصدیق نہ کرے وہ عالم نہیں ہے۔

۴۔ استاد کا حسن خلق سے پیش آنا اور نرمی و محبت کے ساتھ تعلیم دینا۔ علماء کے بارے میں رسول ؐ فرماتے ہیں : علماء۔۔۔۔۔میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء جیسے ہیں جس طرح وہ درجہ نبوت پر فائز ہوتے ہوئے حسن خلق سے پیش آتے تھے، تبلیغ میں حسن خلق کا مظاہرہ کرنا لازمی ہے اساتذہ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔

۵۔ کسی کو تعلیم نہ دینے کا یہبہانہ نہ بنائے کہ وہ خلوص نیت کا حامل نہیں ہے بلکہ اسے برداشت کرے اور تعلیم کے دوران آہستہ آہستہ اس کے اندر خلوص پیدا کرے کیونکہ اگر علم کے ساتھ خلوص نہ ہوگا تو حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : ہیرے جواہرات کا گلو بندہے جو سور کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے۔

۶۔ جب دل تیار ہو ں اور قابلیت پائی جاتی ہو تو علم دینے سے دریے نہ کرے کہ جابر جعفی نے امام محمد باقر ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

زکوٰۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔علم کی زکوٰۃ یہ ہے کہ تم خدا کے بندوں کو اس کی تعلیم دو۔

۷۔ معلم و استاد کے افعال و کردار اس کے قول کے خلاف نہ ہوں۔ مثلاً کسی چیز کو حرام سمجھتا ہے اور اسی کو انجام بھی دیتا ہے۔

۸۔ اپنی طاقت کے مطابق اظہار حق کرتا ہو اور سستی نہ کرتا ہو: رسول ؐ فرماتے ہیں :

اذا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جب میری امت میں بدعت اور خلاف واقع باتیں ظاہر ہونے لگیں تو عالم پر واجب ہے کہ وہ اپنے علم کو ظاہر کرے اور اگر ایسا نہ کرے تو اس پر خدا کی لعنت۔

شاگردوں اور کلاس سے متعلق اچھے استاد کے فرائض

۱۔استاد کو چاہیے کہ وہ شاگردوں کو اچھے اخلاق و آداب اور دینی مسائل کی بتدریج تعلیم دے اور ان کے اندر دنیا سے بے رغبتی کی فکر پیدا کرے۔

۲۔ ان پر علم کی فضیلت اور اس کی قدروقیمت کو واضح کرے اور انھیں علماء و انبیاء کا مرتبہ سمجھائے۔

۳۔ان کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے کرتا ہے اور جو چیز اپنے لئے پسند نہیں کرتا اسے ان کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

۴۔طلبہ کوبد اخلاقی حرام کاموں کے ارتکاب اور ان چیزوں سے روکنا چاہیے جو ان کے لئے مضر ہوں۔

۵۔طلبہ کے سامنے فخرومباہات نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے ساتھ فروتنی سے پیش آنا چاہیے کہ رسول کا ارشاد ہے: لینوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تعلیم لینے اور تعلیم دینے والے کے لئے نرم ہوجاؤ ان کے ساتھ خاکساری سے پیش آؤ۔

۶۔طلبہ کی دل جوئی کرے اگر وہ حاضر نہ ہوں تو ان کے حاضر نہ ہونے کی علت دریافت کرے خود یا کسی کے ذریعہ ان کا سراغ لگائے اگر وہ مریض ہوں تو ان کی عیادت کو جائے اگر ان کو کوئی حاجت درپیش ہو اور وہ اس کو رفع کرسکتا ہو تو اس کو رفع کرے۔

۷۔ان کے نام اور خصوصیات کے ساتھ ان کا تعارف کرائے۔

۸۔ان کو تعلیم دین یک یلئے آسان طریقہ اختیار کرے پہلے انھیں ضروری چیزوں کی تعلیم دے اور ان کی استعداد کے مطابق تعلیم دے۔

۹۔کلاس میں رغبت و شوق کے ساتھ جائے اور ایسے مشکل مسائل بیان کرنے سے پرہیز کرے کہ جن کو سمجھنے کی طلبہ میں استعداد نہ ہو۔

۱۰۔اگر طلبہ ایک درجے اور ایک رتبہ کے ہوں تو ان کو ایک نظر سے دیکھے، ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے لیکن اگر ان میں درجے اور عمر کا فرق ہوتو اس کا احترام زیادہ کرے جو زیادہ با استعاداد ہے تاکہ دو سروں میں اقدار کے حصول کا شوق پیدا ہو۔

درس دیتے وقت استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ درج ذیل نکات کو ملحوظ رکھے۔

۱۔پورے رعب و وقار کے ساتھ جائے، صاف، ستھرا لباس پہن کر اور بدن کی ظاہری طہارت سے آراستہ ہو کر کلاس میں جائے۔

۲۔لاس میں جاتے وقت بسم اللہ پڑھے اور نبی و ائمہ سے وارد ہونے والی دعائیں پڑھے جو کہ بلند معانی و مضامین پر مشتمل ہیں مثلاً یہ کہے: اے اللہ مجھے گمراہ ہونے، گمراہ کرنے، کج فہمی وبد اندیشی سے محفوظ رکھ اس دعا کے ساتھ درس شروع کرے۔

۳۔کلاس میں پہنچ کر، حاضرین کو سلام کرے اور اگر کسی مسجد میں درس دیتا ہے تو در رکعت نمازتحیت بجالائے اور خدا سے دعا کرے کہ اسے غلطی سے بچائے اور اسے اپنی توفیق سے نوازے۔

۴۔مسند درس پر سکون ووقار اور پوری تیاری کے ساتھ بیٹھے اور پہلے مطالعہ کے ساتھ درس شروع کرے۔

۵۔جہاں تک ممکن ہو قبلہ رو بیٹھے اور فضول باتوں سے پرہیز کرے۔

۶۔خلوص نیت کے ساتھ کلاس میں جئے اور احکام خدا کو پہنچانے اور علم پھیلانے کو اپنا مقصد قرار دے۔

۷۔درس دیتے وقت مزاح و مذاق سے پرہیز کرے اگر ہوسکے شائستہ مذاق او رلطیفہ کے ذریعہ کلاس کے طلبہ کی تھکن کو دور کرے۔

۸۔ایسی جگہ بیٹھے جہاں سے اسے سارے شاگرد دکھائی دیں پڑھاتے وقت اس کی توجہ سب پر مساوی ہونی چاہیے اور اگر کوئی طالب علم سوال کرے تو پوری توجہ کے ساتھ اس کا جواب دینا چاہیے۔

۹۔خندہ پیشانی اورتبسم کے ساتھ درس دینا چاہیے ترش روئی اور سخت لہجہ میں نہیں۔

۱۰۔درس شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کی کچھ آیات کی تلاوت کرے۔

۱۱۔ استاد کے لئے یہ بات بہت اہم ہے کہ اگر اس سے کوئی سوال کیا جائے اور وہ اس کا جواب نہ جانتا ہو تو اسے پورے وقار کے ساتھ یہ کہنا چاہیے کہ میں نہیں جانتا کیونکہ حضرت علی ؑ کا ارشاد ہے:

اذا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جب تم سے ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے جس کا تمہیں علم نہ ہو تو اس سے بھاگو لوگوں نے رض کی: کیسے بھاگیں ؟ فرمایا: کہدو! اللہ بہتر جانتا ہے۔

واضح رہے اگر وہ یہ کہدے کہ مجھے علم نہیں ہے تو اس سے اس کی قدرومنزلت کم نہیں ہوگی بلکہ لوگوں میں اس عزت اور بڑھ جائے گی اور وہ اس کی اس بات کو اس کے تقویٰ اور دیانت کی دلیل سمجھیں گے۔

طلبہ کا مرتبہ رسول ؐ کی نظر میں

معیتہ المرید میں شہید ثانی ؒ نے بہت سے آداب نقل کئے ہیں ہم اتنے ہی پر اکتفاء کرتے ہوئے طلبہ کا مرتبہ اور ان کے ثواب کو بیان کرتے ہیں :

۱۔رسول ؐ فرماتے ہیں : جو شخص علم کی تلاش میں جاتا ہے اور اسے حاصل کرلیتا ہے خدا اسے دوہری جزا عطا کرتا ہے اور جو شخص علم کی تلاش میں جاتا ہے اور علم حاصل نہیں کر پاتا ہے خداوند عالم اسے ایک اجر عطا کرتا ہے۔

۲۔جو شخص ان لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہے جن کو خدا نے جہنم سے آزاد کردیا ہ یتو اسے طلبہ کو دیکھنا چاہیے قسم اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے جو طالب علم کسی عالم کے گھر آمدورفت رکھتا ہے خداوند الم اس کے ہر قدم پر ایک سال کی عبادت لکھتا ہے اور ہر قدم پر اس کے لئے جنت میں ایک شہر بناتا ہے اور جب وہ زمین پر چلتا ہے تو زمین اس کے لئے استغفار رتی ہے اس کی صبح و شام مغفرت کی حالت میں ہوتی ہے اور خدا کے فرشتے اس کے لئے یہ گواہی دیتے ہیں کہ وہ جہنم سے خدا کے آزاد کئے ہوئے ہیں۔

۳۔ رسول ؐ فرماتے ہیں : طالب علم دن میں روزہ رکھنے والے اور رات میں عبادت کرنے والے کی مانند ہے اور وہ علم کا جو باب حاصل کرتا ہے وہ اس کے لئے اس سے بہتر ہے کہ کوہ ابوقبیس اس ے لئے سونا ہو اور وہ اسے راہ خدا میں لٹا دے۔

۴۔ رسول ؐ فرماتے ہیں جس کو علم حاصل کرتے ہوئے موت آدائے تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان ایک درجہ ہے بشرطیکہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے لئے علم حاصل کررہا ہو۔

شریک حیات کا حق

نکاح کے ذریعہ جو حق تمہارے اوپر مسلم ہوگیا ہے وہ یہہے کہ تم یہ جان لو کہ اسے خدا نے تمہارے لئے باعث سکون و آرام اور مونس و انیس اور نگہباں قرار دیا ہے اسی طرح تم دونوں پر یہ فرض ہے کہ اپنے شریک حیات کے وجود پر خدا کا شکر ادا کرے اور یہ جان لے کہ یہ خدا کی نعمت ہے جو اس نے اسے عطا کی ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ خدا کی نعمت کی قدر کرے اور اس کے ساتھ نرمی سے پیش آئے اگر تمہاری شریک حیات پرتمہارا حق زیادہ سخت ہ یاور جو تم پسند کرتے ہو اور جو پسند نہیں کرتے اس میں اس پر تمہاری طاعت زیادہ لازم ہے بس اس میں گناہ نہ ہو۔ لیکن اس کا بھی تم پر یہ حق ہے کہ تم اس کے ساتھ نرمی و محبت سے پیش آؤ اور وہ بھی اس لذت اندوزی کے لئے تمہارے لئے مرکز سکون ہے کہ جس سے مفر نہیں ہے اور یہ بجائے خود بہت بڑا حق ہے اور خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مکارم الاخلاق میں یہ عبارت بھی نقل ہوئی ہے:

فان لھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس کا تمہارے اوپر یہحق ہے کہ تم اس کے ساتھ نرمی و محبت سے پیش آؤ کہ وہ تمہاری اسیر ہے اسے کھانا کھلاؤ کپڑا پہناؤ اور اگر اس سے نادانی سے کوئی غلطی ہوجائے تو اسے معاف کردو۔

شرم گاہ کی بحث کیذیل میں ہم نے شادی اور خاندان کی تشکیل کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے اور اس میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ بدکاری و گناہوں میں ملوث نہ ہونے کا بہترین ذریع ہشادی کرنا ہے وہاں ہم نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ جسم و روح اور نفسیات پر بدکاری اور زنا کے مضر اثرات ہوتے ہیں۔ یہاں ہم جیسا کہ امام زین العابدین ؑ نے فرمایاہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اختصار کے ساتھ شریک حیات کے فرائض کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

یہ بات ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ شادی مبارک و محکم رشتہ ہ یکہ جس کو میاں بیوی اکی عہد و معاہدے کے ذریعے استوار کرتے ہیں اور یہ رشتہ ان کی آخری سانس تک باقی رہتا ہے، وہ عمر بھر ایک دوسرے کے ساتھ مسرت و محبت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور اپنے وجود کے درخت سے مفید وشیرین پھل بیٹے اور بیٹیوں کی تربیت کرکے معاشرہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس رشتہ میں اسی صورت میں استحکام و دوام پیدا ہوسکتا ہے کہ جب مردوعورت ان احکام سے واقف ہوں کو اسلام نے حق کے عنوان سے متعارف کرایا ہے ورنہ یہ رشتہ کمزور ہوجاتا ہے۔

مودت و رحمت

امام زین العابدین ؑ نے جو پہلی خصوصیت بیان فرمائی ہے وہ آرام و سکون ہے خداوند عالم نے قرآن مجید میں مردو عورت کی خلقت اور ان دونوں کے ایک ساتھ رہنے کو اپنی آیت و نشانی کے عنوان سے بیان کیا ہے:

اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہاری شریک حیات کو پیدا کیا ہے تاکہ اس کے پاس تم آرام پاؤ اور اس نے تمہارے درمیان محبت و الفت قرار دی ہے بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غوروفکر کرتے ہیں۔

آرام و سکون کے مسئلہ کو سورۂ اعراف میں بیان فرماتا ہے:

خداوہ ہے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کی زوجہ کو بھی اس سے بنایا تاکہ وہ اس کے پاس آرام پائے۔

ان دونوں آیتوں میں آرام و سکون کو بیان کیا گیاہے جو کہ خداکی عظیم عطا ہے یہ آرام جسمی بھی ہے اور روحی بھی اس میں فردی پہلو بھی ہے اور اجتماعی بھی ہے۔شادی نہ کرنے سے انسان کے بدن میں جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا اسی طرح وہ نفسیاتی الجھنیں بھی محتاج بیان نہیں ہیں کہ جن سے غیر شادی شدہ دوچار ہیں اجتماعی لحاظ سے غیر شادی شدہ افرادذمہ داری کا احساس کم کرتے ہیں خودکشی بھی زیاد ہ تر غیر شادی شدہ لوگ ہی کرتے ہیں اور وہی ظلم و جرائم زیادہ کرتے ہیں۔ جو غیر شادی شدہ شادی کرلیتا ہے وہ اپنے اندر نئی شخصیت محسوس کرتا ہے اور ذمہ داری کا زیاد ہ احسا کرتا ہے۔

سکون و آرام کہ جس کو بہترین زندگی شمار کیا جاتاہے اور جس کو بھی سبھی تلاش کرتے ہیں۔ مودت و رحمت بیان ہوئی ہے۔ در حقیقت یہ دونوں لفظ معاشرہ انسانی کی عمارت کو جوڑنے کا مصالح ہیں، مودت و رحمت میں بعض اعتبار سے فرق ہوسکتا ہے۔

۱۔کام کے آغاز میں مودت ارتباط کا محرک ہوتی ہے لیکن اختتام میں کہ جب ان دونوں میں سے ایک کمزورو ضعیفہوجاتا ہے اس وقت اسے رحمت کی ضرورت ہوتی ہے مودت کی نہیں۔

۲۔مودت بزرگوں کے لئے ہے وہ ایک دوسرے کی خدمت کرسکتے ہیں لیکن بچے رحمت کے سایہ میں پرورش پاتے ہیں۔

۳۔ مودت میں زیادہ تر بدلے کا پہلو ہوتا ہے لیکن رحمت یک طرفہاور ایثار کے ساتھ ہوتیہے۔

جس میں بیوی کی زندگی سکون وآرام سے سرشار مودت و محبت سے ہم کنار اور لطف ورحمت سے مالا مال ہوتی ہے اس کی مثال غیر متزلزل عمارت کی سیہے اس کے برخلاف ان چیزوں سے خالی زندگی کی مثال کمزور اور ویران عمارت کی سی ہے شادی اجتماعی زندگی کی پہلی کلاس اور حقوق کا سبق پڑھنے کا مدرسہ ہے جو حقوق اسلام میں زن و شوہر کے لئے مقرر کئے گئے ہیں وہ دو قسم کے ہیں : ۱۔ قانونی حقوق، ۲۔ اخلاقی حقوق

قانونی حقوق، عورت کا نفقہ، کھانا خوراک، مسکن و رہائش اور لباس، شوہر کے ذمہ ہے اس کے عوض عورت کو شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہوگی۔ ان حقوق کی مثال ان مصالح کی سی ہے جو عمارت کو مضبوط بناتے ہیں۔

اخلاقی حقوق: یہ وہ حقوق ہیں جن کی رعایت مرد کو بھی کرنا چاہیے اور عورت کو بھی لیکن اگر کسی ایک نے ان کی رعایت نہ کی تو اس میں کوئی قانونی گرفت نہیں ہے ہاں زندگی کا مزہ ان کی انجام دینے ہی میں ہے، مثلاً محبت و خلوص اور ایک دوسرے کی خاطر داری کرنا۔

فطرت و تخلیق کے قانون نے مردوعورت کو ایک دوسرے سے اچھی طرح قریب کرنے اور خاندان کے پایہ کو، جو کہ بشر کی سعادت کا اصلی ستون ہے، استوا کرنے کے لئے مردوعورت کوایک دوسرے کا نیاز مند پیدا کیاہے اگر مالی لحاظ سے مرد کو عورت کا سہارا قرار دیا ہے تو عورت کو مرد کے روحی سکون و آرام کا سہارا قرار دیا ہے۔ یہ دونوں مختلف ضرورتیں انھیں ایکدوسرے سے نزدیک کرتی ہیں۔

خاندان کے نظام کی سرپرستی

الرجال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کبیرا۔

مرد اس فضیلت کے سبب عورتوں کے وارث و سرپرست ہیں جو خدا نے بعض کو بعض پر عطا کی ہے اور پھر یہکہ وہ اپنے اموال میں سے ان پر خرچ کرتے ہیں اور ان کی نیک و شریف عورتیں متواضع ہیں جو اپنے شوہروں کی عدم موجودگی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں لیکن وہ عورتیں کہ جن کی نافرمانی سے تم ڈرتے ہو، ان کو نصیحت کرو اگر نہ مانیں تو ان سے اپنا بستر الگ کرلو اگر اس کا بھی اثر نہ ہوتو مارو پھر اگر وہ تمہاری پیروی کریں تو ان پرظلم نہ کروبیشک خدا بلند اور بڑا ہے۔

واضح رہے کہ خاندان ایک چھوٹا معاشرہ ہے اس کو راہنما اور سر پرست کی ضرورت ہے مرد خاندان کا حاکم و سرپرست ہے اور عورت اس کی مددگار اور اس کے ماتحت ہے اور مرد کو یہ درجہ ان خصوصیات کی بنا پر دیا گیا ہے جو اس کے اندر موجود ہیں کیونکہ اس کی فکری صلاحیت اس کے احساسات و محبت پر بھاری ہوتی جب کہ عورتوں میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی اس کے اندر جسمانی طاقت زیادہ ہے جس سے زندگی کا نقشہ پیش کرسکتا ہے اور خاندان سے دفاع کرسکتا ہے او ر بما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ بات بھی محتاج بیان نہیں ہے کہ اس ذمہ داری کا مرد کے سپرد کرنا اس کی انسانی شخصیت کے بلند ہونے کی دلیل نہیں ہے اور نہاس کی فوقیت کا سبب ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک معاون کی انسانی شخصیت مختلف پہلوؤں سے ایک افسر سے زیادہ ہوتی ہے لیکن حاکم کے ذمہ جو کام کیا گیا ہے اس کے لئے وہ معاون سے زیادہ لائق ہے۔

مذکورہ آیت کی رو سے عورتوں کو دو دستوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ نیک وشریف: یہ خاندان کے نظام کی پابند ہیں، شوہر کی موجودگی ہی میں اس کے مال و ناموس اور اس کی شخصیت کی حفاظت نہیں کرتی ہیں بلکہ اس کی عدم موجودگی میں بھی حفاظت کرتی ہیں خدا نے ان کے لئے جوحقوق مقرر کئے ہیں اور جن کی طرف ’’ بما۔۔۔۔۔‘‘ کے ذریعہ اشارہ کیا ہے وہ ان کی روشنی میں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیتی ہیں۔

دوسرا دستہ: جو عورتیں اپنے فرائض کو پورا نہیں کرتی ہیں اور جن کے اندر نہ نباہ نہ کرنیوالے آثار نظر آتے ہیں۔ مردوں کو چاہیے کہ وہ پہلے دستہ کا احترام و اکرام کریں اور دوسرے دستہ کو نصیحت کریں اور ان سے علیحدگی اختیار کریں اور اگر ان پر اس کو کوئی اثر نہ ہوتو پھر ان پر اتنی تنبیہ کریں جتنی شریعت اسلامیہ میں بیان ہوئی ہے۔

اس آیت کو نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم اس بات کی طرف متوجہ ہوجائیں کہ عورت کے اخراجات کو قرآن مجید نے مرد کے ذمہ کیا ہے، امام زین العابدین ؑ بھی یہی وصیت فرماتے ہیں کہ عورت کے روٹی کپڑے کا خیال رکھو اور ان کے حقوق کی رعایت کرو بڑے فقہا نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے کہ نفقہ واجب ہے۔

اما نفقۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔النشوز۔

دائمی زوجہ کا نفقہ، کھانا، کپڑا، مکان، فرش وبستر، پردہ، صفائی کے آلات اور وہ چیزیں جن کی عورت کو ضرورت ہوتی ہے، مرد پر واجب ہیں، بشرط یہ کہ وہ مرد کے گھر میں رہے اور اس کی مطیع ہو، بنابرایں اگر وہ کسی شرعی جواز کے بغیر گھر سے نکلے تو وہ نفقہ کی مستحق نہیں ہے۔ اور مشہور فقہا ء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ نفقہ اس صورت میں واجب ہے کہ جب عورت نافرمان نہ ہو۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ عورت کے حقوق دو قسم کے ہیں : ایک قانونی حقوق جو نفقہ سے عبارت ہیں۔اگر مرد نفقہ نہ دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ قانونی چارہ جوئی کرکے مد سے اپنا نفقہ لے دوسرے حقوق:اخلاقی و انسانی ہیں کہ ان کا پاس و لحاظ رکھنا زندگی کی بقاء و دوام کا سبب ہوتا ہے ان حقوق کی رعایت کرنے سے جو سکون و اطمینان اور آرام و چین ملتا ہے اسے ہم یہاں سپرد قلم کررہے ہیں :

رسولؐ نے عورتوں اور ان کے حقوق کے بارے میں بہت تاکید فرمائی ہے ان میں سے بعض احادیث یہ ہیں :

رسول ؐ فرماتے ہیں : تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو اپنے خاندان والوں کے لئیبہترین ہے اور میں تمہارے درمیان اپنے خاندان والوں کے لئے سب سے بہتر ہوں۔

مرد کی شریک حیات اس کے گھر میں ایک اسیر کی مانند ہے اور خدا کے نزدیک بہترین بندے وہ ہیں جو اپنی شریک حیات کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں۔

امام محمد باقر ؑ، رسول ؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا: جبریل نے عورت کے بارے میں مجھ سے اتنی سفارش کی ہے کہ میں یہ سوچنے لگا : اس کو طلاق نہیں دی جاسکتی مگر یہ کہ وہ کھلم کھلا گناہ کاارتکاب کرے۔

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں :

رسولؐ نے فرمایا: جو اپنی عورت کی حرکتوں، خواہ اس کی ایک بات، کو برداشت کرتا ہے خدا اسے جہنم سے آزاد کردیتا ہے اور جنت کو اس پرواجب کردیتا ہے اور اس کے لئے دو لاکھ نیکیاں لکھتا ہے اور اس کے دو لاکھ گناہوں کو محو کردیتا ہے۔ اس کے دو لاکھ درجات کو بلند کرتا ہے اور اس کے لئے اتنے سال کی عبادت لکھتا ہے کہ جتنے اس کے بدن پر بال ہیں۔

عورت کے حقوق کے بارے میں رسولؐ کی یہ حدیثیں بہترین دستور ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں۔ مرد کا فریضہ ہے کہ وہ گھ میں اپنی بیوی کے ساتھ مودبانہ اور شائستہ برتاؤ کرے اور اس کی لغزشوں سے چشم پوشی کریاس کیبد تمیزی پر صبر کرے تاکہ اسے وہ ظعیم جزا مل جائے جو رسول ؐ نے بیان فرمائی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ گھر میں کچھ نہ کچھ ناچاقی ہوتی ہے کبھی مردو عورت کے اخلاق میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے کشمکش ہوجاتی ہے اور کبھی کوئی ایسا فعل سرزد ہوجاتا ہے کہ جس سے وہ ایک دوسرے سے مایوس ہوجاتے ہیں اور ان کے درمیان زیادہ فاصلہ ہوجاتا ہے اگر وہ اس کی تلافی نہ کریں تو ممکن ہے کہ طلاق ہوجائے خصوصا اس مردوعورت کے لئے کہ جنھوں نے ابھی زمانہ کے نشیب و فراز کو نہیں سمجھا ہے اور جوانی کی مستیوں میں چور ہیں، ان کو بہت جلد غصہ آتا ہے اور ایک دوسرے سے انتقام لینے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ ان اسباب کا سد باب کرنے کی خاطر اسلام نے مردو عورت کو کچھ نصیحت کی ہیں اور انھیں ایک دوسرے کی لغزش سے چشم پوشی کرنے کی تاکید کی ہے اور انھیں ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کرنے کی وصیت کی ہے:

عمار بن اسحٰق نے امامصادق ؑ سے دریافت کیا کہ مرد پر عورت کا کیا حق ہے ؟ فرمایا: اس کوشکم سیر کرے اسے کپڑا پہنائیے اور ان کی نادانیوں سے چشم پوشی کرے۔ خلیل خدا حضرت ابراہیم نے سارہ کے اخلاق کی شکایت کی تو خدا نے ان پروحی نازل کی:

عورت پسلی یا خشک اور سوکھی لکڑی کی مانند ہے اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو ٹوٹ جائے گی اور اگر اس سیدر گزر کروگے تو اس کے وجود سے لذت اندوز ہوگے۔

اہم ترین موضوعکہ جس کی طرف مرد کو زندگی میں متوجہ ہونا چاہیے یہ ہے: اسے یہ معلوم ہوناچاہیے کہ اس کی بیوی اس کی شریک حیات ہے اس کے گھر میں اسیر نہیں ہے لہٰذا فقہی نقطہ ٔ نگاہ سے مرد کو یہ حق نہیں ہے کہوہ اپنی زوجہ کو کام کرنے پر مجبور کرے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اپنی شریک حیات کی مدد کرے ہمارے ائمہ معصومین ؑ نے ان لوگوں کا بہت ثواب بیان کیاہے کہ جو اپنی عورتوں کی مدد کرتے ہیں ان میں بعض درجذیل ہیں :

شریک حیات کی مدد کی جزا

رسول اللہ ؐ نے حضرت علی ؑ سے فرمایا:

اے ابوالحسن مجھ سے سنو کہ میں وہی کہتا ہوں جس کا مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے اور یہ کہ جو مرد بھی گھر میں اپنی عورت کی مدد کرتا ہے خدا کو اس کے بدن کے ایک ایک بال پر ایک سال کی نماز روزہ کا ثواب دیتا ہے اور اسے صابروں،داؤد و یعقوب اورعیسیٰ ؑ،جیسا ثواب عطا کرتا ہے۔

اس حدیث میں عورت کی مدد کییہ تشویقاس بات کا سبب ہوتی ہے کہ مومن مرد اپنی شریک حیات کی مدد کرے اور اس پر حکمرانی کرنے سے پرہیزکرے۔

رسول ؐ نے فرمایا: اے علی ؑ ! جو شخص گھر میں بیوی کی مدد کرتا ہے اور مدد کرنے سے کبیدہ خاطر نہیں ہوتا ہے خداوند عالم اس کا نام شہیدوں کی فہرست میں لکھتا ہے اور ہر شب و روز میں اسے ہزار شہیدوں کا ثواب عطا کرتا ہے اس کے ہر قدم پر ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب لکھتا ہے اور اس کے لیے جنت میں اتنے ہی شہر بناتا ہے جتنی اس کے بدن میں رگیں ہیں۔

رسولؐ نے فرمایا: اے علی ؑ! شریک حیات کی مدد کرنا بڑے گناہوں کا کفارہ ہے اور پروردگارکے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور یہ جنت کی حوروں کا مہر بن جاتا ہے اور حسنات و درجات میں اضافہ کرتا ہے۔

سختی کرنے والے مردوں کی مذمت

رسول ؐ نے فرمایا: جو شخص بلا خطا اپنی زوجہ کو مارتا ہے قیامت کے دن میں اس کا دشمن ہونگا اپنی عورتوں کو مت مارو کیونکہ جو شخص ناحق اپنی بیوی کو مارتا ہے وہ خدا و رسول ؐ کی نافرمانی کرتا ہے۔

رسول ؐ نے فرمایا: اس شخص کا ہم سے تعلق نہیں ہے جس کے پاس کافی مال و دولت ہو اور وہ اپنی بیوی پر جفا کرتا ہو اور اس کو تنگی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہو۔

شریک حیات کے لئے وسعت

امام زین العابدین ؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ خوشنود وہ ہے جو اپنی شریک حیات کے اخراجات کو فراخی کے ساتھ پورے کرتا ہو۔

امام رضا ؑ فرماتے ہیں : مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عیال کو زندگی میں اتنی وسعت دے کہ جس سے وہ کسی وقت بھی مرنے کی تمنا نہ کرے۔

یہاں تک ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ مردوں کو چاہیے کہ وہ اپنی بیویوں پر مہربان رہیں، انھیں اذیت نہ دیں، رنجیدہ نہ کریں ان پر سختی نہ کریں بلکہ ان کی مدد کریں اب دیکھنا یہ ہے کہ مردوں کی ان خدمات کے عوض اسلام نے عورتوں کو کیا حکم دیا ہے اور زندگی کی میزان میں انھیں کیسا کردار ادا کرنا چاہیے۔

عورت پر مرد کے حقوق

حسن بن محبوب نے مالک بن عطیہ سے انھوں نے محمد بن مسلم سے انھوں نے محمد باقر ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک عورت رسول ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ ! عورت کا پر مرد کاکیا حق ہے؟ آپ نے جواب دیا: اسے اپنے شوہر کی اطاعت کرنا چاہیے اس کی بات کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے صدقہ نہیں دینا چاہیے اس کی اجازت کے بغیر مستحب روزہ نہیں رکھنا چاہیے خود کو اس کے اختیار میں دینا چاہیے اس کی خواہش کو پورا کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے خواہ و ہ سواری پرسوار ہو، اس کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جانا چاہیے اگر اس کی اجازت کے بغیر نکلے گی تو اس پر زمین و آسمان اور غضب و رحمت کے فرشتے لعنت کریں گے۔عورت نے سوال کیا : اے اللہ کے رسولؐ ! مردوں میں سے مرد پرکس کا حق زیادہ ہے؟فرمایا: اس کے ماں باپ کا، پھر سوال کیا عورت پرسب سے زیادہکس کا حق ہے؟ فرمایا: اس کے شوہر کا، عرض کی: کیا اس پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے؟ جتنا اس کا میرے اوپر ہے؟ فرمایا: نہیں بلکہ ایک فیصد بھی نہیں اس نے کہا: اس خدا کی قسم کہ جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، مرد ہرگزمیرا مالک نہیں بن سکتا۔

رسول ؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: عورت پر مرد کا حق یہہے کہ چراغ روشن کرے، کھانا پکائے جب شوہر کام سے واپس آئے تو دروازہ پر جاکر اس کا استقبال کرے اسے خوش آمدید کہے اس کے لئے طشت و تولیہ پیش کرے اس کے ہاتھ دھلوائے اور اس کی خواہش کو پورا کرنے میں دریغ نہ کرے مگر یہ کہ کوئی وجہ ہو۔

رسولؐ نے فرمایا:عورت اس وقت تک خدا کا حق ادا نہیں کرستی جب تک کہ شوہر کا حق ادا نہیں کرے گی۔

امام صادق ؑ نے فرمایا:جوعورت رات میں سوئے اور اس کا شوہر اس سے ناراض ہوتو اس وقت تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی جب تک کہ اس کا شوہر خوش نہ ہوجائے۔

عورتوں کا جہاد

امام محمدباقر ؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا نے مرد اورعورت پر جہاد واجب کیا ہے مرد کا جہاد یہ ہے کہ وہ راہ خدا میں جان و مال کو قربان کرے یہاں تک کہ شہادت ایسے بلند مرتبہ پر پہنچ جائے اور عورت کا جہاد یہ ہے کہ وہ شوہر کی اذیت اور اس کی غیرت پر صبر کرے۔

اس حدیث میں امام محمد باقر ؑ نے گھر کو محاذ جنگ اور عورتوں کو فوج قرار دیا ہے اور صبر کو اس جنگ کا اہم ترین اسلحہ شمار کیا ہے اور مرد کی اذیت وایذا رسانی نیزہ و شمشیر ہے جو عورت پر پڑتی ہے عورت اس محاذ سے فرار نہیں کرسکتی بلکہ اسے صبر وثابت قدمی سے اس کا مقابلہ کرتے رہنا چاہیے یہاں تک کہ زندگی کو بہترین نتیجہ پر ختم کردے بہت سی عورتیں ناتجربہ کار ی اور عدم تربیت کی وجہ سے شکست کھا جاتی ہیں وہ شوہر کا گھر چھوڑ دیتی ہیں اور اپنی اولاد کو ماں کی محبت و شفقت سے محروم کردیتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے اپنی اور شوہر و اولاد کی زندگی کو مکدر بنا دیتی ہیں۔ ان کے برخلاف صبر کرنے والی عورتیں اپنی زندگی کی کشتی کو شوہر کے غیظ و غضب کی بپھری ہوئی موجوں سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچا دیتی ہیں خود بھی کامیاب ہوجاتی ہیں اور بچوں کی عاقبت بھی سنوار دیتی ہیں۔

امام صادق ؑ نے شوہر کے علاوہ دوسروں کے لئے زینت و سنگھار کرنے سے منع کیا ہے فرماتے ہیں :

جو عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور کے لئے خوشبو لگاتی ہے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی ہے یہاں تک کہ وہاس خوشبو کو اس طح دھو دے جس طرح وہ غسل جنابت کرتی ہے۔

اپنے شوہر کی قدر نہ کرنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :

جو عورت اپنے شوہر سے یہ کہتی ہے کہ مجھے تمہای طرف سے ہرگز کوئی خوشی نہیں ملی، اس کے اعمال برباد ہوجاتے ہیں۔

اگر اسلامی معشارہ کے مردوعورت ان باتوں پر عمل کریں گے تو یقینا وہ کامیاب اور اچھی زندگی بسر کریں گے مردوعورت کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

روزہ کی رات میں عورتوں سے ہم بستری کرنے کو تمہارے لئے حلال کردیا گیا ہے وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو (دونوں ایک دوسرے کی زینت ہو اور ایک دوسرے کی حفاظت کرنے والے ہو) یہ کتنا پیارا جملہ ہے کہ مردوعورت ایک دوسرے کے لئے لباس کی مانند ہیں جس طرح بدن کو چھپانے اور اسے سردی و گرمی سے بچانے اور زینت کے لئے لباس ہوتا ہے اسی طرح ایک دوسرے کے لئے میں بیوی بھی ہوتے ہیں وہ بھی ایک دوسرے کے عیوب کو چھپاتے ہیں اور ایک دوسرے کو آرام و سکون بخشتے ہیں یہ لباس ان کی زندگی کیہر پہلو کو ڈھانک لیتا ہے میاں بیوی کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے عیوب اور خامیوں کو چھپائیں ایک دوسرے کی بد اخلاقی و بد تمیزی کو دوسروں سے نہ بیان کریں اپنی اندرونی زندگی کا رازفاش نہ کریں ایک دوسرے کا احترام کریں ایکدوسرے پر تہمت نہ لگائیں کہ دونوں برباد ہوجائیں گے ایک دوسرے کی باتوں کو برداشت کریں تاکہ خدا انھیں وہ عظیم اجر عطا کرے جس کا اس نے وعدہ کیاہے۔

جیسا کہ امام زین العابدین ؑ نے فرمایا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسے ک یلئے بڑی نعمت ہیں جس کا انھیں شکر ادا کرنا چاہیے زندگی کیخوشیوں اور تلخیوں کو آپس میں تقسیم کرلینا چاہیے فراخ دلی سے کام لینا چاہیے تاکہ ان کی اولاد بہترین و بلند مرتبہ انسان بن جائے شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی پر اپنی دلی محبت کو آشکارکرے بالکل اسی طرح جیسا کہ اس روایت میں بیان ہوا ہے:

مرد کی یہ بات عورت کے دل سے کبھی نہیں نکلتی کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس سے وہ بھی مد سے محبت کرتی ہے اور سختیوں میں وہ اس کی مدد کرتی ہے۔

غلام کا حق

تمہارے مملوک و غلام کا تمہارے اوپر یہحق ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہارے پروردگار ہی کا پیدا کیا ہوا ہے وہ بھی تمہاری ہیطرح گوشت اور خون رکھتا ہے تم اس لئے اس کے مالک نہیں ہو کہ تم نے اسے پیدا کیا ہے بلکہ اسے خدا نے پیدا کیا ہے اورنہ تم نے اس کو کان اور آنکھ عطا کی ہے اور نہ اس کی روزی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ اس سلسلہ میں خدا نے تمہاری مدد کیہے کہ اسے تمہارے تابع کردیا اور تم کو اس کا امین قرار دیا اور اسے تمہاے سپرد کردیا تاکہ تم اس کی حفاظت کرو اور اس کے ساتھ اسی جیسا سلوک کرو اسے وہی کھانا کھلاؤ جو تم کھاتے ہو اور وہی کپڑا پہناؤ جو تم پہنتے ہو اور اس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو اگر وہ تمہیں پسند نہیں ہے تو تم اس کی اس ذمہ داری سے بری ہوجاؤ جو خدا کی طرف سے تم پر عائد ہوئی ہے اور اس کو دوسرے سے بدل لو خدا کی مخلوق کو تکلیف نہ دو، کہ خدا کے علاوہ کو طاقت و قوت نہیں ہے۔

مولا کے حق کے بارے میں امام زین العابدین ؑ پہلے بیان فرما چکے ہیں اور مذکورہ عبارت غلاموں کے حقوق سے متعلق ہے۔

اس بحث میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اسلا م نے اپنے آغاز میں غلامی کو قبول کیا تھا ان کی آزادی کا یکبارگی اعلان کرنا ممکن نہ تھا بلکہ رفتہ رفتہ غلامو ں کو آزاد کرایا کیونکہ اقتصادی لحاظ سے ان کی آزادی کا یکبارگی اعلان موزوں نہیں تھا لہٰذا جب غلامی کے نظریہ کو قبول کرلیا تو غلاموں کے حقوق بھی مقرر کئے اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سنجیدگی سے غلاموں کے حقوق کو پورا کریں۔

اسلام اور غلامو ں کی حیثیت

۱۔ اسلام نے غلام اور آقا کے فرق کو ختم کردیا اور سب کو بھائی بھائی بنا دیا : رسول ؐ فرماتے ہیں :

اخوانکم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فلیعنہ۔

تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں خدا نے آزمائش کے لئے انھیں تمہارے ماتحت کردیا ہے پس انھیں اپنیکھانے میں سے کھانا کھلاؤ اور انھیں ایسا ہی لباس پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو اور اگر کوئی سخت کام اس کے ذمہ کرو تو اس میں ان کی مدد کرو۔

۲۔ رسول ؐنے غلاموں کے حقوق کچھ اس طرح مقرر کئے ہیں کہ ان کے لئے یہ بھی برداشت نہیں کیا کہ کوئی انھیں کنیز وغلام کہے۔

لایقل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فتاتی۔

کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ کہے:یہ میرا غلام ہے یا یہ میری کنیز ہے بلکہ اسے یہ کہنا چاہیے کہ یہ جوان ہے یہ خاتون ہے۔

۳۔ اسلام نے غلاموں کی اصلاح کرنے کے لئے اتنی کوشش کی ہے کہ ان کو معزز و مکرم کہہ کر پہچنوایا کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو مارتا ہے تو اس کو بد ترین انسان کہا جاتا ہے تاکہ کوئی دوسرا ایسی غلطی نہ کرے۔ خدا کے بندوں میں سے کسی کو آزار نہ پہنچاؤ اور ان پر ظلم نہ کرو، امام جعفر صادق ؑ سے منقول ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:

الا انبئکم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عبدہ۔

کیا میں تمہیں یہ بتاؤں کہ سب سے بد ترین آدمی کون ہے؟ اصحاب نے عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! ضرور بتائیے ! فرمایا: جو تنہا سفر کرے مہمان کو قبول نہ کرے اور اپنے غلام کو مارے۔

اس حدیث میں رسول ؐ نے اس شخص کو بدترین انسان قرار دیا ہے جو اپنے غلام کو مارتا ہے۔

اپنے غلام پر حضرت علی ؑ کا کرم:

ایک روز حضرت علی ؑ کھدر فروشوں کے بازار گئے اور د ولباس خریدے ایک تین درہم میں اور دوسرا دو درہم میں تین درہم والا لباس اپنے غلام قنبر کو بخش دیا اور دو درہم والاخود رکھ لیا غلام نے عرض کی: آپ امیر المومنین ہیں لوگوں کے درمیان خطبہ دیتے ہیں اس لئے تین درہم والا لباس آپ کے شایا ن شان ہے حضرت علی ؑ نے فرمایا: مجھے شرم آتی ہے کہ میں تم پر برتری جتاؤں کیونکہ میں نے رسول ؐ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: البسوھم۔۔۔۔۔۔۔۔

جو تم پہنو وہی انھیں پہناؤ اور جو تم کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔

رسول ؐ نے فرمایا: تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں ان کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ اپنے سخت اور مشکل کاموں میں ان سے مدد حاصل کرو اور دشوار کاموں میں ان کی مدد کرو۔

آپ ؐ ہی کا ارشاد ہے: اوصا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حرا۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں میرے دوست جبریل نے مجھ سے اتنی سفارش کی ہے کہ میں یہ سوچنے لگا کہ جبریل ان کو آزاد کرنے کا وقت معین کریں گے۔

ابوذر اور لباس کی تقسیم:

ابوذر کے پاس دو قیمتی چادریں تھیں جن کو وہ اوڑھے رہتے تھے کچھ مدت کے بعد انھوں نے ایک کا لباس سلوایا لیا اور اپنی عبا کے ساتھ پہن لیا او دوسری چادر اپنے غلام کو دیدی، جب لوگوں نے ابوذر کا یہ عمل دیکھا تو وہ انھیں سرزنش کرنے لگے اور کہنے لگے:اگر دونوں چادریں تم خود پہنتے تو بہتر تھا۔ ابوذر نے جواب دیا :میں نے رسول ؐ سے سنا کہ فرماتے ہیں : اپنے غلاموں کو ایسا ہی لباس دو جیسا تم پہنتے ہو اور وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو۔

رسول ؐ نے ایک سوار کو دیکھا کہ جس کا غلام اس کے پیچھے پیچھے پیدل چل رہا تھا، رسول ؐ نے فرمایا: اپنے غلام کو بھی سوار کرلو وہ تمہارا بھائی ہے اور اس کی روح تمہاری ہی روح کی مانند ہے۔

امام رضا ؑ اور غلام:

یاسر اور نادر دونوں ہی آپ کے غلام تھے وہ روایت کرتے ہیں کہ امام رضا ؑ نے فرمایا: اگر کبھی میں تمہارے پاس آؤں اور تم کھانا کھانے میں مشغول ہوتو کھانے سے فارغ ہونے سے پہلے اپنی جگہ سے نہ اٹھنا۔

غلاموں کے ساتھ امام صادق ؑ کا سلوک:

امام صادق ل نے کسی غلام کو کسی کام کے لئے بھیجا اس کو دیر ہوگئی تو آپ اس کو تلاش کرنے کے لئے نکلے دیکھا کہ وہ سو رہا ہے اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگے جب وہ بیدار ہوگیا تو اس سے فرمایا تم دن میں بھی سوتے ہو اور رات میں بھی؟ رات تمہارے آرام کے لئے ہے اور دن کام کے لئے۔

مذکورہ احادیث سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ائمہ معصومین غلاموں کے احترام میں کتنی کوشش فرماتے تھے۔

غلاموں کا عہد

رسول ؐ نے غلاموں کا رتبہ بلند کرنے کے لئے بھی بہت سے اقدام فرماتے ہیں جیسے غلاموں کو آزاد لوگوں کا بھائی بنا دیا مثلاً : بلال حبشی، زید بن حارثہ اور خارجہ بن زید کو اور آزاد لوگوں میں سے خالد بن رویحہ خثعمی،حمزہ بن ابی طالب اور ابوبکر بن قحافہ کو بھائی بھائی بنا دیا اور معزز خاندانوں میں غلاموں کی شادی کرائی پہلے مرحلہ میں زید بن حارثہ(جو کہ غلام تھے ) کی شادی اپنی پھوپھی کی بیٹی زینب بنت حجش سے کرائی دوسرے مرحلہ میں جو یبر غلام کی شادی بنی بیاضہ کے رئیس زیاد بن لبید کی بیٹی س یکرائی اور آزاد مثلاً ابوبکر، عمر اور مہاجرین و انصار میں سے دیگر لوگوں کے ہوتے ہوئے اسامہ بن زید کو لشکر اسلام کا سپہ سالار مقرر کیا اور رومی دشمنوں سے جنگ کے لئے شام کی طرف روانہ کیا۔

غلاموں کو آزاد کرنے کا ثواب

یہ تھے رسول ؐ اور ائمہ ؑ کی حدیث کی روشنی میں غلاموں کے حقوق اب ہم اس بحث کے اختتام پر غلاموں کو آزاد کرنے کا ثواب بیان کرنا چاہتے ہیں مالک کے حق کے ذیل میں ہم نے غلاموں کی آزادی کے طریقوں کی وضاحت کردی تھی : غلاموں کی آزادی کے ثواب کے بارے میں وسائل الشیعہ میں ایک کتاب العتق ہے اس کتاب کے باب استحباب میں بہت سی حدیث میں نقل ہوئی ہیں ان میں سے بعض کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

پہلی روایت:

محمد بن الحسن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ من النار۔

شیخ طوسی نے اپنی سند سے حسین بن سعید اور دوسرے چند راویں سے روایت کی ہے کہ امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا: جوشخص اپنے غلام کو آزاد کرتا ہے خداوند عالم اس کے ہر عضو کو آزاد ہونے والے غلام کے عضو کے عوض آتش جہنم سے آزاد کرتا ہے۔

اس باب کی چوتھی روایت:

وعن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔من النار۔

حسین بن محمد بن معلی بن محمد سے انھوں نے حسن بن علی سے انھوں نے ابان سے اور انھوں نے بشیر بن نبال سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام جعفر صادق ؑ سے سنا کہ فرماتے ہیں : جوشخص نیک و صالح غلام کو راہ خدا میں آزاد کرے گا خداوند عالم اس غلام کے ہر عضو کے بدلے اس کے عضو کوجہنم کی آگ سے آزاد کرے گا۔

عرفہ میں عصر کے وقت غلاموں کی آزادی:

اس باب کی چھٹی روایت میں امام صادق ؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

امیر المومنین علی بن ابی طالب ؑ نے اپنی کمائی سے ہزار غلاموں کو آزاد کیا ہے۔

کتاب مذکور کے دوسرے باب میں عرفہ کے روز غلاموں کو آزاد کرنے کی تاکید کی گئی ہے چنانچہ امام صادق ؑ کی دو حدیثوں میں بیان ہوا ہے:

یستحب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الصدقۃ۔

مرد کے لئے مستحب ہے کہ وہ عرفہ کے روز عصر کے وقت غلام کو آزاد کرکے اور صدقہ دے کخدا کا تقرب حاصل کرے۔ مذکورہ بیانات سے امام زین العابدین ؑ کے اس بیان کے معانی اور زیادہ واضح ہوجاتے ہیں جو آپ نے غلاموں کے بارے میں صادر فرمایا ہے کہ ان کے حقوق کی رعایت کرو کیونکہ وہ خدا کی مخلوق ہیں نہ کہ تمہاری بنابرایں ان پر ظلم وستم روا نہ رکھو، ان کے ساتھ اسی طرح نرمی سے پیش آؤجس طرح رسول ؐ اور ائمہ ؑ ان کے ساتھ پیش آئے تھے۔

عزیزوں کاحق

ماں کاحق:

تمہارے اوپر تمہاری ماں کا حق یہہے کہ تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہیں ایک مدت تک (پیٹ میں ) اس طرح اٹھائے رہی کہ اِس طح کوئی کسی کو نہیں اٹھاتا ہے (یعنی نو ماں تک تمہارے حمل کو اپنے شکم میں رکھا) اور اپنے میوۂ دل دودھ سے تمہیں خوراک دی کہ اس طرح کوئی کسی کو خوراک نہیں دیتا ہے اپنے کان آنکھ ہاتھ پیر بال کھال سے تمہیں خوراک دی کہ اس طرح کوئی کسی کو نہیں دیتا ہے۔ اپنے کان، آنکھ، ہاتھ، پیر، بال، کھال بلکہ اپنے تمام اعضاء وجوارح کے ساتھ خوشی خوشی تمہارا بوجھ اٹھائے پھرتی رہی۔ اگرچہ اس کی وجہ سے مسلسل زحمتوں اور تکلیفوں اور مشکلوں میں مبتلارہی، یہاں تک دست قدرت نے تمہیں اس سے جدا کردیا اور تمہیں زمین پر اتار دیا تو اس نے تمہیں شکم سیر کیا خود بھوکی رہی، تمہیں لباس پہنایا خود عریاں رہی، تمہیں سیراب کیا خود پیاسی رہی، خود دھوپ کی شدت میں رہی تمہیں سایہ میں رکھا اس کی بے چینیوں میں تم نے آرام پایا خود بیدا ہی تمہیں سلایا اس کا پیٹ تمہارا مسکن، اس کا گھر تمہاری حفاظت کا محل تھا اس کے پستان تمہاے دودھ پینے کے لئے چشمہ اور اس کا نفس تمہارا نگہبان تھا تمہارے لئے اس نے سردی و گرمی کو برداشت کیا اس کی ان زحمتوں اور تکلیفوں کا شکریہ ادا کرو لیکن تم خدا کی مددوتوفیق کے بغیراپنی ماں کا شکریہ ادا نہیں کرسکتے۔

لفظ ام یعنی جڑ، بنیاد، ستون حدیث میں بیان ہوا ہے:شراب سے پرہیز کرو کہ یہ ام الخبائث ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ام مشترک معنوی ہے اس کے جامع معنی اصل او ر پایہ ہی ہیں۔ لیکن حقیقی ماں کے معنی میں یہ اتنی شہرت پاچکا ہے کہ اب یہ وہم ہونے لگا کہ اس کے حقیقی معنی ماں ہی ہیں اور دوسرے معنی میں مجازاً استعمال ہوتا ہے۔

قرآن میں لفظ ام کا استعمال

۱۔ حقیقی ماں،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم نے موسیٰ کی والدہ پر وحی کی کہ ان کو دودھ پلادو۔

۲۔ اصل اور پایہ وستون، مثلاً ام الکتاب،۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خدا وہ ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے اس کی بعض آیتیں محکمات ہیں اور وہ اس کتاب کی بنیاد و اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں، محکمات اور واضح المعنی آیتوں کو اس لئے ام الکتاب کہا جاتا ہے وہی کتاب بنیاد ہیں او متشابہ انھیں کے ذریعہ واضح ہوتی ہیں۔

۳۔ کسی چیز کا مرکز، مثلا ام القریٰ مکہ مکرمہ کو کہا گیا ہے :۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں کہ وہ حجاز کی آبادیوں کا مرکز تھا۔ راغب اور دوسرے صاحبان لغت نے لکھا ہے: مکہ اس لئے ام القریٰ ہے کہ وہیں سے زمین بچھائی گئی ہے روایات کی رو سے مکہ مکرمہ اولین خشک زمین اور پہلا خشک خطہ ہے۔

قرآن مجید میں رسول ؐ کی ازواج کو مومنین کی ماں قرار دیا گیا ہے؟ النبی۔۔۔۔۔رسول مومنوں کے نفسوں پر خود ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

مذکورہ تینوں معنی، حقیقی ماں، اصل و بنیاد اور مرکز کو ملاحظہ کرنے سے تینوں کا ارتباط وتناسب واضح ہوجاتا ہے۔ ماں : جڑ دار درخت کی اور اولاد اس کی شاخ کی مانند ہے،جتنی جڑ تروتازہ ہوگی اسی لحاظ سے اس کی شاخ تروتازہ ہوگی، والدہ کی شرافت و نجابت اولاد سے عیاں ہوتی ہے۔

ماں کا مشقت اٹھانا

امام زین العابدین ؑ حمل کے زمانہ سے ماں کے حقوق کو موضوع بحث قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں : ماں، تمہیں اتنی مدت تک اٹھائیے رہی کہ اتنی مدت تک کوئی کسی کو نہیں اٹھاتا ہے یہی چیز قرآن مجید کے دو، سوروں میں پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئی ہے سورۂ احقاف میں ارشاد ہے:

ووصینا الانسان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔من المسلمین۔

اور ہم نے انسان کویہ وصیت کردی ہے کہ اپنے ماں، باپ کے ساتھ نیکی کرے۔ اس کی ماں رنج و تکلیف کے ساتھ اس سے حاملہ ہوئی اور رنج و کلفت کے ساتھ اسے پیدا کیا اور اس کے حمل و دود ھ بڑھائی کی مدت تیس (دوسال چھ) ماں ہے یہاں تک کہ جب وہ چالیس سال کا ہوگیا تو کہنے لگا :میرے پروردگار مجھے توفیق عطا کر کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں کہ جو تونے مجھے اور میرے والدین کو عطا کی ہیں اور میں نیک وصالح عمل کرو ں جس سے تو مجھ سے خوش ہوجائے اور میری اولاد کو صالح و نیک کردار بنا دے میں تیری طرف پلٹ رہا ہوں او میں مسلمان و تسلیم شدہ ہوں۔

سورۂ لقمان میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وصینا الانسان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الی المصیر۔

ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں وصیت کردی ہے: اس کی ماں نے ان زحمتوں کے ساتھ اس کے حمل کو رکھا۔ اور اس کی شیرخوارگی کا زمانہ دوسال ہے اور اسے ہم نے یہ وصیت بھی کردی ہے کہ وہ میرا اور اپنے والدین کا شکریہ ادا کرے کہ تم سب کو میری ہی طرف آنا ہے۔

دودھ پلانے کازمانہ ماں کے لئے سختی اور مشقت کا زمانہ ہے۔ انعقاد نطفہ کے وقت سے ماں کی حالت دیگر گوں رہتی ہے یکے بعد دیگرے اس پر تکلیفیں پڑتی رہتی ہیں، یہ بے آرامی اور مشکلیں کیوں پیش آتی ہیں ؟ ڈاکٹر کہتے ہیں : یہ اس لئے پیش آتی ہیں کہ ماں اپنے بدن کی انرجی بچہ کو دیتی ہے۔

ماں حمل کے دوران

جیسے جیسے جنین بڑھتا ہے اسی لحاظ سے وہ ماں سے زیادہ طاقت و قوت کو حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ ماں کی ہڈیوں اور اس کے اعصاب کو متاثر کرتا ہے بعض دفعہ وہ سونے اور کھانے سے بھی محروم ہو جاتی ہے حمل کے آخری زمانہ میں تو اس کے لئے چلنا اوراٹھنا، بیٹھنا بھی دشوار ہوجاتا ہے،لیکن و ہ عنقریب پیدا ہونے والے بچہ کی محبت و عشق کی وجہ سے ساری زحمتوں کو برداشت کرلیتی ہے۔

وضع حمل، پیدائش کا وقت ماں کے لئے سخت تین وقت ہوتا ہے یہاں تک کہ کبھی وہ بچہ کے لئے اپنی جان تک دیدیتی ہے، اس زمانہ میں اس کے سپرد بڑی امانت ہوتیغ ہے ایک مسافر اس کے ذمہ ہوتا ہے کہ جس کو منزل مقصودتک پہنچانا ہے لہٰذا اس زمانہ میں ماں و اس امانت کی حفاظت کے لئے تمام اقدامات کرنا چاہئیں، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور کھانے، پینے میں حفظان صحت کے اصول کی رعایت کرنا چاہیے۔

وہ جس مسافر کو اٹھائے ہوئے ہے اس کے سفر کی مدت دوچار ماں نہیں ہے بلکہ نو مہینے ہیں، جس طرح مسافر سوار ہوتے ہی منزل مقصود پر نہیں پہنچتا ہے یا دس بارہ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے سے منزل پر نہیں پہنچتا ہے بلکہ اس وقت اس کا منزل پر پہنچنا تسلیم کیا جاتا ہے کہ جب وہ سلامتی و حفاظت کے ساتھ منزل مقصود پر اتر جاتا ہے، ماں کا مسافر بھی ہر لحظہ خطرہ سے دوچار رہتا ہے اور اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے لہٰذا جب وہ پیدا ہوجاتا ہے تو ماں آرام کی سانس لیتی ہے کہ اس نے مسافر کو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ جنین کے اندر چار ماں دس دن کے بعد روح پڑ جاتی ہے۔ وہ ماں کے پیٹ میں حرکت کرتا ہے تو ماں کو شدید درد محسوس ہوتا ہے لیکن تھوڑی ہی دی کے بعد وہ خدا کا شکر ادا کرتی ہے کہ الحمد للہ میرا بچہ زندہ ہے اور خدا نے اپنی پیدا کی ہوئی روح اس میں ڈال دی ہے۔

اس طویل و سخت مدت کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ اسے پے در پے کمزور کرتا ہے، پھر دوسرا سخت زمانہ شروع ہوتا ہے اور وہ ہے دودھ پلانے اور ات دن اس کی حفاظت کرنے کا زمانہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں ماں کو بچہ کی ساری ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، یہ زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بچہ بول نہیں سکتا وہ اپنے لئے مناسب جگہ کا انتخاب نہیں کرسکتا وہ رو سکتا ہے لیکن کچھ نہیں کرسکتا اس کے رونے ہی سے ماں اس کی ہر ضرورت کو سمجھ لیتی ہے اس زمانہ میں سخت ترین کام بچہ کو صاف، ستھرا رکھنا ہے، اس زمانہ میں بچہ کو جو بیماریاں لگ سکتی ہیں، ماں ان کا مقابلہ نہایت ہی صبر وشکیبائی کے ساتھ کرتی ہے۔

دودھ پلانے کا زمانہ

قرآن کی رو سے دودھ پلانے کا زمانہ پورے دو سال ہے چنانچہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: والوالدات۔۔۔۔۔۔۔الرضاعۃ۔

مائیں اپنے بچوں کو پوریدو سال دودھ پلائیں گی جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتی ہیں۔

سورۂ احقاف کی آیت میں حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماں بیان ہوئی ہے ’’ وحملہ۔۔۔۔۔۔‘‘

دو سال کو تیس ماہ سے کم کردیا جائے تو حمل کی مدت چھ ماں بچتی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ حمل کی مدت چھ ماں ہو؟ فقہا اور مفسرین نے اسلامی روایات کے مطالعہ کی روشنی میں یہ کہا ہے کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے۔ اور دودھ پلانے کی مدت زیادہ سے زیادہ ۲۴ ماہ ہے۔ ’’ جالینوس اور ابن سینا کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے کہا: انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بچے چھ ماہ کے حمل سے پیدا ہوا۔

قرآن مجیدکی آیت کے اس ٹکڑے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حمل کی مدت جتنی کم ہوگئی دودھ پلانے کی مدت میں اتنا ہی اضافہ کردیا جائے گا کہ جس سے حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہو جائے اگر وضع حمل چھ ماہ میں ہوا ہے تو چوبیس ماہ دودھ پلائے۔

فطرت بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ حمل کے زمانہ کی کمی کو دودھ پینے کی مدت میں پورا کیا جائے چنانچہ اسی آیت میں ’’ وفصالہ عامین‘‘ ہے اور دوسری آیت میں ’’ حولین کاملین ‘‘ ہے۔

بہر حال مائیں اس ۳۰ ماہ (حمل اور دودھ پلانے ) کی مدت میں روحی و جسمی فدا کاری سے اپنے بچہ کی خدمت کرتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید شروع میں ماں اور باپ دونوں کے لئے وصیت کرتا ہے لیکن جب تکلیفیں اور خدمتیں بیان کرتا ہے تو صرف ماں کی تکلیفیں بیان کرتا ہے تاکہ انسان کو اس کی فدا کاری اور ماں کے عظیم حق سے آشنا کیا جاسکے۔ پھر فرماتا ہے میں نے انسان کو وصیت کردی ہے : ’’ ان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ میرا بھی شکر ادا کرو اور ماں باپ کا بھی شکر ادا کرو میرا شکر اس لئے ادا کرو کہ میں تمہارا خالق اور تمہیں نعمت دینے والا ہوں اور ماں باپ کا شکریہ اس لئے ادا کرو وہ تم تک میری نعمت پہنچانے کا وسیلہ ہیں۔

بچہ کی ساخت میں ماں کا حصہ

سورۂ احقاف وسورۂ لقمان میں وصینا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کے ذریعہ انسان کو ماں باپ کے بارے میں وصیت کی گئی ہے بچہ پر دونوں کا حق ہے لیکن دونوں میں سے کس کا حق زیادہ ہیں ؟ اس سلسلہ میں قرآن کی آیتوں نے حمل اور دودھ پلانے کے زمانہ کی زحمتوں کے لحاظ سے ماں کو زیادہ حصہ دیا ہے۔

جب رحم میں نطفہ قرار پاتا ہے اوربچہ کے اولین خلیے وجود میں آتے ہیں تو ان میں ماں اور باپ دونوں مساوی طور پر شریک ہوتے ہیں اور بچہ میں دونوں کا حصہ برابر ہوتا ہے لیکن حمل کے دوران اور رحم میں بچہ کو غذا رسانی اور بچہ کے بدن کی ساخت میں ماں کا زیادہ حصہ ہوتا ہے۔

الکسیس کارل لکھتا ہے:

ان اولین خلیوں میں کہ جن سے بعد میں سارے خلیے وجود پذیر ہونگے ان میں ماں، باپ ایک حد تک دونوں ہی شریک ہیں لیکن ماں، نصف خلیوں کی شریک ہونے کے علاوہ اس مرکزی خلیہ کے اطراف میں پروٹو پلاسم، مادۂ اولی کو بھی پُر کرتی ہے اس طرح بچہ کے وجود میں لانے میں اس کا فریضہ باپ سے زیادہ اہم ہے تولید مثل میں باپ کا فریضہ بہت مختصر ہے لیکن عورت کا فرض تقریبا نو ماہ میں پورا ہوتا ہے اس مدت میں بچہ ماں کے خون سے غذا حاصل کرتا ہے۔

جنین پر ماں کے حالات کا اثر

ماں کے جسمانی حالات اور اس کی غذا و خوراک کے آثار بچہ پر مترتب ہوتے ہیں اسی طرح ماں کے اخلاق و خیالات بھی بچہ پر اثر انداز ہوتے ہیں، اگر کوئی ماں حمل کے زمانہ میں بہت زیادہ ڈرتی ہے اور اس حالت سے اس کے بدن پر نفسیاتی اثر ہوتا ہے مثلاً چہرہ کے رنگ کا فقہ ہوجانا تو اس سے بچہ کو بھی شدید صدمہ پہنچتا ہے۔

’’ اعجاز خوراکیھا نامی کتاب میں مرقوم ہے:

اگر حمل کے زمانہ میں کوئی عورت اتنی ڈرتی ہے کہ اس کا رنگ بدل جاتا ہے اور وہ کانپنے لگتی ہے تو اس کے نوزاد کے بدن پ ایک قسم کے داغ پڑ جاتے ہیں، جنھیں چاند گہن کا اثر کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ماں کا غم و غصہ، غیظ و غضب، بدبینی، بد خواہی، کینہ توزی اور حسد بلکہ اس کے سارے پسندیدہ اور برے صفات بچہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

دودھ پلانے کا زمانہ قرآن کی نظر میں

’’ والدہ ‘‘ لغت عرب میں ماں ہی کو کہتے ہیں، لیکن ’’ ام ‘‘ کے معنی اس سے زیادہ وسیع ہیں، کبھی ماں کو اور کبھی ماں کی ماں اور کبھی ہر چیز کی اساس و بنیاد کو ام کہا جاتا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے ان آیتوں میں قرآن نے بچہ کو دودھ پلانے، ماں، باپ اور اولاد کے مختلف دستورات اور گونا گوں حقوق بیان کئے ہیں :

۱۔دو سال دودھ پلانا ماں کا مخصوص حق ہے اس زمانہ میں وہی بچہ کی حفاظت کرتی ہے، اگرچہ چھوٹے بچہ کا ولی باپ ہی ہوتاہے، چونکہ اس مدت میں وہ دودھ اور عواطف کے ذیعہ بچہ کو غذا دیتی ہے اور بچہ کو اس سے جدا نہیں کیا جاسکتا لہٰذا اس کی حفاظت و سرپرستی بھی اسی کے ذمہ ہوتی ہے۔ بنابرایں حضانت و پرورش کا حق بھی ماں ہی سے مخصوص ہے۔ ’’ والوالدات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ‘‘ مائیں پورے دو سال تک بچہ کو دودھ پلائیں گی۔

۲۔کیا بچہ کو دودھ پلانے کی لازمی و حتمی مدت دو سال ہے ؟ نہیں بلکہ یہ مدت اس کے لئے جو اس مدت کو پورا کرنا چاہتی ہے ’’ لمن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ لیکن ماؤں کو یہ حق ہے کہ وہ بچوں کی صحت و سلامتی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مدت کو کم کرسکتی ہیں۔

۳۔بچہ کو دودھ پلانے کے زمانہ میں عورت کا نفقہ بچہ کے باپ کے ذمہ ہے یہاد تک کہ طلاق لینے کی صورت میں بھی تاکہ ماں فارغ البال ہو کر بچہ کو دودھ پلائے ’’ وعلی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ ان کا روٹی کپڑا بچہ کے باپ کے ذمہ ہے۔

۴۔ ماں باپ میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بچہ کے فائدہ کو اپنے اختلافات پر قربان کرے اور بچہ کے نفسیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائے ’’ لا تضار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ مردوں کو چاہیے کہ وہ دودھ پلانے کے زمانے میں ماں سے بچہ کو لے کر اسے نقصان نہ پہنچائیں اور عورتوں کو چاہیے کہ یہ جو حق ان کو دیا گیا ہے اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔

۵۔ اگر باپ کا انتقال ہوجائے تو وارثوں کو چاہیے کہ دودھ پلانے کے زمانہ میں وہ بچہ کی ماں کے اخراجات پورا کریں ’’ وعلی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘

۶۔ بچہ کی دودھ بڑھائی کا حق ماں باپ کو دیا گیا ہے، اگرچہ پہلے جملہ میں دودھ پلانے کی مدت کا تعین ہوچکا ہے۔ لیکن ماں باپ بچہ کے جسمانی حالات کے پیش نظر ایک دوسرے کے توافق سے بچہ کو دودھ چھڑا سکتے ہیں۔

فان اراد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔علیھما۔

۷۔ ماں کے دودھ پلانے اور اس کی دیکھ بھال کے حق سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی مگر یہ کہ ماں ہی دودھ نہ پلائے یا وہ کسی وجہ سے دودھ نہ پلا سکے اس صورت میں ارشاد ہے: ’’ لا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ آپ اپنا بچہ کسی دائی کو دے سکتے ہیں کہ وہ اسے دودھ پلائے اور اس کی پرورش کرے یا اس کی ماں کا بار ہلکا کرنے کے لئے اسے دائی کے سپرد کرسکتے ہیں کہ وہ اسے صرف دودھ پلائے۔

قرآن کہتا ہے : دودھ پلانا ماں کا حق ہے جو خدا نے ایک فریضہ کے عنوان سے اس کے ذمہ کیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ماں کے بدن کے اندر یہ دودھ کس طرح بنتا ہے۔

دودھ کیسے بنتا ہے:

ان لکم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔للشاربین۔

بیشک چوپایوں میں تمہارے لئے عبرت ہے ہم تمہیں ان کے پیٹ سے، گوبر و خون کے درمیان سے نکال کر خالص دودھ پلاتے ہیں جو کہ پینے والوں کے لئے لذیذ ہوتا ہے۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دودھ، ہضم شدہ کھانے اور خون سے نکلتا ہے اسی چیز کو آج فزیالوجی نے ثابت کیا ہے کہ جب کھانا ہضم ہوجاتا ہے تو معدے کے اندر بڑی سطح پر ہزاروں رگیں اس سے مفید اور ضروری عناصر جذب کرتی ہیں اور اس درخت تک پہنچا دیتی ہیں جس کی نوکتھنوں کی نوک تک پہنچتی ہے ماں کھانا کھاتی ہے، اس کا نچوڑ خون میں داخل ہوتا ہے اور خون سے بچہ بنتا ہے اورجب تک بچہ ماں کے شکم میں ر ہتاہے اسے ناف کے ذریعہ سے غذا پہنچتی ہے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ناف کاٹی جاتی ہے اب اسے خون کے ذریعہ غذا نہیں ملے گی، اب غذا پہنچانے والے قطب کی سوئی ماں کے سینہ کی طرف حرکت کرتی ہے اور پستا ن کی نوک ہوجاتی ہے اب ریفائنری خون و گوبر کے دمیان سے ایک نئی سیال چیز نکالتی ہے جس کو دودھ کہتے ہیں یہ بچہ کے نرم و نازک بدن کے لئے سازگار ہے دودھ خون وفرث کے درمیان سے نکلتا ہے، نہ خون کا تصفیہ ہوا ہے اور نہ غذا ہضم ہوتی ہے۔ پہلے سے آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرے تک پہنچتا ہے پستان دودھ کا پروٹین موادہ بنانے کے لئے بدن کے ذخیرہ کردہ اسید سے استفادہ کرتا ہے۔

دودھ میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں سے بعض خون میں نہیں ہوتی ہیں، وہ پستان کے غدود سے بنتی ہیں جیسے کازوئین بعض چیزیں براہ راست خون سے ترشح کے ذریعہ دودھ میں پہنچتی ہیں جیسے وٹامن، نمک، سلفیٹ اورشکر جیسا مواد خون میں موجود شکر سے لیا جاتاہے اس میں پستان رد بدل کرتے ہیں اور اس کو موثر چیز میں تبدیل کرتے ہیں۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ دودھ، غذائی مواد کے جذب ہونے کے نتیجہ میں خون کے ذریعہ بنتا ہ یاور خون کا ارتباط براہ راست پستان کے غدود سے ہے لیکن نہ دودھ میں فرث کی بو آتی ہے نہ اس کا رنگ آتا ہے سائنس داں کہتے ہیں : پستان میں ایک لیٹر دودھ بننے کے لئے اس عضو سے کم سے کم پانچ سو لیٹر خون گزرنا چاہیے تاکہ وہ ایک لیٹر دودھ کے لئے خون سے ضروری مواد کو اخذ کرسکے اور رگوں میں ایک لیٹر خون پیدا ہونے کے لئے کافی غذا درکار ہوتی ہے، یہاں ’’ من۔۔۔۔۔۔۔ کا مفہوم بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔

دودھ میں، سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم، مینزیم، روی، لوہا، اسی طرح فاسفور، کلر وغیرہ اور آکسیجن آکسائیڈ کاربن بھی دودھ میں پائی جاتی ہے، دودھ میں شکر بھی ہوتی ہے۔ دودھ میں وٹامن بی، پی، اے اور وٹامن ڈی بھی ہوتی ہے رسول ؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:لیس۔۔۔۔۔۔۔کھانے اور اپنی کی کمی کو صرف دودھ پورا کرتا ہے۔

دودھ طاقتور ترین چیز

دودھ، ایسی خالص ولذیذ غذا ہے جو ہر سن وسال کے انسان کے لئے بچپنے سے ضعیفی تک مفید اور سازگار ہے یہی وجہ ہے کہ بیماروں کے لئے دودھ تجویز کیاجاتا ہے، ہڈیوں کو مضبوطی کے لئے دودھ نہایت ہی مفید ہے چنانچہ ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو اس کے لئے دودھ بتایا جاتا ہے۔

خلوص کے ایک معنی پیوند اور جوڑنے کے ہیں شاید قرآن نے انھیں معنی کے پیش نظر، دودھ کو ’’ لبنا خالصا‘‘ کہا ہے کہ ہڈی جوڑنے میں اس کا اہم اثر ہوتا ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ رضاعت (دودھ پلائی ) کے اسلامی احکام میں بھی یہ معنی پوری وضاحت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو ہمیں فقہا یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں :

اگر کوئی بچہ کسی ماں کا اتنا دودھ پیتا ہے کہ جس سے ہڈی مضبوط ہوجائے اور گوشت بن جائے تو یہ بچہ اس کا محرم ہے دوسری طرف یہ کہتے ہیں :

پندرہ بار یہاں تک کہ ایک رات دن میں پے درپے دودھ پینے سے بچہ محرم بن جاتا ہے۔ اگر ہم ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھیں تو کیا ان کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ ایک ات دن دودھ پینے سے ہڈی مضبوط اور بدن فربہ ہوتا ہے؟

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلامی دستورات میں دودھ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے یہاں تک کہ فقہی کتابوں میں تحریر ہے:بچہ کی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے اسی وجہ سے بچہ کو دودھ پلانے کو واجبات میں قرار دیا گیاہے۔

شاید اسی وجہ سے کہ سورۂ قصص کی ساتویں آیت میں حضرت موسیٰ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

واوحینا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور ہم نے موسیٰ کی ماں پروحی کر دی تھی کہ موسیٰ کو دودھ پلادو اور جب تمہیں ان کے بارے میں کوئی خوف ہوتو انھیں دریا میں چھوڑ دو۔

ماں کی بہت سی خصلتیں اور عادتیں دودھ کے ذریعہ بچہ میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ حضرت علی ؑ نے محمد حنفیہ کی کمر پر مارا اور فرمایا: ’’ ادرکک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ یہ ڈرنے والی رگ تم نے اپنی ماں سے ورثہ میں پائی ہے۔ شیر خوارگی کے زمانہ میں رسول ؐ نے صرف جناب حلیمہ سعدیہ ہی کا دودھ قبول کیا تھا دوسری عورتوں کا دودھ نہیں پیا تھا۔

ماں ہمہ تن بچہ کی خدمت میں :

ماں بچہ کی پیدائش ہی سے تمام وقت اس کی خدمت میں گزارتی ہے اگر کبھی ماں لمحہ بھر کے لئے بھی اس سے غافل ہوجائے تو اس کی جان کے لالے پڑ جائیں رات دن اس کی نگہداشت کی وجہ سے ماں کا آرام و چین چھن جاتا ہے لیکن مادری محبت وسرشت کی وجہ سے یہ ساری تلخیاں اس کے لئے شہد جیسی شیریں بن جاتی ہیں اس چیز کو امام زین العابدین ؑ نے ’’ مستبشرۃ بذالک‘‘ کے جملہ میں بیان فرمایاہے۔

ماں کی محبت

محبت، انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے، انسان کے ساتھ ساتھ محبت طلبی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ کھانے، پانی کے بعد انسان کو محبت کی ضرورت ہوتی ہے ماہرین نفسیات نے محبت کو شدید ترین روحی ہیجان قرار دیا ہے۔ صرف بچپنے میں ہی انسان کو محبت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ عمر کے ہر موڑ پر کسی ناکسی صورت میں انسان کو محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

محبت طلبی اورشفقت جوئی کے جلوہ کو بچوں کے اندر دیکھا جاسکتا ہے چنانچہ اگر ان سے محبت میں کمی آجاتی ہے تو وہ ماں باپ سے لپٹ جاتے ہیں اور اگر کسی بچہ سے زیادہ محبت ہوجاتی ہے تودوسرے بچے اس سے حسد کرنے لگتے ہیں بڑی عورتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سو تن سے گلہ مند رہتی ہیں اور جوان دلوں کو موہ لینا چاہتے ہیں یا ان پراپنا قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔

بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ بچوں کو ایک خاص ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت ماں کے بدن کی گرمی و حرارت، اس کی لوریوں ار اس کے پیار و محبت سے پوری ہوتی ہے اور اگر اس کی اس ضرورت کو پورا نہ کیا جائے توا س کا اس کے جسم و روح پر بہت برا اثر ہوگا۔ ایک مشہور انسان شناس اس میں نظریہ سے متاثر تھا وہ اپنی تقریر میں کہتا تھا:

نو زاد بچوں کو پیدائش کے بعد ان کی ماؤں کے پہلو میں لٹایا جائے انھیں پرورش گاہ میں نہیں بھیجنا چاہیے کیونکہ پرورش گاہ میں ان کو ماں کے بدن کی گرمی و حرارت نہیں ملے گی جس کی ان کوضرورت ہوتی ہے۔

بعض ماہرین نفسیات تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ماں بعض وجوہ کی بنا پر بچہ کے پاس نہ رہ سکے تو دوسری عورت کو چاہیے کہ وہ بچہ کی اس ضرورت کو پورا کرے انھیں اسباب کی بنا پر پرورش گاہ بنائی گئیں ہیں۔

کیا نوزاد ماں کی محبت و حرارت کے فقدان کا احساس کرتا ہے؟

نوزاد اس زمانہ میں بول نہیں سکتا بنا برایں اس سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے کچھ تجربہ گاہ بنائی گئیں لیبارٹی وجود میں آئی اور وہاں بندر کے بچوں کے لئے ایک مصنوعی ماں بنائی گئی اور اسے ان کے پاس رکھ دیا گیا تو بندر کے بچے اس بناؤٹی ماں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے تھے جیسے بچہ حقیقی ماں کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔ بندر کے بچوں نے لکڑی اور اسفنج وغیرہ سے بنی ہوئی ماں کو حقیقی ماں کا جانشین سمجھا لیا تھا۔ واضح رہے یہ کاٹھ کی ماں جو حقیقی ماں کی جانشین تھی بندر کے بچوں کو دودھ پلاتی تھی لیکن اس میں اس کے بدن جیسی گرمی و حرارت نہیں تھی وہ انھیں گود میں نہیں لے سکتی تھی اسے پیٹھ پر سوار نہیں کرسکتی تھی۔

اس تجربہ گاہ میں یہ دیکھا گیا کہ جب بندر کے بچہ کو کوئی تکلیف و خوف محسوس ہوتا تھا تو وہ اس کاٹھ کی ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ کیا اس تجربہ اور تحقیق سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بندر اور انسان کے بچہ کو اپنی ماں کے بدن کی گرمی کی ضرورت ہے؟

ماں کی فدا کاری

ماں بچہ کے وجود کو اپنے وجود پر مقدم کرتی ہے اور کبھی بچہ پ قربان ہوجاتی ہے، وہ اپنی آنکھ میں پڑنے والے خار کی تکلیف برداشت کرلیتی ہے لیکن بچہ کے رونے کو برداشت نہیں کرتی ہے۔ امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں :وہ اسے سیراب کرتی ہے خود پیاسی رہتی ہے اسے کپڑا اڑھاتی ہے خواہ خود کو نہ چھپا سکے۔

ماں کوبچہ سے دو طرح کی محبت ہوتی ہے، ایک حسی دوسرے قلی و ادراکی، ماں کی حسی محبت تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے کہ وہ بچہ کی آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو کو نہیں دیکھ سکتی اس کے رونے کی آواز کو نہیں سن سکتی، عقلی محبت یہ ہے کہ جب اس کا بچہ بیمار ہوجاتا ہے تو وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے اور ضوت کے وقت اسے آپریشن کے لئے ڈاکٹر کے سپرد کردیتی ہے وہ اس کا آپریشن کرتا ہ ے، باوجودیکہ ماں آنسو بہا رہی ہے لیکن برداشت کرتی ہے، اگر ہم اس سے معلوم کریں تم نے اپنا بچہ ڈاکٹر کے حوالے کیوں کردیا؟ تو وہ جواب دے گی چونکہ مجھے اس کی سلامتی وصحت سے محبت ہے لہٰذا میں اس کے بڑے فائدہ کے لیے اس مختصر تکلیف کو برداشت کررہی ہوں۔ اور وہ فائدہ بچہ کی سلامتی اور صحت ہے جو کہ میرا اصل مقصد ہے۔

جنت، ماں کے پاؤں کے نیچے

ماں کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جنت، ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔ جب کہ دوسری جگہ یہ فرمایا ہے کہ جنت ان مجاہدوں کی تلواروں کے نیچے ہے جو راہ حق میں جہاد کرتے ہیں ماں کے حق کے سلسلہ میں رسولؐ سے جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں سے کچھ دج ذیل ہیں :

قال رسول اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بابیک۔

موسیٰ بن عمران نے تین بار خدا سے التجا کی کہ مجھے نصیحت فرمائیے! ہر دفع یہی ندا آئی میں تمہیں اپنے بارے میں تاکید ونصیحت کرتا ہوں پھر عرض کی پھر ! ارشاد ہوا تمہارے والد کے بارے میں پھر عرض کی : اس کے بعد فرمایا:میں تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں تاکید کرتا ہوں، میں تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں تاکید کرتا ہوں میں تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں تاکید کرتا ہوں۔

جائ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قال: اباک

ایک شخص رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی! اے اللہ کے رسولؐ میں کس کے ساتھ نیکی کروں ؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ عرض کی پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ۔ عرض کی : پھر کس کے ساتھ ؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ۔ اس کے بعد عرض کی : پھر کس کے ساتھ ؟ فرمایا: اپنے والد کے ساتھ۔

مذکورہ دونوں روایتوں سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ ماں کا حق زیادہ ہے یا باپ کا؟

جواب یہ ہے کہ ماں کے تین حصے ہیں اور باپ کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ ماں، حمل، دودھ پلانے اور پروان چڑھانے کے زمانہ میں زحمت اٹھاتی ہے اگرچہ باپ، ماں اور بچے دونوں کا خرچ برداشت کرتا ہے اور اس کی زندگی کی ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے،لیکن وہ لمحہ بھر میں بچہ کو ماں کے حوالہ کرکے الگ ہوجاتا ہے اس کے بعد اسے ماں ہی پروان چڑھاتی ہے۔

ماں کی خدمت یا جنگ کا محاذ؟

جاء۔۔۔۔۔۔۔۔۔فی الجھاد۔

ایک جوان جو کہ جہاد پر جاناچاہتا تھا اور اس کی ماں اسے منع کرتی تھی اپنی والدہ کے ساتھ ر سول ؐکی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسولؐ نے فرمایا: تم اپنی ماں کی خدمت میں رہو۔ تمہارا وہی ثواب ہے جوجہاد کرنے والوں کا ہے۔

باپ کا حق

تمہارے اوپر تمہارے باپ کا حق یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہاری اصل وبنیاد ہے اور تم اس کی شاخ وفرع ہو اگر وہ نہ ہوتے تو تمہارا وجود نہ ہوتا پس جب تم اپنے اندر کوئی ایسی چیز دیکھو کہ جو تمہیں خود پسندی میں مبتلا کردے تو اس وقت تم یہ خیال کروکہ اس نعمت کا سبب تمہارا باپ ہے اور اس پر خدا کا شکر وثنا کرو اور خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

باپ اصل اور بیٹا فرع

حضرت امام زین العابدین ؑ اس حق کے پہلے جملہ میں ایک علمی وفلسفی اصل کی طرف اشارہفرماتے ہیں اور وہ اصل یہ ہے کہ معلول علت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر علت نہ ہوتو معلول بھی نہیں ہوگا بلکہ معلول کا وجود ایک غیر مستقل وجود ہے یہ اصل ساری مادی دنیا میں کارفرما ہے۔ امام زین العابدین ؑ باپ کی عظمت کو اولاد کے گوش گزار کررہے ہیں اور واضح لفظوں میں فرماتے ہیں : باپ اصل ہے اور اولاد فرع ہے اگر اصل نہ ہوتو فرع وشاخ کا وجود بھی نہیں ہوگا۔ پس اولاد میں جو صفت بھی پیدا ہوتی ہے وہ اپنی اصل کی غماز ہوتی ہے۔

ایک دوسرا موضوع جس کی طرف امام زین العابدین ؑ اشاہ فرماتے ہیں یہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اور کمال کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو ممکن ہے اس وقت باپ کی مادی ترقی موقوف ہوگئی ہو یاعنقریب موقوف ہوجائے گی۔ اس مادی حرکت میں باپ روبزوال ہے اور بیٹا روبہ کمال۔ باپ دن بدن کمزوری اورناتوانی محسوس کرتا ہے اوربیٹا، طاقت، تازگی و فرحت محسوس کرتا ہے اور خود کو باپ سے زیادہ قوی سمجھتا ہے ممکن ہے یہاں اسے غرور ہوجائے اور خود کو باپ سے برتر و بلند سمجھنے لگے اور باپ کے احترام کے فریضہ کو پورا نہ کرے۔

امام زین العابدین ؑ بیٹے کو یہ بات سمجھاتے ہیں جب تمہارے اندر کوئی ایسا احساس بیدار ہو اور خدانخواستہ تم خود پسندی میں مبتلا ہوجاؤ تو اس وقت تم یہ سوچنا کہ تمہارا جو بھی کمال و ہنر ہے اس کا سبب تمہارا باپ ہے تمہارا اپنا کچھ بھی نہیں ہے، اگر تم نے یہ بات سوچ لی تو تم عجب و خود پسندی سے نجات پا جاؤ گے۔

اس حق میں امام زین العابدین ؑ نے تیسرا موضوع یہ بیان فرمایا ہے کہ نعمت کی معرفت اور تشکر کی حس بیدار کرنے کے لئے نعمت کا شکر ضروری ہے جب بچہ اس بات کی طرف متوجہ ہوگا تو اپنے فریضے کو سمجھے گا کہ اس نے خدا کے مقرر کردہ تمام فرائض کو انجام دیدیا ہے اور والدین کے عاق کرنے سے جو نقصان پہنچ سکتا تھا اس سے اس نے نجات حاصل کرلی ہے۔ آخر میں امام اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں کہ باپ کے حق کی طرف متوجہ ہونا اور اس نعمت کو پہچاننا اور اس سے متعلق فرائض کو انجام دینا صرف خدا کی توفیق ہی سے نصیب ہوتا ہے لہٰذا خدا ہی سے ان امور کی توفیق طلب کرنا چاہیے۔

ہم نے ماں کے حق کے ذیل میں سورۂ لقمان و احقاف کی دو آیتیں نقل کی ہیں ان میں انسان کو یہ وصیت کی گئی ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرے، یہاں ہمان حدیثوں کی روشنی میں باپ کے مرتبہ کو بیان کریں گے جو ان آیتوں کی تفسیر کے عنوان سے نقل ہوئی ہیں۔

احادیث میں باپ کا مرتبہ

محمد بن یحییٰ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تحبون۔

محمد بن یحییٰ نے احمد بن عیسی اور علی بن ابراہیم سے اور انھوں نے اپنے والد سے اور سب نے حسن بن محبوب سے انھوں نے ابوولادحناط سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام صادق ؑ سے اس آیت ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو کے بارے میں سوال کیا: یہ احسان کیا ہے ؟ ماں باپ کے ساتھ ان کے ساتھ رہنے اور زندگی گزارنے میں جہاں تک ہوسکے نیکی کرو اور انھیں اس چیز کے مانگنے کی زحمت نہ دو کہ جس کی ان کو ضرورت ہے۔ خواہ وہ مستغنی اور بے نیاز ہی ہوں اور قرآن مجید کی دوسری آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک تم اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہیں کروگے نیکی تک نہیں پہنچ سکو گے۔

روایت کے دوسرے ٹکڑے میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ثم قال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قدامھا۔

پھر امام صادق ؑ نے فرمایا: لیکن خداوند الم کا یہ قول: جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہوجائیں تو ان کے سامنے اف تک نہ کہو اور انھیں جھڑکو نہیں۔ یعنی اگر تمہیں ماریں تو بھی اف نہ کرو ان سے نرم لہجہ میں بات کرو اور وہ اس طرح کہ اگر وہ تمہیں مایں تو تم یہ کہو: خدا آپ دونوں کی مغفرت کرے یہی تمہارا کریم قول ہے اور انکساری سے ان کے سامنے اپنے شانوں کو جھکادو یعنی انھیں محبت و الفت کی نظر سے دیکھو اور ان کی آواز پر آواز بلند نہ کرو، اور نہ ان کے ہاتھ اٹھانے پر ہاتھ نہ اٹھاؤ اور ان کے آگے آگے نہ چلو۔ یعنی انھیں کسی بھی اعتبار سے رنج نہ پہنچاؤ۔

اصول کافی کے اسی باب کی دوسری حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ابن محبوب،من الایمان۔

ابن محبوب نے خالد بن نافع بجلی سے انھوں نے مروان سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام جعفر صادق ؑسے سنا کہ فرماتے ہیں :ایک شخص رسول ؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ ! مجھے وصیت و نصیحت کیجئے آپ نے فرمایا: خدا کا شریک نہ قرار دو خواہ تمہیں آگ میں جلا دیا جائے اور تمہیں سخت ترین سزا دی جائے لیکن تمہارا دل مطمئن ہو اور ماں باپ کی اطاعت کرو اور ان کے ساتھ نیکی کرو خواہ زندہ ہوں یا مردہ اگر وہ تمہیں اہل و مال سے دست بردار ہونے کا حکم دیں تو اس پر بھی عمل کرو کہ اس کا تعلق ایمان سے ہے۔

اس باب کی پانچویں حدیث میں رسول ؐ نے باپ کے احترام کو مدنظر رکھا ہے:

علی بن ابراہیم۔۔۔۔۔۔۔۔یستسب لہ۔

علی بن ابراہیم نے محمدبن عیسیٰ بن عبید سے انھوں نے یونس بن عبدالرحمٰن سے انھوں نے دوست بن ابی منصور سے انھوں نے امام موسیٰ کاظم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک شخص نے رسول ؐ سے دریافت کیا: بیٹے پر باپ کا کیا حق ہے؟ فرمایا: باپ کا نام نے لے راستہ چلنے میں اس پر سبقت نہ کرے اس کے سامنے نہ بیٹھے اور ایسے کام نہ کرے کہ جسسے باپ کو برا کہا جائے۔بنا برایں بیٹے کا فرض ہے کہ وہ ماں باپ کا احترام کرتا رہے۔

اس باب کی تیرہویں حدیث میں بیان ہوا ہے:

محمد بن یحییٰ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غدا۔

محمد بن یحییٰ نے چند واسطوں سے ابراہیم بن شعیب سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے حضرت امام جعفر صادق ؑ سے عرض کی: میرے والد بوڑھے ہوگئے ہیں اور اتنے کمزور ہوگئے ہیں کہ ضروریات کے لئے بھی مجھے لے جانا پڑتا ہے۔ کیا میرے لئے ایسا کام کرنا صحیح ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر تم ایسا کام کرسکتے ہو تو اسے ضرور انجام دو، اپنے ہاتھ سے انھیں کھانا کھلاؤ کہ اس کی جزا میں تمہیں قیامت میں جنت کا باغ ملے گا۔

اس حدیث کے ذریعہ امام صادقؑ اولاد کو یہ درس دینا چاہتے ہیں کہ جس طرح تم ایک دن کمزور و ناتواں تھے اور باپ تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں رفع حاجات کے لئے لے جاتا تھا اب تمہارا فریضہ ہے کہ ایسا کام کرو۔

آج تو بوڑھوں کے لئے اولڈ فالکس ہوم(Old Folks home)بنا دیئے گئے ہیں کہ جہاں وہ تنہا و بے کس، بیمارو مریض رہتے ہیں اسی طرح کچھ بوڑھے رضا کارانہ طور پر وہاں زندگی گزارتے ہیں اگرچہ یہ کام صحیح ہے لیکن یہ افسوس کی جا ہے کہ بیٹے اور پوتے ایسے اداروں کے ذریعہ ایسے مقاصد پورے کراتے ہیں جو انسانی و اخلاقی اصولوں کے منافی ہیں اور باپ دادا کو زبردستی سے گھر اور خاندان سے نکال کر اولڈ فالکس میں پہنچا دیتے ہیں ان کی اس حرکت سے انھیں دلی صدمہ ہوتا ہے اور ان کا غم و اندوہ بڑھ جاتا ہے جس سے وہ جلد مر جاتے ہیں ماں باپ کا حق اتنا عظیم ہے کہ اگر وہ مسلمان بھی نہیں ہیں تو بھی اسلام نے ان کے احترام کو ملحوظ رکھنے کی تاکید ہے اسی باب کی پندرہویں حدیث میں اس طرح ہے:علی بن ابراہیم۔۔۔۔۔۔۔ فاجرین۔

علی بن ابراہیم نے چند واسطوں سے عنسبہ بن مصعب سے اور انھوں نے امام محمدباقر ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا نے کسی کو تین چیزیں چھوڑنے کی اجازت نہیں دی ہے :امانت ادا کرنے کی خواہ نیک آدمی کی ہو یا بدکاری کی، عہد پورا کرنے کی خواہ نیک سے کیا ہو یا بد سے اور ماں باپ کے ساتھ احسان و نیکی کرنے کی خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔

جوانوں کا فریضہ

مذکورہ احادیث سے، اسلا م کا عقیدہ رکھنے والے اور رسول ؐ کی پیروی کرنے والے جوانوں کا فریضہ معین و مشخص ہوگیا، جوانوں کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے اوپر ماں باپ کا بہت بڑا حق ہے انھیں ماں باپ کا حق شناس ہونا چاہیے ان سے لاپرواہی اورناراض ہونے سے پرہیز کرنا چاہیے خواہ ماں باپ اپنے فریضہ کوبخوبی انجام نہ دیں،امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

من نظر۔۔۔۔۔۔۔۔صلوٰۃ۔

جو شخص اپنے ماں باپ کو غیظ وغضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے اگرچہ انھوں نے اپنی اولاد کے فرئض کو پورا نہ کیا ہو،تو بھی خدا اس کی نماز قبول نہیں فرماتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگرماں باپ نے بیٹے پر ظلم بھی کیا ہے تو بھی بیٹے کو اس سے چشم پوشی کرنا چاہیے۔

باپ کے قتل کا اثر

محمدبن سہیل سے منقول ہے کہ منتصر کے زمانہ ٔ خلافت میں،میں نے ایک قالین دیکھا کہ جس پر بادشاہوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور ان کے نیچے فارسی میں لکھا ہوا تھا، میں نے اس کو غور سے دیکھا تو مجھے ایک بادشاہ کی تصویرنظر آئی کہ جس کے سر پر تاج ہے اور اس کے نیچے مرقوم ہے کہ یہ ’’شیرویہ‘‘ کی تصویر ہے جس نے اپنے باپ خسروپرویز کو قتل کیا تھا۔ لیکن اپنے باپ کو قتل کرنے کے بعد یہ چھماں سے زیادہ بادشاہت نہیں کرسکا۔ پھر میں نے دوسے بادشاہوں کی تصویریں دیکھیں میری نگاہ قالین کے بائیں طرف پڑی تو ایک بادشاہ کی تصویر نظر آئی جس کے نیچے تحریر تھا کہ یہ تصویر یزید بن ولید بن عبدالملک کی ہے جس نے اپنے چچا ولید بن یزید بن عبدالملک کو قتل کیا تھا اس کی بادشاہت کی مدت بھی چھ ماں ہے پھر میں نے منتصر کی تصویر دیکھی، میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ منتصر کی حکومت بھی چھ ماں سے زیادہ ہیں ہوگی کیونکہ اس نے بھی اپنے باپ کو قتل کیا ہے۔

بنی عباسی میں سے ایک خلیفہ متوکل بھی گزرا ہے وہ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب ؑ سے بغض رکھتا تھا اگر کبھی آپ کا ذکر کرتا تو صرف ابوتراب کہتا تھا، اپنے دربار میں آپ کی شان میں گستاخی کیا کرتا تھا، منتصر عباسی اس کا بیٹا تھا جو اس کا ولی عہد تھا اور جوان تھا وہ اپنے باپ سے اس لئے نااض ہتا تھا کہ وہ حضرت علی بن ابی طالب کی شان میں گستاخی کرتا ہے کبھی تووہ کھلے لفظوں میں باپ پر اعتراض کردیتا تھا اور کبھی خاموش رہتا تھا۔ ایک روز متوکل کے دربار میں ملک کے سربرآوردہ لوگ جمع تھے کہ متوکل نے بے ادبی سے آپ کا نام لیا، منتصر کو اس بات پر غصہ آگیااور نہایت ہی تند لہجہ میں باپ پر اعتراض کیا۔ متوکل نے لوگوں کے سامنے منتصر کو سرزنش کی اور یہ شعر پڑھا:

غضب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔امہ۔

اس جوان کو دیکھو کہ اپنے چچا کے بیٹے کی حمایت میں غضبناک ہورہا ہے اپنی ماں کی ایسی تیسی میں جائے۔

پچیس سالہ جوان منتصر کی پورے ملک کے سر بر آوردہ لوگوں کے سامنے ہتک ہوگئی چونکہ یہ گستاخی اور توہین ناقابل برداشت تھی لہٰذا اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا۔

متوکل کا قتل اور اس کا اثر

جب منتصر نے اپنے باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا اس وقت دربار میں چند غلام ترک تھے جومتوکل کے رازدا تھے منتصر نے اپنا منصوبہ ان کے سامنے بیان کیا اور ان کے تعاون سے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا۔

ایک رات متوکل نے اپنے مخصوص محل میں بزم مے کشی سجا ئی اور اپنے ندیموں کے ساتھ نصف شب تک مے کشی میں مشغول رہا محل کے تکلفات کے انچارج بغاء صغیر نے کہا: اب خلیفہ کے آرام کاوقت ہے۔ سب اس کے محل سے نکل گئے وہاں صرفتح بن خاقان نے خلیفہ کی جان بچانے کی خاطر خود کو اس کے اوپر گرادیا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا دونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا اور اسی رات میں انھیں خون آلودہ تلواروں سے منتصر کو خلیفہ کے عنوان سے سلامی دی گئی۔

اس ماجرے میں اگرچہ متوکل (فرض ناشناس باپ) خود اپنے قتل کا سبب بنا ہے اور حضرت رسول ؐ کی اس حدیث کا مصداق قرار پایاہے کہ۔یاعلی ! لعن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قھما۔

اے علی! خدالعنت کرے ان والدین پر جو اپنے بچوں کو اپنے عاق کرنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن دوسری طرف باپ کے قتل کے وضعی آثار کانتیجہ یہ ہوا کہ منتصر بھی چھ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔

متوکل کی سرزنش اور لعنت ملامت کے سبب انتقام کی آگ شعلہ ور ہوگئی اور اپنے ہی بیٹے کے ہاتھ سے مارا گیا اس سلسلہ میں حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : الافراط۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ زیادہ ملامت و سرزنش کرنے سے انتقام و عناد کی چنگاریاں بھڑکتی ہیں۔

بیٹے پر باپ کا فقہی حق

محقق اردبیلی کہتے ہیں : العقل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔علی المسلمین۔

عقل و نقل دونوں ہی والدین کی نافرمانی کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور آیات و روایات سے والدین کی اطاعت کا واجب ہونا سمجھ میں آتا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں فقہاء کہتے ہیں : ماں باپ اپنے بچہ کو جنگ و جہاد پر جانے سے روک سکتے ہیں بشرطیکہ محاذ پر جانے کے لئے امام کا حکم نہ ہو یا کافروں نے مسلمانوں کے شہروں پر حملہ نہ کیا ہو۔

کتاب قواعد، میں شہید نے اس طرح فرمایا ہے:

لاریب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عدم التعین۔

جو بھی غیروں پر حرام ہے وہی ماں باپ پرحرام ہے یا جو کچھ غیروں پر واجب ہے وہی والدین پر واجب ہے۔ لیکن کچھ چیزں میں وہ منفرد ہیں : ۱۔ مباح سفر ماں باپ کی اجازت کے بغیر نہیں کرسکتے۔ ۲۔ بچہ پر ماں باپ کی اطاعت واجب ہے اگرچہ مشتبہ ہو کیوں کہ اطاعت واجب ہے اور شبہ کو چھوڑنا مستحب ہے۔۳۔ اگر والدین اس سے کوئی کام کہیں اور نماز کا وقت بھی ہوگیا ہو تو نماز میں تاخیر کرکے ان کی اطاعت کرے۔۴۔ بعض اوقات ماں باپ بیٹے کو نماز جماعت میں شریک ہونے سے روک سکتے ہیں۔۵۔ ماں باپ بیٹے کو جہاد اور محاذ پر جانے سے منع کرسکتے ہیں بشرطیکہ تعین نہ ہوا ہو۔

اولاد کا حق

تمہارے اوپر بیٹے کا یہ حق ہے تم یہ جان لو کہ وہ تمہارا ہی ہے دنیا میں تمہیں سے وابستہ ہے اور اس کا خیروش بھی تمہاری ہی طرف منسوب ہوتا ہے اور یہ ذمہ داری تمہاری ہے کہ اسے ادب سکھاؤ، اس کے پروردگار کی طرف اس کی راہنمائی کرو اور اس کی اطاعت میں اس کی مدد کرو اگر تم اس ذمہ داری کو پورا کروگے تو ثواب پاؤگے اور اگر اس کی انجام دہی میں کوتاہی کروگے تو سزا پاؤ گے۔پس اس کے لئے اس طرح نیک عمل کروکہ اس کا حسن و جمال دنیا میں آشکار ہوجائے اور اس کی جو بہترین سرپرستی تم نے کی ہے اور جو نتیجہ تم نے حاصل کیا ہے وہ خدا کی بارگاہ میں تمہارے اور اس کے درمیان ایک عذر ہوجائے۔

امام زین العابدین ؑ نے اولاد کے حقوق سے متعلق اس حصہ میں جو نکات بیان فرمائے ہیں وہ درج ذیل ہیں :

۱۔ باپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اولاد اسی کی ہے اور دنیا و آخرت میں اس کا خیروشر بھی اسی سے منسوب ہوتا ہے۔

۲۔ اس کی تعلیم و تربیت اورخدا کی طرف اس کی راہنمائی کرنے کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔

۳۔ اولاد کے عمل کے آثار سے غفلت نہیں برتنا چاہیے کیونکہ اس کی نیکی کا ثواب اور اس کی بد کاری کا عذاب ملے گا۔

۴۔ اس کے کمال و ترقی کے لئے اتنی کوشش کرنا چاہیے کہ جس سے خدا کی بارگاہ میں بیٹے کے سلسلہ میں عذر قابل قبول ہوجائے۔

امام زین العابدین ؑ نے پہلے ماں باپ کے حقوق بیان فرمائے او روالدین کے سلسلہ میں جو اولاد کا فریضہ ہے اسے واضح کیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک کے دوسرے پر برابر کے کیا حقوق ہیں۔ والدین پر اولاد کے جو حقوق ہیں انھیں مذکورہ حصہ میں بیان کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بچے کی شخصیت کی بنیاد اسی وقت سے پڑتی ہے جب مردوعورت خلقت کی سنت کے مطابق شادی کرتے ہیں اور یہ بات وہ جانتے ہیں کہ ان کے وجود کے درخت کا پھل وہ اولاد ہیں جو پیدا ہونگی اور معاشرہ کا حصہ بنیں گی۔ اولاد کی شخصیت کا ایک رخ وہ اخلاق و عادات ہیں جو ماں باپ سے میراث کے طور پر اولاد میں منتقل ہوتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اولاد ماں باپ کے اخلاق و افکار کا آئینہ ہیں، یہ وہ موروثی صفات ہیں جو قانون تخلیق کے مطابق بعد والی نسل کو پہلی نسل سے میراث میں ملت

ہیں، یہ قانون انسانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ نباتات و حیوانات میں بھی جاری ہے، یہ ایک وسیع موضوع ہے جس کے لئے مفصل بچث درکار ہے اس کتاب میں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

جب بچہ خدا کے حکم سے مادی دنیا میں آتا ہے اسی وقت دین اسلام والدین کے دوش پر بڑی ذمہ داریاں عائد کردیتا ہے پہلے مرحلہ میں والدین کو چاہیے کہ ان ذمہ داریوں کو پہچانیں اور دوسرے مرحلہ میں ان کی انجام دہی کے لئے خدا سے توفیق طلب کریں اب ہم اختصار کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہیں۔

کامیابی و سعادت کے حصول کے لئے والدین کو دو اصل کی طرف توجہ کرنا چاہیے: ۱۔ مفید استعداد اور صلاحیتوں کو زندہ کریں۔ ۲۔ مضر اور نقصان دہ خواہشات اور رجحانات کو ختم کریں شائستہ اور لائق مربی وہ ہے کہ جو تدریجی طور پر بچے کی اندرونی استعدادوں کو علمی وعملی نگہداشتوں کے سہارے پروان چڑھائے اور اس کو عدم سے وجود میں لائیے اور والدین سے وراثت میں ملنے والی نامطلوب صفات کا نشان تک مٹا دے۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

بیٹے کے لیے باپ پر تین چیزیں واجب ہیں اسے اس کی والدہ کے سپرد کرے اچھا نام رکھے اور اس کی تربیت میں کوشاں رہے۔

امام زین العابدین ؑ نے صحیفہ ٔ سجادیہ میں بچوں سے متعلق دعا میں فرمایا ہے:

اور اے اللہ ! ان کی تربیت و تادیب میں اور ان کو نیک بنانے میں میری مدد فرما۔

ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کی پرورش و تربیت بہت مشکل کام ہے اور اس کی انجام دہی کے لئے خدا ہی سے توفیق مانگنا چاہیے۔

اولاد کا حق:

جس دن بچہ پیدا ہوتا ہے اسی دن سے والدین پر اس کے حقوق عائد ہوجاتے ہیں پہلا موضوع اس کا نام رکھنا ہے نام رکھنے کے بارے میں احادیث میں بہت زیادہ زور دیا گیا ہے ان احادیث میں سے بعض یہ ہیں :

قال النبی :۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ادبہ۔

رسول ؐ نے فرمایا: اولاد کا ماں باپ پر ایک حق یہ بھی ہے کہ وہ ان کا اچھا نام رکھیں او ان کی اچھی تربیت کریں۔

نبی ؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: اپنے بچوں کے نام انبیاء کے نام پر رکھو اور بہترین نام عبداللہ و عبدالرحمٰن ہے۔

رسول ؐ نے فرمایا: والد پر، اولاد کے تین حق ہیں، ان کا اچھا نام رکھے ان کو لکھنا سکھائے اور جب بالغ ہوجائیں تو ان کی شادی کرے۔

اس حدیث میں کتابت سکھانے اور شادی کرنے کے علاوہ ان کا اچھا نام رکھنے کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔ اولاد کے حقوق کے بارے میں نہج البلاغہ کے کلمات حکمت میں حضرت علی ؑ اس طرح فرماتے ہیں :

باپ پر بیٹے کا یہ حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو اچھا ادب سکھائے اور اس کو قرآن کی تعلیم دے۔

اس حدیث میں بھی نام کے انتخاب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

رسولؐ نے برے ناموں کو بدلا

رسولؐ نے لوگوں اور جگہوں کے برے ناموں کو بدلا اور ان کے اچھے نام رکھے اس سلسلہ میں درج ذیل نمونے ملاحظہ فرمائیں :

عن جعفر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ والبلدان۔

امام جعفر صادق ؑ نے اپنے والد سے اور انھوں نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ رسول ؐ لوگوں اور شہروں کے برے ناموں کو بدل دیتے تھے۔

عن ابی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جمیلۃ۔

عمر کی ایک لڑکی تھی جس کا نام عاصیہ، یعنی گناہگار تھا رسولؐ نے اس کا نام بدل کر جمیلہ رکھ دیا تھا۔

عن ابی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔زینب۔

ابو رافع سے روایت ہے کہ، زینب بنت ام سلمہ کا نام برہ تھا یعنی نیک منش جس سے تکبر و غرور اور خود پسندی کی بو آتی تھی، بعض لوگ اس کے بارے میں یہ کہتے تھے : اس نام کے ذریعہ وہ اپنی پاکیزگی کا اظہار کرنا چاہتی ہے رسول ؐ نے اس کو بے حرمتی اور تحقیر سے بچانے کے لئے اس کا نام زینب رکھ دیا۔

عن احمد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اولادھم۔

احمد بن ہیثم سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام رضا ؑ سے دریافت کیا : عرب اپنے بچوں کے نام کتوں، چیتوں وغیرہ کے نام پر کیوں رکھتے تھے؟ آپ نے فرمایا: عرب جنگجو اور لڑاکو تھے اس لئے اپنی اولاد کے یہ نام رکھتے تھے تاکہ جب ان کو آواز دیں تو دشمن کے دل میں خوف و ہراس پیدا ہو۔

برا نام حقارت و سرزنش کا سبب

خانہ بدوش عربوں کے ایک رئیس و سردار کا نام ’’ جاریہ‘‘ تھا۔ جاریہ کے باے میں صاحب اقرب الموارد لکھتے ہیں کہ جاریہ افعی کے جنس میں سے ایک سانپ ہے اور جاریہ ایک طاقتور صریح اللہجہ مرد تھا وہ اور اس کا خاندان معاویہ سے نااض تھا اور دل میں اس کی دشمنی رکھتا تھا اس بات کو معاویہ بھی تاڑ گیا تھا اس نے سوچا کہ برسرعام اس کی توہین کرے اور اس کے نام کا مذاق اڑائے۔

اتفاقاً ایک دن جاریہ معاویہ کے روبرو ہوا معاویہنے اس سے کہا:تم اور تمہارا قبیلہ تمہاری قوم والوں کے نزدیک کتنا پست ہے کہ انھوں نے تمہارا نام سانپ رکھا ہے، جاریہ نے برجستہ جواب دیا : تم اور تمہارا خاندان تمہاری قوم والوں کی نظر میں کتنا پست و حقیر ہے کہ انھوں نے تمہارا نام کُتیا رکھا۔

اس بات پر معاویہ کو بہت غصہ آیا اور کہنے لگا : او بے ماں کے بچے چپ ہوجا۔ انھوں نے جواب دیا :میری ماں ہے خدا کی قسم دن دلوں میں تمہاری دشمنی ہے وہ ہمارے سینوں میں ہیں، معاویہ نے کھسیا کر کہا: خدا معاشرہ میں تم جیسے لوگوں کی کثرت نہ کرے۔

دوسرا نمونہ شریک بن اعور ہے یہ بھی اپنی قوم کا سردار، معاویہ کا ہم عصر، کریہہ المنظر تھا اور اس کا نام شریک تھا جو کہ انسان کے لئے بہت اچھا نام نہیں ہے اور اس کے باپ کا نام اعور تھا اور اعور اس شخص کو کہتے ہیں جس کی آنکھ میں عیب ہوتا ہے۔

جس زمانہ میں معاویہ کا عروج تھا شریک بن اعور معاویہ کے دربار میں پہنچا معاویہ نے کہا:تمہارا نام شریک ہے اور خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ تم اعور کے بیٹے ہو لیکن اعور یعنی آنکھ کے عیب سے محفوظ ہو تم بد شکل ہو اور خوبصورت بد صورت سے اچھا ہوتا ہے پھر تمہارے خاندان والوں نے تمہیں اپنا سردار و رئیس کیسے بنا لیا؟!

شریک نے جواب دیا خدا کی قسم تم معاویہ ہو او معاویہ اس کتے کو کہتے ہیں عوعو کرتا ہے، تم نے عوعو کیا تو لوگوں نے تمہارا نام معاویہ رکھ دیا، تم حرب کے بیٹے ہو اور صلح و سلامتی حرب، یعنی جنگ، سے بہتر ہے، تم صخرہ،پتھر، کے بیٹے اور نرم زمین سنگلاخ سے بہتر ہوتی ہے پھر تم امیر المومنین کیسے بن گئے؟ اس کی ان باتوں نے معاویہ کو پانی پانی کردیا تو معاویہ نے کہا: تم میرے دربار سے ابھی چلے جاؤ۔

جس طرح ٹیڑھا کڑا بدن بدن، ناقص اعضا اور کریہہ صورت باعث اہانت و حقارت ہوتی ہے اسی طرح برا نام و لقب بھی باعث حقارت واہانت ہوتا ہے لہٰذا اسلام نے تاکید کی کہ اپنے بچوں کے اچھے نام رکھو کہ ان کی شخصیتوں پر ناموں کا اچھا اثر ہوگا اور یہ نام انھیں اہانت و حقارت کے احساس سے محفوظ رکھے گا۔

والدین کے دوسرے فرض کی طرف امام زین العابدین ؑ نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے: وانک۔۔۔۔۔ربہ۔

با پ بچے کی اچھی تربیت اور اسے خدا سے آشنا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ روایات میں بچوں کی اچھی تربیت کرنے کے بارے میں کیا احکام وارد ہوئے ہیں۔

بچے کی تربیت میں محبت کا اثر

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس طرح اسے بدن و جسم کے لئے غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اسے روح اور نفسیات کے لئے بھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے، جسم کو ماں کے دودھ اور خدا کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں سے غذا ملتی ہے جو اس کے جسم کے مطابق ہیں لیکن روحی غذا ضروری تعلیم اور اس کی صحیح دیکھ بھال ہے کہ اس فریضہ کو اس کے والدین پورا کرتے ہیں، بچہ کو غذا بھی چاہیے اور محبت بھی، محبت اس کی روح کی غذا ہے۔

رسول ؐ فرماتے ہیں :

احبو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ترزقونھم۔

بچوں سے محبت کرو اور ان سے پیار والفت کرو اور اگر ان سے کوئی وعدہ کرو تو اسے پورا کرو کیونکہ بچے یہ سمجھتے ہیں کہ تم ہی ان کے رازق ہو۔

اس حدیث میں تربیت کے دو اہم موضوعات کی طرف اشارہ ہوا ہے: ۱۔ بچوں سے محبت کرنا۔ ۲۔ ان سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرنا تاکہ ان کے اندر بچپنے ہی سے وعدہ خلافی او رپیمان شکنی کی فکر پیدا نہ ہو۔

ان پر محبت ظاہر کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب تک وہ بچے ہیں ان کا منھ چومو! انھیں پیار کرو۔ رسول ؐ فرماتے ہیں :

قبلوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عام

اپنے بچوں کا بوسو لو کیونکہ ہر بوسہ کے عوض خداوند عالم تمہارے لئے ایک درجہ قرار دیتا ہے اور ہر درجے کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔

اس سے متعلق حضرت علی ؑ بن ابی طالب فرماتے ہیں :

قبلۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دین۔

بچہ کا بوسہ لینا رحمت ہے اور عورت کا بوسہ لینا شہوت ہے۔ماں باپ کو چومنا عبادت ہے اور اپنے بھائی کو چومنا دین ہے۔

غیر والدین کے لئے بوسہ لے کر اظہار محبت کرنے کا ایک مخصوص زمانہ ہوتا ہے، اس زمانہ کے ختم ہوتے ہی اس سے بوسہ لے کر اظہار محبت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ امام صادق ؑ فرماتے ہیں : اذا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سنین۔

جب لڑکی چھ سال کی ہوجائے تو مرد کو اس کا منھ نہیں چومنا چاہیے۔

اور جب لڑکا سات سال کا ہوجائے تو عورت کو اس کا منھ نہیں چومنا چاہیے۔

رسولؐ، حسن ؑو حسینؑ سے محبت رکھتے تھے اور ان کا بوسہ لیتے تھے، ایک روز اقرع بن حابس رسولؐ کی خدمت میں حاضر تھا، آنحضرت ؐ اپنے نواسوں کا بوسہ لے رہے تھے، اس نے کہا: میرے دس بچے ہیں لیکن میں نے ان میں سے کبھی کسی کا منھ نہیں چوما ہے آپ نے فرمایا: اگر خدا نے تمہارے دل سے محبت کو چھین لیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

اس گفتگو کے ذریعہ رسولؐ یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد سے اظہار محبت نہیں کرتا ہے تو وہ سنگدل ہے۔

محبت میں افراط

اسلام جہاں والدین کے اوپر یہ فرض کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں سے محبت کریں وہاں انھیں محبت میں افراط کرنے سے بھی منع کرتا ہے اور ان کی زیادہ محبت کے نقصان کو بھی بیان کرتاہے، امام محمد باقر ؑ فرماتے ہیں :

بدترین والدین وہ ہیں جو اپنی اولاد کے ساتھ نیکی و محبت کرنے میں افراط سے کام لیتے ہیں اور بدترین اولاد وہ ہیں جو اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کی وجہ سے باپ کو ناراض کرتے ہیں۔

اولاد سے زیادہ محبت کی وجہ سے جو بدبختی و ناکامی ہوتی ہے اس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہوا ہے۔ بچہ سے زیادہ کرنا اس کو خود پسندی میں مبتلا کردیتا ہے اور اسے خود رائے بنا دیتا ہے حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : شر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔النفس۔ خود پسندی اور خود سے راضی ہونا بدترین حالت ہے۔

لڑکیاں بہترین اولاد ہیں :

خداوند عالم ماں، باپ کو جو اولاد عطا کرتا ہے انھیں ان کی قدر کرنا چاہیے اور انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ان کے پاس خدا کی امانت ہے اور ان کی تربیت کے لئے کوشش کرنا چاہیے اور ان سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا چاہیے اولیائے اسلام لڑکیوں سے زیادہ محبت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اور تمام ائمہ علیہم السلام کی حدیث میں لڑکیوں کے بارے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

عن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔البنات

حذیفہ یمانی سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: لڑکیاں تمہاری بہترین اولاد ہیں :

وعنہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عنھا۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : لڑکیاں حسنات و نیکیاں ہیں اور لڑکے نعمت ہیں، نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور نعمت کے بارے میں باز پرس کی جاتی ہے۔

وبشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔علی اللہ۔

رسول کو یہ بشارت دی گئی کہ آپ کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے، یہ خبر سن کر اصحاب کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔

آپ نے فرمایا: تمہیں کیا ہوگیا؟ لڑکی ایک پھول ہے جس کو ہم سونگھتے ہیں اور اس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے۔

قال رسول اللہ ؐ:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والصدقۃ۔

بہترین اولاد وہ لڑکیاں جو پردہ کرتی ہیں،جس کے یہاں ایک لڑکی ہوتی ہے خدا اسے اس کے ماں باپ کے لئے جہنم سے بچنے کا ذریعہ و پردہ بنا دیتا ہے او ر جس کے یہاں دو لڑکیاں ہوتی ہیں، ان لڑکیوں کے ذریعہ خدا اس کو جنت میں داخل کرتا ہے اور جس کے یہاں تین لڑکیاں یا بہنیں ہوتی ہیں اس سے خدا صدقہ و جہاد کا حکم اٹھا لیتا ہے۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جو شخص بازار جائے اور اپنے عیال کے لئے کوئی تحفہ خریدے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو محتاج لوگوں کو صدقہ دیتا ہے اور دیکھو بیٹیوں کو بیٹوں پر مقدم کرنا چاہیے کیونکہ جس نے بیٹی کو خوش کیا گویا اس نے حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے کسی غلام کو آزاد کیا۔

بچوں کی تربیت اس طرح کروکہ جس سے تمہاری عزت ہو:

بچوں کے حق کے سلسلہ میں امام زین العابدین ؑ اس طرح فرماتے ہیں : فاعمل۔۔۔۔۔الدنیا۔ اپنے بچہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو کہ تمہاری تربیت کی وجہ سے دنیا میں اس کا حسن دوبالا ہوجائے اور اس کو اس طرح پروان چڑھاؤ کہ وہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں عزت و سر بلندی کی زندگی بسر کرے اور تمہارے لئے بھی باعث فخر ہو۔

اس بات کو ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ اولاد سے زیادہ محبت کرنا اس کی خود پسندی کا باعث ہوتاہ ے اور زیادہ محبت کا ایک ناقابل تلافی نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچہ کے اندر کبھی خود اعتمادی پیدا نہیں ہوسکے گی بچہ کے اندر خود اعتمادی اور مستقل مزاجی کا احساس پیدا کریں تاکہ وہ مشکلوں کا مقابلہ کرسکے۔ یہ چیز ہمیں لقمان کی نصیحتوں میں نظر آتی ہے۔ امام صادق ؑ فرماتے ہیں :عن الصادق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔منفعتہ۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : لقمان نے کہا: بیٹے ! اگر تم نے بچپنے میں ادب سیکھ لیا تو اس سے بزرگی میں استفادہ کروگے اور جو ادب سیکھنا چاہتا ہے وہ اس سلسلہ میں جانفشانی کرتا ہے اور جو ادب سیکھنے کے لئے ہمت و جانفشانی کرتا ہے وہ تربیت سے متعلق علوم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جو طلب علم کے لئے سنجیدگی سے کوشش کرتا ہے وہ اپنے مقصد کو حاصل کرلیتا ہے اور اس کے فوائد اسی کو نصیب ہوتے ہیں۔

بنی الزم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔طمعھم۔

پیارے بیٹے! ہمیشہ اپنی نجی ذمہ داریوں اور ذاتی کاموں کی انجام دہی کو اپنے اوپر لازم کرلو اور جو مصائب و شدائد لوگوں کی طرف سے تمہارے اوپر پڑتے ہیں ان کو برداشت کرنے کے لئے خود کو آمادہ رکھو اگر تم دنیا کی عظیم عزت و سرفرازی حاصل کرنا چاہتے ہو تو ان چیز کی امید نہ رکھو جو لوگوں کے ہاتھو ں میں ہے کیونکہ انبیاء و صدیقین جس بلندی و عظمت پر فائز ہوئے ہیں وہ لوگوں سے امید قطع کرنے ہی کے باعث ہوئے ہیں۔

جناب لقمان نے اپنے فرزند کو جو وصیت کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے اندرروح اعتماد کی پرورش کرو اور جو چیز لوگوں کے پاس ہے اس کی طمع نہ کرو ہر باپ کو یہی نصیحت کرنا چاہیے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی ہے۔

بھائی کا حق

تمہارے بھائی کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہارا ہاتھ ہے اور تمہارے لئے پشت پنا ہ ہے کہ جہاں تم پناہ گزیں ہوتے ہو وہ تمہاری زت ہے کہ جس پر تم اعتماد کرتے ہو اور وہ تمہاری قوت ہے کہ جس کے ذریعہ تم حملہ کرتے ہوپس اسے خدا کی معصیت و نافرمانی کا ذریعہ و حبہ نہ بناؤ اور اس کے وسیلہ سے خدا کی مخلوق پر ظلم نہ کرو تم اس کے حق میں اس کی مدد کرو اور اس کے دشمن کے خلاف اس کی نصرت کرو اس کے اور شیطان کے درمیان حائل ہوجاؤ اور اسے نصیحت کرنے میں پورا حق ادا کرو اور اسے خدا کی طرف بلاؤ پھر اگر وہ اپنے پروردگار کا مطیع ہوجائے اور اس کے حکم کو تسلیم کرے تو فبہا، ورنہ تمہارے نزدیک خدا کو مقدم ہونا چاہیے اور اسے تمہارے لئے عظیم ہونا چاہیے۔

امام زین العابدین ؑ نے بھائی کے حق کے سلسلہ میں تین چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

۱۔بھائی ایک بازو ہے اور اپشت پناہ ہے لہٰذا اسے گناہ و معصیت کا آلۂ کار نہ بناؤ۔

۲۔دشمن کے خلاف اس کی مدد کرو۔

۳۔اسے شیطان کے تسلط سے نجات دلاؤ اسے خدا کی طرف بلاؤ اور اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو تم خدا کے حکم کا پاس و لحاظ کرو نہ سرکش بھائی کا۔

اسلام میں اخوت کی قسمیں

اسلام و قرآن کے اہم مسائل میں سے اخوت و برادری بھی ہے، اخوت کی دو قسمیں ہیں :

۱۔حقیقی او ر سگا بھائی یہ دو انسانوں کا نزدیک ترین رشتہ سمجھا جاتا ہے اور ایک دوسرے سے میراث لینے کا باعث ہوتا ہے اور اسلامی فقہ کی میراث میں یہ دوسرے طبقہ میں ہے۔

۲۔ برادر ایمانی، حقیقت یہ ہے کہ ایمان و اسلام نے سارے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے یہ اسلام ہی ہے جو دنیا بھر کے مسلمانوں کے اتحاد و حدت کا باعث بن گیا ہے۔

’’ اخ‘‘ کے معنی لغت میں بھائی اور مصاحب و رفیق کے ہیں اس کی اصل ’’ اخو‘‘ ہے۔ ’’ اخو‘‘ اس شخص کو کہتے ہیں جو ماں، باپ یا ان میں سے کسی ایک میں دوسروں کا شریک ہوتا ہے، مفردات میں دودھ شریک کو بھائی کہا گیا ہے، اب وام کی طرح اخ بھی کثیر الاستعمال ہے مفردات میں اس کے اصلی معنی بیان کرنے کے بعد تحریر کیا ہے: جو بھی کسی دوسرے کے ساتھ قبیلہ، دین، صنعت، معاملے اور مودت و محبت میں شریک ہوتا ہے اسے اخ کہا جاتا ہے، لفظ اخ قرآن مجید میں حقیقی و مجازی دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔

دائرۃ المعارف میں فرید وجدی تحریر کرتے ہیں : کہتے ہیں : اخوان اخ کی جمع ہے جس کے معنی رفیق و ساتھی ہیں یعنی اگر اخ کے معنی حقیقی بھائی ہے تو اس کے جمع اِخوۃ اور اگر اس کے معنی دوست ہیں تو اس کی جمع اخوان ہے لیکن وجدی کی یہ بات صحیح نہیں لگتی کیونکہ قرآن مجید میں اخوانھن استعمال ہوا ہے اور اس سے حقیقی بھائی مراد ہیں قرآن کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِخوہ، اخوان کے درمیان یہ فرق ہے کہ اخوان حقیقی اور غیر حقیقی دونوں بھائیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اِخوہ صرف حقیقی بھائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے : سورۂ یوسف میں ارشاد ہے : لا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور سورۂ نساء میں ارشاد ہے: فان۔۔۔۔۔۔۔مگر دوسری آیت، انما۔۔۔۔۔۔۔۔ کی رو سے برادر ایمانی حقیقی بھائی ہیں۔

اسلامی اخوت کی اہمیت

قرآن مجید کہتا ہے: انما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ترحمون۔

مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں لہٰذا اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادو اللہ سے ڈرو شاید تم پر رحم کیا جائے۔

یہ آیت ایک عمیق و پر معنی نعرہ کو بیان کرہی ہے اسلام نے مسلمانوں کے درمیان رشتہ برقرار کرنے پر اتنا زور دیا ہے کہ انھیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا حقیقی یہ ہے کہ اسلام سارے مسلمانوں کو ایک خاندان قرار دیتا ہے اور اس چیز کو حج کے عبادی و سیاسی مراسم میں دیکھا جاسکتا ہے سبھی ایک کو دوسرے کو بھائی سمجھتے ہیں اگرچہ کوئی مغرب سے اور کوئی مشرق سے آتا ہے یہ تھا قرآن کا بیان اب رسول ؐ کے کلام پر توجہ فرمائیں فرماتے ہیں :

المسلم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے اور نہ اسے حوادث کے حوالے کرتا ہے۔

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں :

مثل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دو دینی بھائیوں کی مثال دونوں ہاتھوں کی سی ہے کہ ایک دوسرے کو دھوتا ہے۔

رسول ؐ نے برادران اسلام کو ایک پیکر کے دو ہاتھوں کی مانند فرض کیا ہے یہ بہترین مثال ہے کہ سارے مسلمان ایک پیکر اور اس کے افراد اس پیکر کے ہاتھ۔

مومن، مومن کا بھائی

امام صادق ؑ اس موضوع کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں :

عن ابی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیخلفہ۔

مومن مومن کا بھائی ہے وہ اسے آنکھ کی مانند راستہ دکھاتا ہے وہ ہرگز اس سے خیانت نہیں کرتا ہے اور نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے دھوکا دیتا ہے اور نہ اس سے وعدہ کرکے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:

ابو بصیر کہتے ہیں : میں نے امام صادق ؑ سے سنا کہ فرماتے ہیں : مومن، مومن کا بھائی ہے سب ایک بدن کے اعضاء کی مانند ہیں اگر ان میں کسی میں درد ہوتا ہے تو سارے اعضاء بے چین ہوجاتے ہیں۔ ان کی روحوں کا سر چشمہ ایک ہے او مومن کی روح خدا سے ایسے ہی متصل ہے جیسے سورج سے شعاع متصل ہوتی ہیں۔

اخوت بہت بڑی نعمت ہے

قرآن مجید نے سورۂ آل عمران میں اخوت کی نعمت کا ذکر کیا ہے: ارشاد ہے:

واعتصموا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تم سب اللہ کی رسی (قرآن و اہل بیت کے دامن ) کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ اندازی سے پرہیز کرو اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس وقت خدا نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی تھی پس اس کی نعمت کے سبب تم بھائی بھائی بن گئے۔

، اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ عرب کے دو بڑے قبیلے اوس و خزرج کے درمیان بہت پرانی دشمنی تھی۔رسولؐ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ان کے درمیان صلح کرادی تھی اور انھیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کے درمیان کبھی کبھی ٹھن جاتی تھی اور رسولؐ ان میں جھگڑا نہیں ہونے دیتے تھے۔

رسولؐ نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اگر کسی کو کسی سے محبت ہے تو اسے چاہیے کہ اس سے محبوب کا مطلع کرے کیونکہ اس سے محبت و اخوت میں دوام و استحکام پیدا ہوتا ہے۔ قال :۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جب تم میں سے کوئی مسلمان سے محبت کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اس محبت سے اسے مطلع کرے۔

مومن سے ملاقات کرنے کا ثواب

کافی میں ایک باب ’’ باب زیارۃ الاخوان ‘‘ ہے اس باب میں مومن سے ملاقات کرنے کے ثواب سے متعلق بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں :

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : جو شخص کسی مومن سے خدا کے واسطے ملاقات کرتا ہے خدا اس سے فرماتا ہے : تم نے میرے بندہ سے ملاقات کی ہے تمہارا اجر و ثواب میرے اوپر ہے اور تمہارے اس عمل کا ثواب میں جنت کے علاوہ پسند نہیں کرتا ہوں۔

ایک روایت امام باقر ؑ سے منقول ہے:

ابو حمزہ نے امام محمد باقر ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: جب مسلمان اپنے بھائی سے ملاقات کے لئے اپنے گھر سے نکلتا ہے اور اس ملاقات سے اس کا مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے تو خداوند عالم اس پ ستر ہزار فرشتوں کو مقرر کردیتا ہے جو اس کے پیچھے پیچھے ندا دیتے ہوئے چلتے ہیں تم خوش نصیب ہو جنت مبارک ہو یہاں تک کہ وہ اپنے گھر لوٹ آتا ہے اسلام ایسے ہی حکم دیتا ہے کہ جن سے مسلمانوں کے اتحاد ہم آہنگی کی حکایت ہوتی ہے اور اسلام انھیں دستور کے زیر سایہ مومنوں کی زندگی کو خوشگوار بناتا ہے۔

برادران اور ان کے فرائض حضرت علی ؑ کی نظر میں :

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں، بھائی دو قسم کے ہوتے ہیں معتمد اور قابل بھروسہ بھائی دوسرے ظاہری اور دکھاوے کے بھائی، معتمد اور بھروسے کے قابل بھائی انسان کے دست و بازو اور اس کے وہ بال و پر ہوتے ہیں اگر تمہیں ایسا بھائی مل جائے تو اس پر پیسہ خرچ کرو اور ہاتھ سے اس کی مدد کرو اور جس سے اس کی دوستی ہو تم بھی اس سے دوستی کرو اور جس سے اس کی دشمنی ہو تم بھی اس کے دشمن بن جاؤ اس کے راز کو محفوظ رکھو اور اس کی خامیوں کو چھپاؤ اور اس کی اچھائی کو ظاہر کرو جان لو کہ ایسا بھائی ہیرے سے بھی زیادہ کمیا ب ہے۔

رہے ظاہری اور دکھاوے کے بھائی تو ان سے فائدہ اٹھاؤ ان سے صاحب سلامت رکھو اور تعلقات قطع نہ کرو لیکن ان کے ضمیر سے اس زیادہ کی توقع نہ رکھو جس طرح وہ خندہ پیشانی اور شیریں بیانی سے تمہارے ساتھ پیش آئیں اسی طح تم ان کے ساتھ پیش آؤ۔

اس حدیث میں حضرت علی ؑ نے یہ فرمایا ہے کہ سچے دوستوں ک یلئے جان و مال بھی قربان کردو ان کی مدد کرو اور ان کے ساتھ احسان و نیکی کرو اور ظاہری دوستوں سے بظاہر ٹھیک طریقہ سے ملو کہ وہ بھی انسان کی روز مرہ کی زندگی میں کام آتے ہیں۔

بھائیوں کے ساتھ انصاف سے کام لو

قال علی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : انصاف او منصفانہ برتاؤ سے برادرانہ روابط میں استحکام و دوام پیدا ہوتا ہے:

جب حضرت محمد ؐ سات سال کے ہوگئے تو آپ نے اپنی رضاعی ماں حلیمہ سے فرمایا: میرے بھائی کہاں ہیں ؟

انھوں نے جواب دیا: بیٹے وہ ان بھیڑوں کو چراگاہ لے گئے ہیں جو خدا نے تمہارے طفیل میں ہمیں عطا کی ہیں۔ آپ نے فرمایا: اماں آپ نے میرے حق میں انصاف نہیں کیا حلیمہ نے کہا: بیٹے کیسے ؟ فرمایا: میں سایہ میں رہوں اور میرے بھائی شدید دھوپ میں اور پھر میں ان کا دودھ بھی نوش کروں۔

حضرت رسول خدا ؐ فرماتے ہیں :

سید الاعمال ثلاثہ:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فی کل حال۔

بڑے اعمال تین ہیں : اپنے نفس کے ساتھ انصاف کرنا او رلوجہ اللہ بھائی کی مدد کرنا اور ہر حال میں خدا کو یاد کرنا۔

بھائی امام صادق ؑ کی نظر میں

الاخوان ثلاثہ:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اللبیب۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : بھائی تین قسم کے ہوتے ہیں : ایک تو غذا کی مانند ہیں کہ جن کی انسان کو ہر وقت ضرورت ہوتی ہے یہ عقل مند ہیں، دوسرے مرض کے مثل ہیں یہ بیوقوف و احمق لوگ ہیں تیسرے دوا کی مانند ہیں، یہ نہایت ہی ذہین و زیر ک افراد ہیں۔

رسولؐ کی نظر میں بھائی کے تیس حقوق

قال رسول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حقا۔

رسولؐ فرماتے ہیں : مسلمان کے اپنے بھائی پر تیس حقوق ہیں کہ جن سے وہ دو ہی طریقوں سے بری الذمہ ہوسکتا ہے یا تو ان حقوق کو ادا کرے یا وہ اسے معاف کردے۔

۱۔اس کی لغزشوں کو معاف کردے۔

۲۔پریشانی کے زمانہ میں اس پر مہربان رہے۔

۳۔اس کے راز و اسرار کو چھپائے۔

۴۔اس کی کوتاہیوں کی تلافی کرے۔

۵۔اس کے عذر کو قبول کرے۔

۶۔اسے برا کہنے والوں کی تردید کرے۔

۷۔ہمیشہ اس کا خیر خواہ رہے۔

۸۔اس کی دوستی کی حفاظت کرے۔

۹۔اس سے کئے گئے عہد کا لحاظ رکھے۔

۱۰۔مریض ہوتو اس کی عیادت کرے۔

۱۱۔مرجائے تو اس کی تشیع جنازہ میں شریک ہو۔

۱۲۔اس کی دعوت کو قبول کرے۔

۱۳۔اس کے تحفہ کو قبول کرے۔

۱۴۔اس کی عطا کی اسے جزا دے۔

۱۵۔اس کی نعمت کا شکر ادا کرے۔

۱۶۔اس کی مدد کرنے کے لئے کوشش کرے۔

۱۷۔اس کے ناموس کی حفاظت کرے۔

۱۸۔اس کی حاجت کو پورا کرے۔

۱۹۔اس کی خواہش کے لئے سفارش کرے۔

۲۰۔اگر اسے چھینک آئے تو یرحمک اللہ کہے۔

۲۱۔اس کی گمشدہ چیز کی طرف اس کی راہنمائی کرے۔

۲۲۔اس کے سلام کا جواب دے۔

۲۳۔اس کی بات کو صحیح سمجھے۔

۲۴۔اس کے انعام کی تعریف کرے اور اسے اچھا سمجھے۔

۲۵۔اس کی قسم کی تصدیق کرے۔

۲۶۔اس کے دوست کو دوست سمجھے۔

۲۷۔اس سے دشمنی نہ کرے۔

۲۸۔اس کی مدد کرے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ظلم کے وقت اس کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے باز رکھے او مظلومی کی حالت میں اس کی مدد یہ ہے کہ ظالم سے اس کا حق لینے میں اس کی کمک کرے۔

۲۹۔مشکلوں اور حوادث میں اسے تنہا نہ چھوڑ ے۔

۳۰۔جواچھی چیز اپنے لئے پسند کرے وہی اس کے لئے پسند کرے اور جس برائی کو اپنے لئے پسند نہ کرے اسے اس کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

آزاد کرنے والے کا حق

لیکن جس مولا نے تمہیں نعمت سے نوازا ہے اور تمہیں آزاد کیا ہے اس کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے تمہیں آزادی دلانے کے لئے اپنا مال خرچ کیا اور تمہیں غلامی کی ذلت و وحشت سے نکال کر حریت و آزادی کی عزت میں پہنچا دیا، ملکیت کی اسیری سے تمہیں آزاد کیا اور تمہیں غلامی کی زنجیر سے نجات دلائی، تمہاے لئے عزت کی فضا بنائی اور تمہیں قہر کی جیل سے نکالا اور تمہیں سختیوں سے رہائی دلائی اور تمہارے لئے عدل کی زبان کھولی اور ساری دنیا کو تمہارے لئے مباح کر دیا اور تمہیں، تمہارے نفس کا مالک بنا دیا اور تمہیں زندان سے رہا کراایا اور تمہیں تمہارے پروردگار کی عبادت کے لئے آسودہ خاطر کیا، خود مالی خرچ برداشت کیا جان لو کہ وہ تمہاری حیات و ممات میں تمہاے سارے عزیزوں سے زیادہ تم سے قریب ہے پس وہ راہ خدا میں سب سے زیادہ تمہاری مدد و کمک کا مستحق ہے جب تک اسے ضرورت ہے اسے اپنے اوپر مقدم کرو۔

اس حصہ میں امام زین العابدین ؑ آزاد شدہ غلام کو خبردار کررہے ہیں کہ جس مولا نے تمہیں دولت و ثروت سے آزاد کیا ہے، غلامی کی وحشت سے آزادی کی عزت میں پہنچایا ہے دوسروں کی عبودیت و بندگی سے رہائی دلائی ہے۔ غیر خدا کی قید سے چھڑا کر خدا کی بندگی و عبودیت کی عزت میں داخل کیا ہے۔

ایسے مولا کا غلام پر کچھ حق ہوتا ہے اور وہ حق یہ ہے کہ اس کی مدد و نصرت کرے اور کبھی اپنے آقا پر سبقت نہ کرے اور ہر جگہ اس کے احترام کو ملحوظ رکھے۔

ہم نے مولا اور غلام کے حق او رتاریخ میں غلاموں پر روا رکھے جانے والے ظلم وستم او ان کی آزادی کے اسباب، خصوصا ان کی آزادی کے لئے اسلام کی جنگ کو، غلامی کہاں سے چلی ہے کے ذیل میں بیان کیا ہے ان چیزوں کو یہاں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آزادی فکر

آزادی فکر ہر شخص کا فطری اور اصلی حق ہے کہ وہ آزادانہ طریقہ سے سوچے۔ آزادی فکر یعنی ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ جس چیز کے بارے میں چاہے غوروفکر کرے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے افکار وعقائد پر پابندی لگائے اور ایسے اسباب پیدا کرے کہ جس سے اس کی فکر گھٹ کر رہ جائے اور اس کے صحیح ادراکات کے پنپنے میں مانع ہوجائے۔

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص جسمانی طور پر اپنے مالک کے اختیار میں ہو لیکن اس کی فکر آزاد ہوتیہ ے کوئی شخص بھی کسی دوسرے کی فکر کا مالک نہیں ہوسکتا۔ ہاں غلاموں کے لئے آزادی فکری کی فضا تنگ ہوگئی وہ اس طرح کہ ممکن ہے وہ آزادانہ طور پر غوروفکر کرے لیکن کیا وہ اپنے افکارو خیالات کے مطابق عمل بھی کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسی لئے امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں کہ اس نے تمہیں دوسروں کی بودیت سے نجات عطا کی ہے اور تمہیں دوسروں کے قہر و تسلط سے چھڑایا ہے اور زبان انصاف کو تمہارے لئے آزاد کیا ہے۔ اس عبارت میں آپ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ غلام آزادی کے بعد آزادی سے غوروفکر کرسکتا ہے اور اپنے افکار و خیالات کے مطابق عمل کرسکتا ہے یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ غلام کے آزاد ہونے سے اسے آزادی فکر بھی مل جاتی ہے۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو آزادی فکر کا تحفہ دیا ہے اور تحقیق و مطالعہ کا راستہ ان کے لئے کھلا رکھا ہے حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : من استقبل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جو مختلف قسم کی رایوں کے روبرو ہوتا ہے وہ خطا اور غلطی میں مبتلا ہونے کی جگہوں کو پہچان لینا ہے اور حق و باطل میں فرق کرلیتا ہے۔ صحیح و غلط جگہوں کو پہچان لیتا ہے۔

نہ یہ کہ اسلام عقائد و افکار پر پابندی نہیں لگاتا ہے بلکہ ہر شخص کی ذمہ داری اور ہر ایک کی قدروقیمت کا معیار اس کی عقل اور فکر کو قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہے: تفکر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایک گھنٹہ سوچنا ستر سال کی عبادت سے افضل و بہتر ہے۔

قرآن مجید نے اپنی بہت سی آیتوں میں لوگوں کو آزدی فکر پر ابھارا ہے۔

فبشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الالباب۔

میرے ان بندوں کو خوشخبری دیدو جو کان لگا کر باتیں سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین بات کا اتباع کرتے ہیں یہی و ہ لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور یہی صاحبان عقل وخرد ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:ھل یستوی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہے؟ کیا تم غوروفکر نہیں کرتے؟

عقیدہ کی آزادی

قلبی عقائد اور لوگوں کے مذہبی اعتقادات مخصوص اسبا و علل کی وجہ سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ مثلا تعلیم و تربیت کے اسلوب اور بعض دوسرے عوامل و اسباب کا افکار و عقائد کے وجود پذیر ہونے میں گہرا اثر ہوتا ہے اسی طرح عقاد کو بدلنے میں بھی انھیں عوامل اور منطق و استدلال سے مدد لینا چاہیے۔ جب و زبردستی سے نہیں کرنا چاہیے۔ عقیدہ کی آزادی کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

لااکراہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دین میں کوئی جبروزبردستی نہیں ہے کیونکہ کمال و کامیابی اور ہدایت کے راستہ کو گمراہی سے جدا کردیا گیا ہے۔

ولو شائ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر رہنے والے سب لوگ ایمان لے آتے۔

کیا آپ لوگوں پر جبر و زبردستی کریں گے کہ وہ ایمان لائیں ؟

قل الحق۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کہہ دیجئے کہ یہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے یقینا ہم نے کافروں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے۔

آپ یاد دلائیے آپ تو بس یاد، دہانی کرانے والے ہیں آپ کو ان پر زبردستی کرنے کا حق نہیں ہے۔

حق یابی کے سلسلہ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس دلیلیں آچکی ہیں پھر ان دلیلوں کی روشنی میں جس نے حق کو دیکھ لیا تو اس میں اسی کا فائدہ ہے اور جس نے اس سے آنکھیں ہی بند کرلیں اس نے اپنا ہی نقصان کیا اور میں تمہارے اوپر نگراں تو ہوں نہیں۔ مذکورہ آیتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے بلکہ ہر شخص عقیدہ کے انتخاب میں آزاد ہے لیکن اسلام قل و منطق اور علم و تحقیق کا دین ہے اور لوگوں کو اندھی تقلید سے منع کرتا ہے اور خدا کو چھوڑ کر سورج، چاند وغیر ہ کی پوجا کرنے کو انسان کی نادانی قرار دیتا ہے اور اسے غوروفکر کرنے کی دعوت دیتاہے۔

مالکیت کی آزادی

امام زین العابدین ؑ آزاد شدہ غلام سے فرماتے ہیں : جس مولا نے تمہیں آزاد کیا ہے اباحک۔۔۔۔اس نے تمہارے لئے ساری دنیا کو مباح کردیا ہے اور تمہیں فکرومالکیت کی آزادی دی ہے جو کہ دنیا کے مباح ہونے کا مصداق ہے بنا برایں جو غلام آزاد ہوتاہے وہ اپنے مال سے فائدہ اٹھانے اور اس کا مالک بننے میں آزاد ہوجاتا ہے۔

فردی مالکیت کا سرچشمہ انسان کی فطرت ہے اور زندگی کی رونق کا باعث ہے۔ اسلام نے بھی اس کو مقدس قرار دیا ہے اور اپنے قانون میں اس کی حمایت کی ہے قرآن مجیدفرماتا ہے :

جو مرد کماتے ہیں وہ مردوں کا ہے او رجوعورتیں کسب کرتی ہیں وہ ان کا حصہ ہے۔

جب آدمی صحیح راستہ سے کوئی مال حاصل کرتا ہے تو وہ اسی کا ہوتا ہے۔

ایمان لانے والو! اپنے درمیان اپنے اموال کو باطل طریقہ سے نہ کھاؤ یا تجارت کے ذریعہ یا ایک دوسرے کی رضا مندی سے کھاؤ۔

بنابرایں جومال تجارت یا حلال کام کے ذریعہ حاصل ہوتاہے وہ مباح ہے اور انسان اس کا مالک ہے چنانچہ اگر وہ ایسے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے تو اسلام اسے شہیدوں میں شمار کرتا ہے : من۔۔۔۔۔۔۔۔

واضح رہے کہ مالکیت میں آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں سے چاہے ثروت جمع کرے بلکہ قانونی مال وہ ہے جو تجارت، صنعت اور کاشتکاری وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے اور جو مال چوری، خرید و فروخت میں دھوکا دینے، کم تولنے، سود لینے اور غصب کے ذریعہ جو حاصل ہوتا ہے وہ غیر قانونی ہے۔

اسلام ان چیزوں کا شدید مخالف ہے۔جو مال تم حلا ل طریقہ سے حاصل کرتے ہو اس کا اسلامی ٹیکس دینا چاہیے ورنہ وہ اس آیت کا مصداق ہوگا۔

جو لوگ سونے، چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اس میں سے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے ہیں انھیں دردناک عذاب کی بشارت دیدیجئے۔ جس دن اس سونے، چاندی کو جہنم کی آگ میں پگھلایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانی، ان کے پہلوؤں او رپشتوں کو داغ دیا جائے گا اور ان سے عذاب کے فرشتے کہیں گے۔ یہ ہے وہ سونا، چاندی جو تم نے دنیا میں اپنے لئے جمع کیا تھا اب اپنے جمع کئے ہوئے کا مزہ چکھو!

یہ تھے وہ جملے جو فکر، عقیدہ اور مالکیت کی آزادی سے متعلق ہیں، غلام آزاد ہونے سے ان میں بھی آزاد ہوجاتا ہے۔

اس حق کے آخرمیں امام زین العابدین ؑ آزاد شدہ غلام کے اندر شکروسپاس گزاری کی حس کو بیدار کرتے ہیں اور اسے خبر دار کرتے ہیں کہ مولا کے ساتھ ہمیشہ یہ سلوک کرتے رہنا۔

آزاد شدہ کا حق

جوغلام تم نے آزاد کردیا اس کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تمہیں معلوم ہوناچاہیے کہ خدا نے تمہیں اس کا حمایت کرنے والا، پشت پنا اور مددگا بنایا ہے اور اسے تمہارے اور اپنے درمیان وسیلہ قرار دیا ہے سزاوار ہے کہ وہ تمہیں جہنم سے نجات عطا کرے اور اس کا یہ ثواب آخرت میں تمہیں نصیب ہو اور دنیا میں بھی اگر اس کا کوئی وارث نہ ہوتو تمہیں اس کے وارث ہو کیونکہ تم نے اس پر پیسہ خرچ کیا ہے اور اس کو آزاد کیا ہے اور اس کے حق کو قائم کیا ہے اگر تم ان چیزوں کا خیال نہیں رکھو گے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس کی میراث تمہارے لئے پاک نہیں ہوگی۔

کتاب مکارم الاخلاق میں یہ عبارت اس طرح منقول ہے:

لیکن تمہارے اوپر تمہارے اس مولا کا حق کہ جس نے تم پر احسان کیا ہے یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کو خدا نے تمہارے آزاد کرنے کو خود تک رسائی کا ذریعہ بنایا ہے اور اسے تمہارے اور آتش جہنم کے د ر میان حائل کردیا ہے۔ جان لو کہ اس نیک عمل کی دنیا میں تو یہ جزا ہے کہ (اگر اس کا کوئی وارث نہیں ہے تو ) اس کی میراث تم پاؤ گے کیونکہ تم نے اس پر مال خرچ کیا ہے اور آخرت میں اس کی جزاء جنت ہے۔

حدیث میں لفظ مولا کی تکرار ہوئی ہے یہ ایک اسم ہے جورب، مالک، سیدو سردار، ولی نعمت، معتق (آزاد کرنے والے) ناصر، محب، تابع، ہم سایہ، چچازادبھائی، حلیف، داماد، غلام وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن جس حدیث میں یہ اسم استعمال ہوا ہے اس میں اس کے معنی اس چیز سے سمجھ میں آتے ہیں جس کی طرف یہ مضاف ہوا ہے۔

حقوق کے اس حصہ میں لفظ مولا آزاد شدہ غلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پہلے حق میں امام زین العابدین ؑ نے آزاد کرنے والے کے کچھ حقوق بیان فرمائے تھے اور اس میں آزاد شدہ کے حقوق بیان کئے ہیں اصل میں آزاد کرنے والے اور آزاد ہونے والے کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہوتے ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ممکن ہے آدمی کے اندر اس وقت غرور و تکبر پیدا ہوجائے جس وقت وہ کسی پر احسان کرتا ہے یا کسی کے جرم کو معاف کردیتا ہے ممکن ہے اس پر احسان جتائے یا اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھے امام زین العابدین ؑ آزاد کرنے والے کے غرور و تکبر کو برطرف کرتے ہیں : خبردار تم یہ خیال نہ کرنا کہ اس پر تمہارا ہی حق ہے۔ نہیں بلکہ تمہارے اوپراس کا بھی حق ہے تمہیں اس کے ادا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

آزاد شدہ کے فرائض

دیکھو جب تم نے اسے آزاد کردیا تو اس کے ذریعہ تم خدا سے قریب ہوگئے اور وہ تمہارے اور جہنم کے بیچ میں رکاوٹ بن گیا اس طرح تم آخرت میں کامیاب ہوجاؤ گے لیکن دنیا میں اس کا اثر یہ ہے کہ اگر وہ دنیا سے اٹھ جائے اور اس کا کوئی وارث و عزیز نہ ہوتو تم اس کے وارث ہو کیونکہ تم نے اس پر پیسہ خرچ کیا تھا۔ یہ درحقیقت فقہی حق کی طرف اشارہ ہے۔ اگر آزاد کرنے والے نے اسے خدا کی رضا کے لئے آزاد کیا ہے اور آزاد ہونے والے کا کوئی عزیز نہ ہوتو وہ اس کی میراث پائے گا۔

غلام کو آزاد کرنے کی جزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسلام کی منطق میں دیکھتے ہیں کہ تمام ثواب و اجر آزاد کرنے والے کے لئے بیان ہوا ہے اس میں سے کچھ تو ہم نے غلام والی بحث میں بیان کیا ہے اور بحث کی مناسبت سے چند حدیثیں یہاں قلم بند کرتے ہیں :

آزاد کرنے والے کی منزلت

وسائل الشیعہ کی کتاب عتق کے باب اول کی دوسری حدیث میں ہے:

عن زرارہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

زرارہ نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسولؐ کا ارشاد ہے: جو شخص کسی مسلمان کو آزاد کرتا ہے عزیزوجبار خدا آزاد ہونے والے کے عضو کے عوض اس کے عضو کو جہنم سے آزاد کرتا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے:

ایک حدیث کے ذیل میں امام صادق ؑ فرماتے ہیں : ایک روز فاطمہ بنت اسد نے رسول ؐ کی خدمت میں عرض کی : میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں اپنی اس کنیز کو راہ خدا میں آزاد کردوں۔ رسولؐ نے ان سے فرمایا: اگر آپ اس کو آزاد کریں گی توخداوند عالم اس کے ہر عضو کے عوض آپ کے ہر عضو کو آگ سے آزاد کرے گا۔

شیعوں کے ائمہ اور غلاموں کی آزادی

اسی باب کی ایک اور حدیث میں ہے:

عن ابی عبداللہ:

امام صادق ؑ فرماتے ہیں کہ امام باقرؑ کے پاس وقت آخر ساٹھ غلام تھے ان میں سے بیس کو راہِ خدا میں آزاد کردیا تھا۔

رسولؐ اور شیعوں کے ائمہ ہر وقت اور ہر جگہ غلاموں کو آزاد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے تا کہ اس عمل کے دنیوی و اخروی ثواب سے اپنے ماننے والوں کو آگاہ کرسکیں۔

احسان کرنے والے کا حق

جس نے تم پر احسان کیا ہے اس کا تم پر یہ حق ہے کہ اس کا شکریہ ادا کرو اور اس کا ذکر خیر کرو اور اس کی اچھی باتوں کو پھیلاؤ اور اس کے لئے خلوص کے ساتھ خدا سے دعا کرو کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو گویا تم نے کھلم کھلا اور خفیہ طور پر اس کا شکریہ ادا کیا پھر اگر تمہاری استطاعت میں ہوتو اس کا بدلہ دو ورنہ اس کے انتظار میں رہو اور اس کام کے لئے خود کو تیار رکھو۔

یہ خصوصیت ہر انسان کی فطرت و سرشت میں موجود ہے کہ جہاں تک اس سے ہوتا ہے اپنے محسن کے احسان کے بدلہ چکانا چاہتا ہے اگر بعض لوگ اس کے برخلاف عمل کرتے ہیں تو اس کی وجہ وہ رذالت ہے جو ان کے اندر پیدا ہوگئی ہے ورنہ اخلاق اسلامی سے آراستہ انسان اپنے اندر اس رجحان کی تقویت کرتا ہے کہ اپنے محسن کے احسان کا بدلہ چکانے اور اس انتظار میں رہتا ہے کہ دوسروں کے احسان کی تلاف کرے۔

اس سلسلہ میں امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں :

اول: اس کے کا ر خیر اور اس کی خدمت کا شکر گزار رہے۔ اس کے احسان کو یاد کرے، دوسرے زبان کے ذریعہ اس کی نیکی کو اجاگر کرے، اس کے حق میں دعا کرے۔ اگر کوئی ان باتو ں پر عمل کرتا ہے تو گویا اس نے کھلم کھلا اور خفیہ طور پر اس کا حق ادا کردیا۔ تیسرے اگر اس کے لئے ممکن ہوتو اس کی نیکیوں اور احسان کا بدلہ چکانے کے لئے خود کو تیار کرے ورنہ یہ ارادہ کرے کہ جیسے ہی حالات سازگا ہونگے میں بلا فاصلہ اس کی تلافی کردونگا۔

نیکی اور بدی برابر نہیں ہے

قرآن مجید اپنی اخلاقی او ر تربیتی تعلیمات کے ذیل میں فرماتا ہے:

ولا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نیک و بدی برابر نہیں ہے اگر تمہاے ساتھ کوئی بدی کرے تو اس کا بدلہ نیکی سے دوکیونکہ تمہارے اس عمل سے وہ شخص بھی تمہارا دوست بن جائے گا جو تمہارا دشمن ہے بلکہ صمیمی دوست بن جائے گا۔

یہ آیت یہ کہتی ہے : نیکی کے بدلے نیکی کرنا تو فطری بات ہے، ایسا ہی ہونا چاہیے خوبی تو یہ ہے کہ انسان اس کے ساتھ بھی نیکی کرے کہ جس نے اس کے ساتھ بدی کی ہے تاکہ اس سے محبت و دوستی پیدا ہوجائے۔ سلام کا جواب اس سے بہتر دو۔

قرآن مجید کہتا ہے: اذا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حسیبا۔

جب کوئی تمہیں سلام کرے تو تم اس کا جواب اس سے بہتر طریقہ سے دو یا کم از کم اس کا جواب اسی انداز میں دو بیشک خداوند عالم ہر چیز کا حساب رکھتا ہے۔

تحیت، حیات سے مشتق ہے اور دوسرے کو زندگی کی دعا دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے خواہ یہ دعا سلام علیک کی صورت میں ہو یا حیا ک اللہ کی صورت میں ہو اس کا بہترین مصداق سلام کرنا ہے کہ جسسے دو آدمی ایک دوسرے سے اظہار محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے درمیان گفتگو کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے۔

لیکن بعض روایات اور تفسیروں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عملی طور پر محبت کا اظہار کرنا بھی تحیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

آیت میں وارد لفظ تحیت سے سلام کرنا اور ہر قسم کی نیکی کرنا مراد ہے۔ کتاب مناقب میں ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ایک کنیز نے امام حسن کی خدمت میں ایک گلدستہ ہدیہ کیا، آپ نے اس ہدیہ کے عوض اس کو آزاد کردیا جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے اس کو کیوں آزاد کردیا؟

فرمایا:اذا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نیز فرماتے ہیں بہترین تحیت آزاد کرنا ہے مختصر یہ کہ یہ آیت ہر قسم کے اظہار محبت کو شامل ہے خواہ وہ لفظی ہو یا عملی؟

احسان کا بدلہ احسان

قرآن مجید فرماتا ہے : ھل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کیا احسان کا بدلہ احسان کے علاوہ اور کچھ ہوسکتا ہے اگرچہ اسلامی روایات اور تفسیروں میں لفظ احسان کے معنی توحید و معرفت اور اسلام بیان ہوئے ہیں لیکن یہ اس کا واضح مصداق ہیں ورنہ اس سے ہر لفظی و عملی نیکی مراد ہے چنانچہ امام صادق ؑ فرماتے ہیں : آیہ فی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

قرآن مجید میں ایک آیت ہے جس کا مفہوم عام اور کلی ہے۔ راوی کہتا ہے : میں نے عرض کی: وہ کون سی آیت ہے؟

فرمایا: خدا کا یہ قول ’’ ھل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ مومن و کافر اور نیک و بد سب کو شامل ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہی کے ذریعہ دیا جائے۔ جس کے ساتھ نیکی کی جائے اسے اس کا بدلہ دینا چاہیے اور یہ اس کی تلافی نہیں ہے کہ جتنا اس نے احسان کیا تھا اتنا ہی احسان کرے بلکہ اس سے زیادہ احسان کرنا چاہیے، کیونکہ اگر اتنی ہی نیکی کرے گا جتنی اس نے کی تھی تو وہ برتری رکھتا ہے کیونکہ اس نے پہل کی تھی۔

مفردات میں راغب لکھتے ہیں : احسان عدل و انصاف سے بلند ہے کیونکہ عدل یہ ہے کہ انسان وہی ادا کرے جو اس کے ذمہ ہے اور وہی لے جو اس کا ہے اور احسان یہ ہے کہ اپنے فریضہ سے زیادہ انجام دے اور اپنے حق سے کم لے۔

خدا کے احسان کا بدلہ

سورۂ قصص میں ارشادہے: دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے تم اسے فراموش نہ کرو اور جس طرح خدا نے تم پر احسان کیا ہے اسی طرح نیکی کرو۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان کی آنکھیں ہمیشہ خدا کے احسان پر مرکوز رہتی ہیں اور وہ خدا سے احسان کی دعا کرتا رہتا ہے۔ اس سے نیکی کی توقع رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں پر کیوں احسان نہیں کرتا ہے؟ عفو و درگزر کے بارے میں ایسی ہی آیت سورۂ نور میں ہے:۔۔۔۔

مومنوں سے درگزر کرو اور ان سے چشم پوشی کرلو کیا تم کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ خدا تمہیں بخش دے۔

اس آیت کے یہ معنی بھی بیان کئے جاسکتے ہیں کہ خداوند عالم انسان کو بڑی عطا سے نوازتا ہے کہ جن کی اس کو اپنی زندگی میں ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ وہ عقل ایسی قوت عطا کرتا ہے جو ایک آدمی کی زندگی چلانے ہی کے لئے نہیں بلکہ ایک ملک کا نظم نسق چلانے کے لئے کافی ہے، علم سے نوازتا ہے کہ جو صرف انسان ہی و فائدہ نہیں پہنچتا ہے بلکہ پورے معاشرے کو فائدہ پہنچتا ہے، مال و دولت عطا کرتا ہے کہ جس سے وہ ایک بڑے اجتماعی منصوبہ کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے اس قسم کی الٰہی عطا کا مفہوم یہ ہے کہ یہ سب چیزیں آپ ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے آپ خدا کے نمائندے ہیں یہ آپ کو خدا نے اس لئے عطا کی ہیں تاکہ آپ کے ہاتھ سے اس کے بندوں تک پہنچائیے۔

دوسروں سے محبت کرنا

مذکورہ آیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن اس بات پر کتنا زور دیتا ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ نیکی کریں خاص طور سے ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے پر کہ جنھوں نے ہمارے ساتھ احسان کیا ہے حدیث کی کتابوں میں بھی اس سلسلہ میں کچھ دستورات بیان ہوئے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں :کافی میں ’’ ولا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘ کے عنوان سے ایک باب قائم کیا گیا ہے۔ اس کی پہلی حدیث یہ ہے:علی ابن بصیر۔۔۔۔۔۔یحبوک۔

ابو بصیر نے حضرت امام محمد باقر ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: قبیلہ بنی تمیم میں سے ایک دیہاتی رسول ؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی : مجھے نصیحت و وصیت کیجئے رسول ؐ نے اسے جو نصیحت اور وصیت کی تھی ان میں سے یہ بھی ہے کہ لوگوں سے محبت و دوستی کرو وہ بھی تم سے

محبت کریں گے۔

سماعہ نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا ایک تہائی عقل ہے۔

رسولؐ فرماتے ہیں : لوگوں سے محبت ودوستی کرنا نصف عقل ہے۔

ان حدیثوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے ہمیں دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا چاہیے خصوصا ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے ہمارے ساتھ نیکی کی ہے۔

رسول ؐ فرماتے ہیں : جس شخص کے ساتھ نیکی کی جائے اس کو چاہیے کہ اس کی تلافی کرے اور اگر اس کا بدلہ نہ دے سکے تو کم ازکم اسے یاد رکھے کیونکہ اس کو یاد رکھنا ہی اس کا شکر ادا کرنا ہے۔

آپؐ ہی کا ارشاد ہے: جو نیکی کا اہل ہے اس کے ساتھ نیکی کرو اور جو اہل نہیں اس کے ساتھ بھی نیکی کرو کیونکہ اگر تم اہل کے ساتھ نیکی کروگے تو وہ اس کا مستحق تھا اور وہ اس کا ہال نہیں ہے تو تم خوداس کے اہل ہو۔

بحث کے آخر میں ہم لفظ معروف کے معنی بیان کرنا چاہتے ہیں جو کہ امام زین العابدین ؑ کے بیان میں استعمال ہوا ہے: ’’حق ذی المعروف ‘‘ معروف ایک جامع اسم ہے یہ ہر اس فعل کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا حسن عقل و شرع سے ثابت ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو خدا کا مطیع ہو اور واجبات و مستحبات میں لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہو۔

معروف، منکر کی ضد ہے، معروف شرعا و عقلا واجب و مستحب افعال سے مخصوص ہے اس میں مباح داخل نہیں ہے کیونکہ مباح میں رجحان نہیں ہوتا ہے اور جس میں رجحان نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے اور معروف خیر ہی خیر ہے چنانچہ ابن عباس سے منقول ہے:

اہل معروف روز قیامت محشر میں آئیں گے تو ان کے معروف کی وجہ سے ان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور ان کے سب حسنات ایسے ہی باقی رہیں گے تو وہ اپنے حسنات ان لوگوں کو دیدیں گے جن کے گناہ حسنات سے زیادہ ہونگے چنانچہ وہ بھی اس کے نتیجہ میں بخش دیئے جائیں گے اسی طرح سب داخل جنت ہونگے، معلوم ہوا کہ لوگوں کے ساتھ نیکی کرنا دنیا و آخرت میں سب کو جمع کرتا ہے اور یہ احسان کرنے والے کے حق کو ادا کرنے کا نتیجہ ہے۔

موذن کا حق

لیکن موذن کا حق تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہیں تمہارے پروردگار کا یاد دلانے والا ہے اور تمہیں تمہارے حصہ کی طرف بلانے والا ہے اور جو فریضہ خدا نے تم پر واجب کیا ہے اس میں وہ تمہارا بہترین مددگار ہے تمہیں اس کی قدر اسی طرح کرنا چاہیے جس طرح تم اپنے محسن کی قدر کرتے ہو اگر تم اپنے گھر میں اس سے بدگمان ہوتو اس کے اس کام میں، بدگمانی نہ کرو جو کہ وہ خدا کے لیے کررہا ہے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے تمہارے لیء ایک نعمت ہے پس اللہ کی نعمت کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور ہر حال میں اس پر خدا کا شکر ادا کرو خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

اس حق کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اس بات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے کہ اس پرموذن کا حق ہے کیونکہ وہ ایک عظیم کام انجام دیتا ہے۔

۱۔وہ انسان کو اس کے رب کی یاد، دلاتا ہے۔

۲۔وہ اسے اس کے اس حصہ کی طرف بلاتا ہے جو نماز سے نصیب ہوتا ہے۔

۳۔ جو فریضہ خدانے اس پر واجب کیا ہے اس میں وہ اس کا بہترین مددگار ہے۔

بنابرایں اس کا شکریہ اس طرح ادا کرنا چاہیے جس طرح اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی خدانخواستہ کبھی گھر میں موذن سے خوش نہ ہو ا اور اس کو مطعون کرتا ہوتو اذان کے سلسلہ میں جو کہ امر خدا ہے اس سے بدظن نہیں ہونا چاہیے اور حسن سلوک یہ ہے کہ ہر حال میں اس کا شکریہ ادا کرے۔

وہ انسان جس کو رات دن الجھائے رہتے ہیں اور وہ خدا کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے تو یہ موذن ہی ہے جو خدا کے منادی کی طرح اسے نماز کے اوقات میں مادی لذتوں میں غرق ہونے سے نجات دیتا ہے وہی ہے جو اپنے روح افزا اور نجات بخش نغمہ سے اس کی دستگیری کرتا ہے اور اسے کمال و سعادت یعنی نماز کی ادائیگی کی طرف لے جاتا ہے۔ فقہ وحدیث کی کتابوں میں موذن کی بڑی عظمت بیان ہوئی ہے اور جتنا اس کا ثواب لکھا ہے اتنا شاید ہی کسی نیکی کا ثواب لکھا گیا ہو اسلامی فقہمیں اس کے لئے کچھ حقوق معین کئے گئے ہیں اب ہم انھیں کی شرح شروع کرتے ہیں :

اذان کے لغوی معنی

لغت میں اذان کے معنی الان اور خبردار کرنا۔ سورۂ توبہ میں ہے:۔۔۔۔لوگوں کے لئے یہخدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلان و آگاہی ہے۔ اسلام کی اذان کو اس لئے اذان کہا جاتا ہے کہ موذن بلند آواز سے نما ز کے وقت ہونے کا اعلان کرتا ہے سورۂ اعراف میں ارشاد ہے:۔۔۔۔ان کے درمیان ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا۔

تشریع اذان:

تشریع اذان اسی سال ہوئی تھی جس سال رسولؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی تھی، تشریع اذان کے سلسلہ میں اس کے علاوہ بھی کچھ اقوال ہیں، اذان کی تشریع کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی،پھر ان کے لئے اوقات نماز کی شناخت بھی مشکل تھی، انھوں نے آپس میں گفتگو کی کہ اوقات کی شناخت کے لئے کوئی علامت مقرر کی جائے تاکہ سب کو نماز جماعت کا ثواب مل جائے۔

بعض لوگوں نے کہا: ہر نماز کے وقت ناقوس بجا دیا جائے،ر سولؐ نے ان کی اس بات کو رد کردیا اور فرمایا: یہ کام نصاریٰ کرتے ہیں۔

دوسرے لوگوں نے کہا: بوق بجایا جائے، آنحضرت ؐ نے فرمایا: یہودیوں کا مذہب ہے، کچھ نے کہا دف بجا دیا جائے آپ نے فرمایا: دف روم والے بجاتے ہیں، چند لوگوں نے کہا: آگ روشن کردی جائے، رسولؐ نے فرمایا: یہ مجوسیوں کا شعار ہے، بعض نے کہا : پرچم بلند کردیا جائے، رسول ؐ خاموش ہوگئے اور کوئی بات طے نہ ہوسکی، رسولؐ حضرت علی ؑ کے گھر تشریف فرما تھے کہ جبریل نازل ہوئے اور خدا کی طرف سے مسلمانوں کو اذان کا حکم دیا۔

صدوق ؒ نے کتاب ’’ من لا یحضرہ الفقیہ‘‘ میں روایت کی ہے:

عن منصور بن حازم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فعلمہ۔

منصور بن حازم نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ جب جبرئیل نازل ہوئے تو اس وقت رسولؐ حضرت علی ؑ کے گھر میں ان کے پہلو پر سر رکھے سو رہے تھے، جبریل نے اذان و اقامت کہی اس کے بعد رسولؐ نے حضرت علی ؑ سے فرمایا: اے علی ؑ تم نے سنا؟ عرض کی ہاں اے اللہ کے رسولؐ فرمایا: یاد کرلی؟ حضرت علی ؑ نے کہا: ہاں فرمایا: یہ اذان بلال کو سکھا دو چنانچہ آپ نے بلال کو اذان سکھا دی۔

اذان کے فقہی احکام

ہر مردوعورت کے لئے مستحب ہے کہ وہ نماز پنجگانہ سے پہلے اذان و اقامت کہیں۔ المحکی۔۔۔۔۔الجماعۃ۔

جو مشہور سے حکایت ہوئی ہے (جیسا کہ بہت سے لوگوں سے نقل ہوا ہے کہ ) اذان و اقامت بطور مطلق مستحب ہے۔ لیکن کتاب جمل اور اس کی شرح، و مقنعہ، نہایۃ، مبسوط، وسیلہ، مہذب اور مفید کی کتاب احکام النساء میں لکھا ہے کہ واجب نماز جماعت میں اذان و اقامت کہنا مردوں پر واجب ہے۔

فقہا نے بعض جگہوں پر اذان و اقامت کو ساقط قرار دیا ہے اور وہ در ج ذیل ہیں :

۱۔روز جمعہ نماز عص کی اذان جب وہ ظہر یا نماز جمعہ کے ساتھ پڑھی جائے۔

۲۔روز عرفہ نماز عصر کی اذان اگر وہ ظہر کے ساتھ پڑھی جائے۔

۳۔شب عید الضحیٰ میں اس شخص کی نماز عشا کی اذان کہ جو مشعرالحرام میں ہو اور اس کو مغرب کے ساتھ پڑھے۔

۴۔مستحاضہ کی عصر و عشا کی نما ز کی اذان اسے چاہیے ان نمازوں کو بلا فاصلہ ظہر و مغرب کے بعد بجالائے۔

۵۔اس شخص کی نماز عصر و عشا کی اذان جو اپنا پیشاب و پائخانہ نہ روک سکتا ہو، ان پانچ نمازوں میں اس صورت میں اذان ساقط ہوتی ہے کہ ان نمازوں میں سے کسی بھی نماز کا پہلی نماز سے یا تو بالکل فاصلہ نہ ہو یا معمولی فاصلہ ہو۔

اذان و اقامت کے لئے فقہا نے کچھ شرائط بیان کئے ہیں :

۱۔ابتداء میں نیت کرے اور آخر تک اس نیت پر ثابت رہے بنابرایں اگر کوئی بغیرنیت کے اذان و اقامت دیتا ہے تو صحیح نہیں ہے۔

۲۔ایمان، موذن کو مومن ہونا چاہیے، عمار کی موثق حدیث، جو انھوں نے امام صادق ؑ سے نقل کی ہے، اس بات پر دلالت کررہی ہے لیکن بلوغ کی شرط نہیں جانا ہے خصوصا اس اذان میں جو صرف آگاہ کرنے کے لئے دی جاتی ہے ہاں جو اذان آگاہی کے لئے دی جاتی ہے اس کے لئے بعض فقہا نے لکھا ہے کہ موذن کا مرد ہونا شرط ہے۔ مردوں کی اذان و اقامت کے لئے بھی شرط ہے کہ موذن مرد ہو۔

۳۔اذان و اقامت میں ترتیب ہو۔

۴۔ اذان و اقامت کے جملے پے در پے کہے جائیں۔

۵۔ عربی میں کہی جائے۔

نماز کے علاوہ فقہا نے بعض ایسے مواقع بیان کئے ہیں جہاں اذان دینا مستحب ہے مثلاً:

۱۔پیدا ہونے والے بچہ کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنا مستحب ہے۔

۲۔وحشت ناک بیابان میں اس شخص کے لئے اذان دینا مستحب ہے جو دیو، جن اور بھوت پریت سے ڈرتا ہو۔

۳۔ جس شخص نے چالیس دن تک گوشت نہ کھایا ہو اس کے کان میں اذان کہنا۔

فقہ شیعہ میں اذان و اقامت مستحب موکد ہیں، بعض علماء سے نماز جماعت کے لئے اسے مردوں پر واجب جانا ہے۔ اہل سنت بھی اذان و اقامت کو مستحب جانتے ہیں، مالک، ابو حنیفہ او رشافعی کہتے ہیں : سفر وحضر میں ہر نماز کے لئے خواہ با جماعت ہو یا فرادیٰ اذان و اقامت مستحب ہے واجب نہیں ہے۔احمد بن حنبل کہتے ہیں : اذان و اقامت واجب کفائی ہے اسی طرح مالک و ابوحنیفہ کے اصحاب نے بھی اذان و اقامت کو واجب کفائی جانا ہے۔

اذان کے الفاظ میں اختلاف

شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ’’ حی علی الفلاح ‘‘ کے بعد دوبار ’’ حی علی خیر العمل ‘‘ کہا جائے لیکن اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ ’’ حی علی الفلاح ‘‘ کے بعددوبار ’’ الصلوٰۃ خیر من النوم‘‘ کہا جائے یہ اختلاف کہا ں سے ہوا؟ شیعہ کہتے ہیں کہ رسولؐ کے زمانہ میں ’’ حی علی خیر العمل ‘‘ کہا جاتا تھا خود رسولؐ بھی اذان میں ’’ حی علی خیر العمل ‘‘ کہتے تھے اور آپ کے بعد آپ کے اہل بیت اور ائمہ معصومین ؑ بھی ’’ حی علی خیر العمل ‘‘ کہتے رہے۔ حضرت علی ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:سمعت رسول اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں نے رسول ؐ سے سنا کہ فرماتے ہیں نماز تمہارا بہترین عمل ہے اور بلال کو حکم دیا کہ اذان میں حی علی خیر العمل کہے۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ جملہ رسولؐ کے زمانہ میں اذان کا جز تھا اور آنحضرتؐ بھی حی علی خیر العمل کہتے تھے لیکن عمر بن خطاب نے یہ حکم دیا کہ اس کی بجائے ’’ الصلٰوۃ خیر من النوم‘‘ کہا جائے۔ سعد الدین تفتازانی نے شرح العضد کے حاشیہ پر عمر سے روایت کی ہے: انہ۔۔۔۔ العمل۔

عمر بن خطاب نے کہا: عہد رسول ؐ میں تین چیزیں رائج تھیں میں نے انھیں حرام قرار دیتا ہوں اور ان سے منع کرتا ہوں، ایک حج تمتع، دوسرے متعہ اور تیسرے حی علی خیر العمل۔

علامہ قوشجی نے شرح تجرید میں بحث امامت کے آخر میں مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے اس میں اس جملہ ’’ اعاقب علیھن ‘‘ کا اضافہ کیا ہے یعنی اگر کوئی ان تینوں باتوں پر عمل کرے گا تو میں اسے سزا دوں گا ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ عم کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ خدا کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دیں ؟ کیا وہ خود کو مشرع سمجھتے تھے کہ حکم خدا میں جس طرح چاہے ردوبدل کریں ؟ اس کا جواب تو انھیں لوگوں کے پاس ہے جو ان کے معتقد ہیں۔

اذان کے کلمات

وسائل الشیعہ میں منقول بہت سی حدیثوں کے مطابق اذان میں چار مرتبہ اللہ اکبر، دو مرتبہ اشھد ان لا الہ الا اللہ، دو مرتبہ اشھد ان محمد الرسول اللہ، دو مرتبہ حی لی الصلوٰۃ، دو مرتبہ حی علی الفلاح، دو مرتبہ حی علی خیر العمل، دو مرتبہ اللہ اکبر، دو مرتبہ لا الہ الا اللہ کہا جاتا ہے۔ اشھد ان علیا حجۃ اللہ ووصی رسول اللہ وخلیفتہ بلا فصل اذان کا جز نہیں ہے لیکن مستحب ہے کہ ذکروایمان کے لئے کہا جائے۔

فلسفہ ٔ اذان امام رضا ؑ کی نظر میں

صدوقؒ نے امام رضا ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

انما امر الناس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔و۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بہت سی وجوہ کی بنا پر لوگوں کو اذان کا حکم دیا گیا ہے، ان میں سے ایک اس شخص کو خبردار کرنا ہے جو نماز کو بھول گیا ہے۔ غافلوں کو آگاہ کرنا اور جو شخص نماز کے وقت کو نہیں جانتا ہے اسے یہ بتانا کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ موذن اپنی اذان کے ذریعہ لوگوں کو خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہے اور نماز کی رغبت دلاتا ہے، وہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے، اپنے ایمان و اسلام کا اظہار کرتا ہے اور بھولے ہوئے لوگوں کو یاد دلاتا ہے۔

موذن کو اس لئے موذن کہتے ہیں کہ وہ نماز کا اعلان کرتا ہے۔ شروع میں تکبیر کہتا ہے اور آخر میں تہلیل کرتا ہے یعنی لا الہ الا اللہ کہتا ہے۔ چونکہ خدا کہتا ہے کہ ہر کام سے پہلے اس کا نام لیا جائے۔ لہٰذا اذان کے آغاز اور اس کے اختتام پر اللہ کا نام ہے، دو مرتبہ اس لئے کہا جاتا ہے تاکہ سامعین پر اس کا اثر ہو اگر پہلی مرتبہ سننے سے کوئی اثر نہ ہوا ہو تو دوسری مرتبہ سن کر ہوش میں آجائیں، اور چونکہ شہادتین ایمان کی بنیاد ہیں اس لئے دو

مرتبہ کہا جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہر حق کے لئے دو گواہ قرار دیئے گئے ہیں، جب بندہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کرچکا اور رسول ؐ کی رسالت کی گواہی دے چکا تو گویا اس نے تمام ارکان ایمان کا اقرار کرلیا کیونکہ ایمان کی بنیاد خداو رسولؐ کا اقرار کرنا ہے۔ شہادتین کے بعد نماز کی طرف بلایا جاتا ہے کہ دراصل اذان اسی کے لئے ہے، اذان کے درمیا ن یہ آواز نماز کی طرف ایک دعوت ہے، فلاح و کامیابی اور بہترین مل ’’ حی علی خیر العمل ‘‘ اور نام خدا پر اذان ختم ہے جیسا کہ آغاز بھی خدا کے نام سے ہوتا ہے۔

ثواب اذان

عن معاویہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الجنۃ۔

معاویہ بن وہب نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسولؐ فرماتے تھے :جو شخص مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر میں ایک سال تک اذان دیتا ہے اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔

عن سلیمان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔من اذن۔

سلیمان بن جعفر نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا :ایک شامی امام صادق ؑ کی خدمت میں حاضر ہوا امام صادق ؑ نے اس سے فرمایا: سب سے پہلے بلال جنت میں جائیں گے اس نے عرض کی کیوں ؟ فرمایا: اس لئے کہ انھوں نے سب سے پہلے اذان دی ہے۔

جابر جعفی نے امام محمد باقر ؑ سے روایت کی ہے:

قال رسول اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔الصفین۔

رسولؐ نے فرمایا: اذان دینے والا اس شخص کی مانند ہے جو راہ خدامیں اپنی تلوار کھینچ کر دو صفوں کے درمیان قتال کرتا ہے۔

قال علی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عناق۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : اذان دینے والے سربلندی کے ساتھ محشور ہونگے۔

صدوقؒ نے اپنی سند سے حدیث مناہی میں جعفر بن محمد سے اور انھوں نے اپنے آباء سے روایت کی ہے : قال۔۔۔۔۔۔الف ملک۔

رسول اللہ ؐ نے فرمایا: جس شخص نے خدا کی رضا کے لئے اذان دی خدا اسے چالیس ہزار شہیدوں اور چالیس ہزار صدیقوں کا اجر عطا کرے گا اور اس کی شفاعت سے میری امت کے چالیس ہزار گناہگار جنت میں جائیں گے، جان لو کہ جب موذن خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے تو اس وقت اس پر ستر ہزار فرشتے درود بھیجتے ہیں اور اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ اور روز قیامت وہ خدا کے عرش کے سایہ میں ہوگا یہاں تک کہ پروردگار خلائق کے حساب سے فارغ ہوگا اور رسول ؐ کی رسالت کی گواہی دینے کے ثواب کو چالیس ہزار فرشتے لکھتے ہیں۔

امام جماعت کا حق

لیکن پیش نماز کا تم پر یہ حق ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے تمہاے اور خدا ک یدرمیان رابطہ کی اور تمہیں تمہاے پروردگار کی طرف لے جانے کی ذمہ داری قبول کی ہے اس موقعہ پر وہ تمہاری ترجمانی کرتا ہے اس کی طرف سے تم کچھ بھی نہیں کہتے ہو، وہ تمہارے لئے دعا کرتا ہے تم اس کے لئے دعا نہیں کرتے ہو وہ تمہارے لئے طلب کرتا ہے، تم اس کے لئے طلب نہیں کرتے اس نے خدا کی بارگاہ میں کھڑے ہونے اور تمہارے لئے اس سے سوال کرنے کو اپنے ذمہ لیا ہے جب کہ تم نے اس کی طرف سے کوئی چیز اپنے ذمہ نہیں لی ہے اگر اس کام میں کوئی نقص ہوگا تو اس کا خمیازہ اسی کو بھگتا پڑے گا نہ کہ تم کو اگر وہ گناہ کرے گا تو اس کے گناہ میں تم اس کے شریع نہیں ہو اور اسے تم پر برتری نہیں ہے وہ

تمہاری سپر بن گیا ہے اور اپنی نماز کو اس نے تمہاری نماز کی سپر بنا دیا ہے۔ لہٰذا اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ خدا کی قوت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

آپ کے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ماموم کو یہ معلوم ہونا چاہیے : امام جماعت اس کے اور خدا کے درمیان واسطہ ہے اس کی طرف سے ایک ترجمان ہے وہ اس کی طرف سے دعا کرتا ہے، اس کی طرف سے سوال کرتا ہے وہ تضرع و زاری اور خوف کو برداشت کرتا ہے اگر عمل کی انجام دہی اور اس کی کیفیت میں کوئی کوتاہی اور نقص وارد ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار امام جماعت ہے۔ اس کے گناہ میں تم شریک نہیں ہو اور اس پر تمہیں کوئی فضیلت و برتری نہیں ہے بلکہ تمہاری اور تمہاری نماز کی حفاظت اس کے ذمہ ہے۔

اس بیان میں اصل موضوع بحث نماز نہیں ہے بلکہ پیش نما ز ہے۔ امام جماعت جو کہ محراب میں کھڑا ہے اس کی مثال سپہ سالار کی سی ہے اس نے مامومین کو شیطان سے جنگ کرنے کے لئے تیار کر رکھا ہے اور تمام مامومین کی توجہ کو خدا کی طرف مبذول کردیا ہے اور دلوں کے کارواں کو خدا کی طرف بڑھا دیا ہے اور ان کی زبان سے فروتنی اور انکساری کا اظہا کرادیا ہے اور اس نے نماز جماعت کے ذریعہ فقیر و نادار رئیس و غریب، زمیں دار و رعیت، کالے، گورے اور عالم و جاہل سب کو برابر کردیا ہے اور فخر وامتیاز کے راستوں کو بند کردیا ہے۔

نماز جماعت کا فلسفہ

خداوند عالم نے بعض عبادتوں کو اجتماعی صورت میں ایک خاص جگہ اور خاص زمانہ میں بجالانے کا حکم دیا ہے تاکہ مومنوں کو اس کی عبادت کی بجا آوری سے نفع و فائدہ حاصل ہو اور وہ کمال کے ر استہ کو طے کریں۔ نماز جماعت کے فوائد درج ذیل ہیں :

۱۔ ان لوگوں کے دلوں میں خدا کی عظمت و جلال، جلوہ گر ہوجاتا ہے کہ جو نماز جماعت کی صورت میں ایک مرتبہ رکوع میں جاتے ہیں، ایک ساتھ سجدہ میں سر رکھتے ہیں اور ایک ساتھ تشہد کے لئے بیٹھتے ہیں۔

۲۔ نماز جماعت سے مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔

۳۔ امام جماعت کی اقتداء کرنے سے دو سرے امور میں نظم و نسق اور میاہ روی کا طریقہ معلوم ہوجاتا ہے۔

۴۔ نماز جماعت کے ذریعہ اجتماعی روابط بڑھتے ہیں اور برادری و اخوت پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ نماز جماعت پڑھنے سے نمازیوں میں ایک دوسے پر ہر معاملہ میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

۶۔نماز کو اول وقت جماعت سے پڑھنا چاہیے کیونکہ یہ خدا کے تقرب اور دعاؤں کی مقبولیت کے لئے بہترین وقت ہے۔

۷۔ نماز، خصوصا جماعت کے ساتھ، انسان عالم مادہ اور دنیوی جنجال سے نجات حاصل کرلیتا ہے اور معنویت کے دریا میں اتر جاتا ہے۔ تکبیرۃ الاحرام کے ساتھ و ہساری چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے اس کے سامنے صرف خدا ہوتا ہے اور بس نماز جماعت سے مسجد یں اور عبادت گاہیں آباد ہوتی ہیں، ظاہری اعتبار سے بھی اور واقعی لحاظ سے بھی۔

۸۔ نمازیوں کو ایک دوسرے کے حالات سے اور جماعت کے ذریعہ ان کے درمیان محکم رشتہ استوار ہوجاتا ہے۔

۹۔ معاشرہ کے مختلف طبقوں، نادار و مالدار،کالے، گورے، غلام، آقا اور عالم و جاہل کا ایک صف میں جمع ہونا۔ نماز جماعت طبقاتی امتیاز، اونچ نیچ کے فق کو ختم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، نماز جماعت میں شریک ہونے کے سبب سے طبقاتی فرق کم ہوتا چالا جائے گا۔ یہ چیزیں ان حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں جن کی لوگوں کو نماز جماعت میں شرکت کی ترغیب دلائی گئی ہیں۔

اب ہم نماز جماعت کے ثواب سے متعلق حدیثیں سپرد قلم کرتے ہیں۔

نماز جماعت کی اہمیت اس کے آشکار ہونے میں ہے

وفی العلل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عزوجل۔

علل اور عیون الاخبار میں فضل بن شاذان سے اور انھوں نے امام رضا ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: نماز جماعت کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ توحید و اخلاص اور اسلام و عبادت کھلم کھلا خدا کے لئے ہو کیونک ان کے کھلم کھلا ہونے میں خدائے واحد کی مشرق و مغرب والوں پر حجت ہے تاکہ منافق اور ذلیل سمجھنے والے اس چیز پر عمل کریں جس کا انھوں نے زبان سے اقرار کیا ہے اسلام اور اس کے پابند ہونے کو دنیا پر واضح کریں تاکہ لوگوں کے لئے ان کے مسلمان ہونے کی گواہی دینا آسان ہوجائے، اس کے علاوہ بھی نماز جماعت کے بہت سے فوائد ہیں جیسے نیک کام میں ایک دوسرے کا تعاون کرنا اور خدا کی نافرمانی سے روکنا۔

نماز جماعت کی فضیلت سے متعلق دوسری حدیث میں وا رد ہوئی ہے:

عن ابی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خیرا۔

امام صادق ؑ نے اپنے پدر بزرگوار سے روایت کی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جوشخص پانچوں نمازوں کو جماعت سے پڑھتا ہے اس کے بارے میں نیک خیال رکھو۔

یہ وہی بات ہے جس کو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں، نماز جماعت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ نمازی ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، اس سے پہلے امام رضا ؑ کی حدیث میں بیان ہوچکا ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا نے نماز جماعت کا حکم اس لئے رکھا ہے تاکہ وہ کھلم کھلا لوگوں کے سامنے ادا کی جائے جس سے مشرق و مغرب والے اپنی آنکھوں سے اس حجت کو دیکھ لیں اس حدیث میں آپ نے تعاون و مدد کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ نماز جماعت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ معاشرہ میں بدکاریوں اور برائیوں کو نہیں پھیلنے دیتی بلکہ لوگوں کے درمیان فضائل و کمالات کو رواج دیتی ہے۔

میرزا جواد ملکی کی اسرار الصلٰوۃ سے اقتباس:

نماز جماعت کا اصلی فلسفہ خدا کے حکم کے بارے میں مومنوں کے دلوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے اس اتحاد کے بہت سے فائدے ہیں ان میں سے ایک اسلام کی طاقت و قوت بھی ہے۔ اس سے قطع نظر نماز جماعت کا نفوس کی تکمیل او رسیر الی اللہ میں ان کا قوی ہونا اور خدا ئی برکتوں کو اپنی طرف جذب کرنے میں بڑا اثر ہے کیونکہ اگر خدا کی رحمت ان میں سے کسی ایک کے شامل حال ہوگئی، خصوصا اس وقت جب ان کا اتحاد خدا کی رضا کے لئے ہو، تووہ رحمت ان سب کے شامل حال ہوگی اگرچہ دوسرے اس کے مستحق بھی نہ ہوں۔ اور دلوں کا آپس میں ملنا ہمارے لئے ایسا ہی ہے جیسے قلیل اور کم پانی دوسرے پانی سے مل جاتا ہے کہ اتصال کے بعد وہ کم نہیں رہتا ہے بلکہ کر ہوجاتاہے اب و ہ قلیل نجاست سے نجس نہیں ہوگا بلکہ اپنی جگہ پاک و طاہر رہے گا۔

مختصر یہ کہ اہم بات دلوں کا متحد ہونا ہے پس اگر کسی کو اس جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی توفیق نصیب ہوگئی کہ جس کے شرکاء کے دل راہ خدا میں متحد ہیں تو اسے اس ثواب کی امید رکھنا چاہیے جو نماز جماعت کے بارے میں احادیث میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی اس نماز جماعت میں شریک ہوتا ہے کہ جس کے شرکاء کے دلوں مھیں ایک دوسرے سے کینہ و حسد اور دشمنی ہے اور پھر یہ توقع رکھے کہ خدا اس کووہی ثواب عطا کرے گا جو کہ احادیث میں نماز جماعت کا بیان ہوا ہے تو وہ خود فریبی میں مبتلا ہے۔

جس پیش نماز نے اپنے دل کو پاک اور اپنے نفس کو مہذب و پاکیزہ بنا لیا ہے تو اس سے لا محالہ ہر شخص محبت کرے گا اور وہ بھی مومنین سے اس خدائی کی محبت کے تحت محبت کرے گ جس نے ان کے دلوں کو متحد کررکھا ہے، وہ ان سے اس سے زیادہ محبت کرے گ کہ جتنی وہ اس سے کرتے ہیں، نتیجہ میں ان کا نماز جماعت میں جمع ہونا خدا کے منشا کے مطابق ہوگا۔ ہاں اگر ایسی جماعت ہو کہ جس کے شرکاء کے بدن تو ایک دوسرے سے متصل ہوں لیکن دلوں میں افتراق ہو اور ایک دوسرے سے بدگمان ہوں اور اس نعمت پر حسد کرتے ہوں کہ جو خدا نے انھیں عطا کی ہے خصوصا اگر یہ بات امام و ماموم کے درمیان ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسی جماعت میں نوروصفا ہوگا اور خدا کے نزدیک اس جماعت کی قدروقیمت ہوگی، کیونکہ بہترین عبادت وہ ہے جو دلوں پرمثبت اثر کرے اور انھیں نورانی کردے۔

نماز جماعت کا ثواب

ابو سعید خدری نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا :نماز عصر کے بعد جبریل ہزارفرشتوں کے ساتھ نازل ہوئے اور فرمایا: اے محمد ؐ خدا آپ پر سلام بھیجتا ہے اور آپ کے لئے دو تحفے بھیجے ہیں جو کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے تھے۔ رسولؐ نے دریافت فرمایا: اے جبریل وہ دو تحفے کیا ہیں ؟پہلا : تین رکعت نماز وتر اور دوسرا پانچ وقت کی نمازوں کو باجماعت پڑھنا۔

رسولؐ نے جبریل سے دریافت کیا : نماز جماعت میں میری امت کے لئے کیا ثواب ہے؟ جبریل نے کہا: اے محمد ؐ! جب جماعت میں دو آدمی ہونگے تو ہر رکعت کا ثواب ایک سو پچاس رکعت کے برابر لکھا جائے گا اور اگر تین آدمی ہونگے تو خدا ہر رکت کا ثواب دو سو پچاس رکعت کے برابر لکھے گا اور اگر جماعت میں چار آدمی ہونگے تو خدا ہر رکعت کے لئے بارہ سو رکعت نماز کا ثواب لکھا جائے گا اور اگر جماعت میں پانچ آدمی ہونگے تو ہر رکعت کے لئے تیرہ سو رکعت کا ثواب لکھا جائے گا اور اگر جماعت میں چھ آدمی ہونگے تو ہر رکعت کے عوض چوبیس سو نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا اور جب جماعت میں سات آدمی ہوتے ہیں تو ہر رکعت کے عوض دو ہزار آٹھ سو نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا اور جب نما جماعت میں آٹھ آدمی ہوتے ہیں تو ہر رکعت کے عوض نو ہزار چھ سو نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا اور جب جماعت میں نو آدمی ہوتے ہیں تو ہر رکعت کے عوض انیس ہزار نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا اور اگر جماعت میں دس سے زیادہ ہوجائیں تو اگر زمین اور آسمان کے سارے دریا روشنائی بن جائیں اور سارے درخت قلم بن جائیں اور جن و انس اور فرشتے لکھیں تو اس کی ایک رکعت کا ثواب نہیں لکھ سکیں گے۔ اے محمد ؐ! جو تکبیر، مومن امام جماعت کے ساتھ کہتا ہے وہ اس کے لئے ستر ہزار مستحبی حج و عمرہ سے بہتر ہوتی ہے۔

دوسری روایت میں ہے:قلت لابی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الامام۔

میں نے امام صادق ؑ سے عرض کیا: کیا دو آدمیوں کے ساتھ بھی جماعت ہوجاتی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں دوسری آدمی کو امام جماعت کے دائیں جانب کھڑا ہونا چاہیے۔

دوسری حدیث جہنی کی ہے کہ وہ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: میں صحرا میں زندگی بسر کرتا ہوں۔ اذان ک یبعد میں عورتوں، بچوں اور نوکروں کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں کیا یہ نمازجماعت ہے ؟ فرمایا: ہاں۔

ان احادیث کے ہوتے ہوئے شیعیان امیر المومنین ؑ نماز جماعت کے ثواب کو کیوں چھوڑتے ہیں ؟ اگر چھوڑتے ہیں تو کیا یہ بدترین خسارہ و گھاٹا نہیں ہے۔

امام جماعت سے متعلق کچھ داستانیں

قپانچی نے، شرح رسالۃ الحقوق میں، نوادر ائمۃ الجماعۃ کے عنوان سے کچھ طنز آمیز داستانیں لکھی ہیں۔

۱۔ ایک دیہاتی پہلی صف میں امام جماعت کے پیچھے کھڑا تھا اس کا نام مجرم تھا امام جماعت نے ’’ آیہ الم نھلک الاولین کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ہم نے دوسروں کو ان سے ملحق کردیا وہ دیہاتی پہلی صف چھوڑ کر تیسری صف میں شامل ہوگیا امام جماعت نے آیۂ کذالک نفعل بالمجرمین ‘‘ ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں اس دیہاتی نے کہا: خدا کی قسم اس سے تمہاری مراد میں ہی ہوں، یہ کہہ کر اپنے جوتے اٹھائے اور مسجد سے نکل گیا۔

۲۔ابراہیم، موسیٰ اور حاج احمد تین بھائی تھے تینوں نے مل کر ایک مسجد بنائی اور اس میں ایک امام جماعت رکھا،اس کی تنخواہ وغیرہ کا انتظام بھی تینوں ہی کرتے تھے، ایک دن امام جماعت نے یہ آیت پڑھی : ان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔،نماز ختم ہونے کے بعدحاج احمدنے امام جماعت سے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ یہ مسجد ہم تینوں نے بنائی ہے اور اس کے اخراجات بھی ہم تینوں ہی برداشت کرتے ہیں ؟ امام جماعت نے کہا: ہاں مجھے معلوم ہے۔حاج احمد نے کہا: تو پھر نماز میں تم ان دونوں کو نام لیتے ہو اور میرا نام کیوں بھول جاتے ہو؟!

امام جماعت نے کہا: یہ قرآن ہے اس میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ حاج احمد نے کہا: یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھے ان دونوں سے محبت ہے، اگر آئندہ نماز میں میرا نام نہ لیا تو لاٹھی سے خبر لونگا، دوسری نماز میں امام جماعت نے صحف ابراہیم و موسیٰ وحاج احمد پڑھا۔ نماز کے بعد مامومین نے کہا: آپ نے قرآن میں حاج احمد کا نام کہاں سے بڑھا دیا؟ اس نے کہا: لاٹھی سے بچنے کی خاطر میں نے احمد کے نام کا اضافہ کردیا۔

۳۔ لکھا ہے کہ ایک امام جماعت نے ایک بالٹی خریدی حالت نماز میں اس کو سامنے رکھنے میں شرم محسوس ہوئی لہٰذا اس نے اسے پیچھے رکھ دیا یا رکوع میں گیا تو اسے بالٹی یادآئی۔ اس نے سوچا کہ شاید چور بالٹی چرالے گیا۔ اس نے سر اٹھایا، کہنا چاہتے تھا : ربنا لک الحمد، لیکن اس کی بجائے ربنا لک السطل، کسی ماموم نے کہا: ڈرو نہیں بالٹی تمہارے پیچھے رکھی ہے۔

۴۔ ایک شخص امام جماعت کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا تھا۔ امام جماعت سورۂ حمد بھول گیا۔ اس کے بدن میں لرزہ پیدا ہوگیا۔ اس نے کہا: اعوذ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔، ایک آدمی نے کہا: شیطان کی کیا خطا ہے، تم نماز بھول گئے ہو۔

ہم نشیں کا حق

ہم نشین کا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرواور اسے خوش آمدید کہو اور اس سے گفتگو کے دوران انصاف سے کام لو اس سے یک بیک توجہ نہ ہٹاؤ اور اس سے گفتگو میں تمہارا مقصد اسے سمجھانا ہو،اگر اس ہم نشینی میں تم نے پہل کی ہے اور اس کے ہمنشین بنے ہوتو تمہیں اختیار ہے کہ جس وقت چاہو اٹھو لیکن اگر اس نے تم سے ہمنشینی کا آغاز کیا ہے تواختیار اس کو ہے مگر یہ کہ تم اس سے اجازت حاصل کرو، خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مکارم الاخلاق میں یہ جملہ بھی ہے:

وتنسی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔خیرا۔

اس کی لغزشوں کو بھلا دو، اس کی نیکیوں کو یاد رکھو اور اس کی نیکی کے علاوہ کوئی بات نہ سنو؟ بنابرایں ہم نشیں کا حق یہ ہے کہ اس سے نرمی سے ملاقات کی جائے اورگفتگو کے دوران اس کے ساتھ انصاف کیا جائے، گفتگو کا مقصد اسے سمجھانا ہو اور اس کی ہمنشینی کی رعایت کی جائے اگر اس کے پاس جائے تو اس کی اجازت کے بغیر وہاں سے نہ اٹھے اور اگر وہ آئے تو اس کے پاس بیٹھے اور اس کی اجازت کے بغیر اسے چھوڑ کر نہ جائے۔

اس کی لغزش سے چشم پوشی کرے اور اس کے نیک کام کو مد نظر رکھے۔

امام زین العابدین ؑ نے اس رسالہ میں حق ہمنشیں، حق صاحب اور حق خلیط کو بیان فرمایا ہے: ممکن ہے تینوں لفظ ایک ہی معنی کے لئے استعمال ہوئے ہوں، لیکن ان میں کچھ فرق بھی ہے، جس کو ہم بیان کریں گے۔

انسان مدنی الطبع ہے

یہاں ہم نشیں سے مراد وہ شخص ہے جو ایک جلسہ میں کسی کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا ہو یا ہمیشہ ایک دوسرے کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہوں بہر حال ہم نشینی کے عنوان کے صادق آنے سے ایک کا دوسرے پر حق ہوجاتا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر ہر انسان کو ہم نشین، رفیق اور دوست کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ایک ساتھ زندگی گزارنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان کو تنہائی میں کوفت ہوتی ہے وہ خود کو بیگانہ محسوس کرتا ہے اس کے برخلاف وہ اچھے ہم نشین اور دوست کے ساتھ نشاط ومسرت محسوس کرتا ہے۔

انسان کی شخصیت میں دوست کا کردار

کسی بھی انسان کے دوست کا اس کی شخصیت اور اس کے دنیوی و اخروی امور میں بڑا کردار ہوتا ہے وہ اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر منفی یا مثبت اثر ڈالتا ہے یہی وجہ ہے کہ رسولؐ نے ہر آدمی کی شخصیت کا معیار اس کے دوست کی شخصیت کو قرار دیا ہے اور فرمایا: المر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہر شخص اپنے دوست و ہم نشیں کے دین پر ہوتا ہے اور جس شخص کا کوئی دوست نہیں ہوتا وہ بڑی مصیبت سے دو چار ہے حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : من فقد۔۔۔۔۔۔جس نے اپنے اس بھائی کو گنوا دیا کہ جس کو وہ خدا ک یلئے دوست رکھتا تھا اس نے اپنے بدن کے عظیم عضو کو گنوا دیا ہے۔

یہ بات تو واضح ہے کہ انسان کی زندگی میں دوست اہم کردار ادا کرتا ہے لہٰذا دوست و ہم نشیں کے انتحاب میں بہت زیادہ غوروفکر سے کام لینا چاہیے تاکہ دوستی میں دوام و استحکام پیدا ہو۔

شائستہ دوست کے انتخاب کا طریقہ

دوست کے انتخاب کے سلسلہ میں امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

من غضب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جو تمہارے اوپر تین بار غضبناک ہو اور اس کے باوجود تمہارے بارے میں کوئی غلط بات نہ کہے تو اسے دوست بنالو۔

پائیدار اور ناپائیدار دوستی:

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں :من اتخذ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جو شخص صحیح آزمائش و تجربہ ک یبعد کسی سے دوستی کرتا ہے اس کی دوستی پائیدار اور اس کی محبت استوار ہوتی ہے۔

قال علی ؑ:من۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : جو شخص آزمائے بغیر کسی سے دوستی کرتا ہے وہ شریرلوگوں کی رفاقت قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

برے لوگوں کی رفاقت کا اثر:

حضرت عبدالعظیم حسنی نے امام محمد باقر ؑ سے اور انھوں نے اپنے آباء سے روایت کی ہے کہ حضرت علی ؑ نے فرمایا:مجالسہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شریر لوگوں کی ہم نشینی نیک افراد سے بدظنی کا باعث ہوتی ہے۔

امام صادق ؑ اپنے آباء سے روایت کرتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا:

ثلاثۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تین قسم کے لوگوں کی ہمنشینی دل کو مردہ بنا دیتی ہے، پست اور فردمایہ لوگوں کی ہمنشینی، عورتوں سے گفتگو اور مالداروں کی ہمنشینی۔

مذکورہ دوحدیثوں میں جن لوگوں کی ہمنشینی سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ ان کی ہم نشینی دلوں کو مردہ بنا دیتی ہے، ان میں سے ایک تکبر کرنے والے مالد ا ر ہیں۔ دوسری حدیث میں امام محمد باقر ؑ نے مال دار کی ہمنشینی کے بارے میں یہ فرمایاہے:

عن ابی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نعمۃ۔

اے شخص ثروت مندوں کی ہم نشینی اختیار نہ کر کیونکہ اس کا غلط اثر جو کسی شخص پر ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ جس نعمت کو اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے اسے بھلا دیتا ہے اور اس کی نعمت وثروت پر نظر جما دیتا ہے اور اپنی نعمت سے غافل ہوجاتا ہے۔

دوسری حدیث میں رسولؐ فرماتے ہیں : مردوں کی ہم نشینی اختیار نہ کرو عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسولؐ کہ مردہ کون ہے؟ فرمایا: ہر فضول خرچ مالدار جو خدا سے غافل ہے وہ دنیا کی مادی زندگی میں گم ہے، اس کے لئے پیسہ ہی سب کچھ ہے، اس کا دل مردہ ہے اس میں حیات کی رمق نہیں ہے، اسی لئے رسول ؐ نے مردہ قرار دیا ہے، ظاہر ہے مردوں کی ہمنشینی اختیار کرنے سے انسان کا دل مردہ ہوجاتا ہے اس لئے رسولؐ نے ان کی رفاقت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ صدوق ؒ نے اپنی کتاب ’’ صفات الشیعہ ‘‘ میں امام محمد باقر ؑ سے اور آپ نے اپنے آباء سے روایت کی ہے کہ امیر المومنین ؑ نے فرمایا:

مجا لسۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاجرا۔

شریرلوگوں کی ہمنشینی نیک افراد سے بد ظنی کا باعث ہوتی ہے۔ اور نیک لوگوں کی ہم نشینی سے شریر بھی نیکوں سے ملحق ہوجاتے ہیں اور نیکوں کا بد کاروں کے پاس بیٹھنا انھیں بد کاروں سے ملحق کر دیتا ہے پھر جس کا معاملہ تم پر واضح نہ ہو جس کے دین کو تم نہ پہچانتے ہو تو اس کے ساتھی و ہمنشیں کو دیکھو اگر وہ دین خدا کے پابند ہوں تو وہ بھی دین خدا پر ہے اور اگر وہ دین خدا پر نہ ہوں تو اس کو بھی دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، رسولؐ فرماتے تھے : جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ کافر سے دوستی نہیں کرے گا اور نہ کسی بدکار کا ہم نشیں بنے گا، کیونکہ جو کسی کافر سے دوستی کرے اور کسی بدکار کے ساتھ رہے گا وہ بھی کافر و بدکار ہے۔

ان کی ہم نشینی اختیار کرو

امام زین العابدین ؑ نے اپنے بچوں سے فرمایا:

علی ابن الحسین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مجالسھم۔

دین و معرفت رکھنے والے لوگوں کی ہمنشینی اختیار کرو اور اگر ایسے افراد نہ ملیں تو تنہا رہ لینا کہ اس طرح محفوظ رہو گے اور اگر لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھنے پر مجبور ہوجاؤ تو اہل مروت کی رفاقت اختیار کرنا کہ وہ اپنی بزم میں بدگوئی وفحاشی کو داخل نہیں ہونے دیتے۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : من جالس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جو شک کرنے والوں کے پاس بیٹھے گا وہ بھی شکی ہوجائے گا۔

علماء کی ہم نشینی :

قال النبی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔المحبۃ۔

عالم کی ہم نشینی اختیار کرو وہ تمہیں پانچ چیزوں سے ہٹا کر پانچ چیزوں کی طرف بلائے گا:

۱۔شک سے یقین کی طرف۔

۲۔ریاسے، خلوص کی طرف۔

۳۔دنیا کی دلچسپی سے زہد اور اس سے بے رغبتی کی طرف۔

۴۔تکبر سے انکساری کی طرف۔

۵۔عداوت سے محبت کی طرف۔

اس حدیث سے علماء کی ملاقات اور انسان کی روح پر اس کا اثر واضح ہوجاتا ہے کیونکہ رسولؐ نے لوگوں کو علماء کے پاس نشست و برخاست کی ترغیب کی ہے۔

عقل مند دوست کا کردار

عن الصادق ؑ :۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اللبیب۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : سچے دوستوں کی تین قسمیں ہیں :

۱۔وہ دوست جو غذا و خوراک کی مانند ہیں کہ ان کی ضرورت زندگی میں ہر وقت ہوتی ہے،یہ عقلمند دوست ہیں۔

۲۔وہ دوست جو بیماری کی مانند ہیں ان سے نقصان پہنچتا ہے، یہ بے وقوف و احمق دوست ہیں۔

۳۔وہ دوست جو شفا بخش دوا کی مانند ہیں یہ نہایت ہی عقلمند دوست ہیں۔

معتصم ایک وزیر کا مہمان:

فضل بن مروان معتصم کا وزیر تھا، وہ اپنی لیاقت و تجربہ کاری اور ذہانت کی وجہ سے تمام وزیروں پر فوقیت لے گیا تھا۔ خلیفہ کی نگاہ میں اس کی بڑی قدر تھی، فضل نے لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس کی خلیفہ کی نظر میں بڑی وقعت ہے ایک روز عصرانہ خلیفہ کی دعوت کے اہتمام میں، فضل نے اپنے محل میں قیمتی قالین بچھائے رنگ برنگے پھولوں کے گلدستہ سجائے، سونے چاندی کے برتن فراہم کئے، ایک سے ایک شیریں پھل مہیا کیا : جب خلیفہ اس کے محل میں داخل ہوا تو اس کو بھی رشک ہوا اور وہ یہ بہانہ بنا کر واپس چلا گیا کہ میرے دل میں درد ہورہا ہے۔

اس حادثہ کے رونما ہونے سے وزیر کی پریشانی بڑھ گئی وہ سمجھ گیا کہ ان چیزوں کا الٹا اثر ہوا ہے وہ اس کی تلافی کی تدبیر کرنے لگا، اس نے یہ صورت حال اپنے صمیمی اورذہین و ہوشیار ابراہیم موصلی سے بیان کی جو کہ اس دعوت میں مدعو تھا۔ ابراہیم نے لمحہ بھر کے لئے غور کیا اور پھر وزیر سے کہا: تم خلیفہ کا ساتھ نہ چھوڑو بلکہ بدرقہ کے بطوران کے ساتھ جاؤ، دربا ر میں جاؤ اور میرے خط کا انتظار کرو اور جب میرا خط پہنچے تو اسے خلیفہ کے سامنے پڑھنا۔

وہ اپنے دوست کے مشورہ کے مطابق خلیفہ کے بدرقہ میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد اسے ایک خط دیا گیا، خط میں لکھا تھا: قالین اور آرائش کرنے والے آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں : خلیفہ صاحب کی آمد و تشریف آوری کا پروگرام ختم ہو چکا اب ہم اپنا اپنا سامان لے جائیں ؟ معتصم نے معلوم کیا: کیسا خط ہے؟ کیا لکھا ہے؟ وزیر نے خط کا مضمون معتصم کو سنا دیا۔ خلیفہ کی بد گمانی ختم ہوگئی اور اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ یہ سامان تو

عاریت تھا! مختصر یہ کہ عقلمند دوست نے اپنے دوست کو مصیبت میں مبتلا ہونے سے بچا لیا۔

اچھے دوست کے صفات

امام صادق ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: دوستی کے کچھ حدود ہیں پس جس میں وہ حدود وصفات نہ پائے جاتے ہوں اسے دوست نہ سمجھ اور وہ صفات و معیار یہ ہیں : اول یہ کہ تمہارے بارے میں اس کا ظاہر و باطن ایک ہو دوسرے وہ تمہاری زینت کو پانی زینت اور تمہای برائی کو اپنی برائی سمجھتا ہو، تیسرے یہ کہ مال دنیا اور اس کی آرائش اسے تمہارے بارے میں منقلب نہ کرے چوتھے یہ کہ جو کچھ اس کے اختیار میں ہے وہ اس سے تمہیں محروم نہ کرے پانچویں یہ کہ وہ تمہیں حوادث کے حوالے نہ کرے، یہ ہیں اچھے رفیق و دوست کے صفات اگر ان صفات کا حامل کوئی انسان مل جائے تو اس سے ضرور دوستی کرنا چاہیے۔

انبیاء، تہی دست یا پاک دل لوگوں کی ہمنشینی :

ان لوگوں کی ہم نشینی اختیار کرو جو صبح اور عصر کے وقت اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اسی کی رضا کے طلبگار ہوتے ہیں اور دنیا کی سج دھج کی بنا پر ان لوگوں سے آنکھیں نہ پھراؤ اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے،جواپنے نفسوں کی پیروی کرتے ہیں جن کے کام میں شدت پائی جاتی ہے۔

اس آیت سے ہم عظیم و شریف لوگوں کے معیار سے واقف ہوتے ہیں۔ اس آیت کی شان نزول یہ بیان ہوئی ہے: کچھ ثروت مند مستکبرین رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے، سلمان، ابوذر، صہیب اور خباب وغیرہ ایسے مومنوں کی طرف اشارہ کرکے کہا: اے محمد ! آپ صدر مجلس میں تشریف فرما ہیں اور یہ لوگ کہ جن کی بدبو ہمارے مشام میں چڑھی جاتی ہے اور موٹے و سخت لباس پہنے ہوئے ہیں اگر آپ ان کو اپنے پاس سے ہٹا دیں تو ہم آپ کے قریب آجائیں اور آپ کی بزم میں شریک ہوں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: اے رسول ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آنا، آپ تو انھیں کو اپنے پاس بٹھائیے جو صرف خدا کی رضا کے طلبگار ہیں اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کیجئے کہ جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا رکھا ہے۔

مذکورہ آیت طبقاتی اور امتیازی فکر کو کچل دیتی ہے اور مالدار و غریب لوگوں کے درمیان ارتباط پیدا کرتی ہے اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ ہوس پرستی اور خدا سے غفلت کے درمیان ایک رابطہ ہے، جولوگ ہوس پرست ہیں وہ خدا سے غافل ہیں اور جو خدا سے غافل ہیں انھیں اپنے پاس نہ بٹھاؤ بلکہ ان لوگوں کو اپنے پاس بٹھاؤ جو صبح و شام خدا کو پکارتے ہیں۔

جس طرح خدا نے رسولؐ سے فرمایا ہے کہ اپنی بزم میں متقی اور شیف لوگوں کو جگہ دیجئے اور ان کا احترام کیجیء اسی طرح اس بیان میں امام زین العابدین ؑ نے ہم نشیں کے حق کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کا احترام کرنا چاہیے اور ان سے ادب کے ساتھ گفتگو کرنا چاہیے اور ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا چاہیے اور رخصت کرتے وقت بھی ان کے احترام کا پورا خیال رکھنا چاہیے۔

ہمسایہ کا حق

ہمسایہ کا حق یہ ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرو اور اس کی موجودگی میں اس کا احترام کرو اور ہر حال میں اس کی مددو معاونت کرو اس کے راز کی ٹوہ میں نہ رہو اور اسکی کمزوریوں کی تلاش میں نہ رہو پھر اگر نہ چاہتے ہوئے بھی آسانی سے تمہیں اس کی کوئی کمزوری معلوم ہو جائے تو تم اس کے لئے محکم و مضبوط قلعہ اور ایسا ضخیم و دبیز پردہ بن جاؤ کہ اگر اسے نیزوں سے بھی تلاش کیا جائے تو بھی اس کا سراغ نہ

ملے کیونکہ وہ پیچیدہ اور مستور ہے اور اس کے خلاف باتوں پر کان نہ دھرو کہ اس کو خبر تک نہ ہو اور اسے سختیوں اور مشکلات میں چھوڑ کر الگ نہ ہو جاؤ اور جب اس کے پاس کوئی نعمت دیکھو تو اس پر حسد نہ کرو۔ اس کی لغزشوں سے درگزر اور اس کے گناہوں سے چشم پوشی کرو اور اگر وہ تمہارے بارے میں جہالت کر بیٹھے تو تم اسے برداشت کرو اور اس کے ساتھ مسالمت و صلح آمیز برتاؤ کرو، اس پر سب و شتم نہ کرو اور اگر کسی ناصح نے اسے دھوکا دیا ہے تو تم اس کا سد باب کرو اس کے ساتھ شریف کی طرح بسر کرو اور جان لو کہ خدا کی قدرت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

جار کے معنی اور اس کا محل استعمال

جار ہمسایہ کو کہتے ہیں، قرآن مجید کے سورۂ نساء میں یہ لفظ نزدیک اور دور کے ہمسایہ کے لئے استعمال ہوا ہے کیونکہ ایک دوسرے کے پڑوس میں ہیں قرآن مجید میں ’’ قطع متجاورات ‘‘ یہ ایک دوسرے سے نزدیک ٹکڑے ہیں۔

پھر قرآن مجید میں پناہ لینے کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔

وان احد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور اگرمشرکوں میں سے کوئی پناہ طلب کرے تو اسے امان دو۔

اجارہ اور استجارہ جار سے مشتق ہے جو امان و ہمسایہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے گویا ہمسایہ، ہمسایہ کی امان میں ہے۔ راغب لکھتے ہیں : چونکہ ہمسایہ کا حق عقلی اور شرعی لحاظ سے عظیم ہے لہٰذا جس کا حق عظیم ہے یا جو دوسرے کے حق کو عظیم سمجھتا ہے اسے جار کہتے ہیں : مثلا لا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یعنی میں تمہارے لئے پناہ گاہ ہوں اور تمہارے حق کو عظیم سمجھتا ہوں خدا نے نزدیک اور دور کے ہمسایہ کی تصریح کی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں قرآن کیا کہتا ہے۔

قرآن میں ہمسایہ کے حقوق

واعبداللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایمانکم۔

یہ آیت اسلامی حقوق کو بیان کرتی ہے خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا اسی طرح لوگوں کے ساتھ معاشرت کے آداب کو بیان کرتی ہے، کلی طور پر آیت سے دس احکام سمجھ میں آتے ہیں ان میں سے ایک ہمسایہ بھی ہے۔ ’’ والجار ذی القربیٰ ‘‘ یعنی قریبی ہمسایہ۔

قریبی ہمسایہ کے کیا معنی ہیں ؟

اس سلسلہ میں مفسرین نے مختلف احتمال دئیے ہیں بعض نے کہا ہے کہ وہ ہمسایہ مراد ہیں جو عزیز ورشتہ دار بھی ہیں لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں کیونکہ اس آیت کے پہلے جملوں میں عزیزوں کے حقوق کی طرف اشارہ ہوا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ ہمسایہ ہیں جن کے مکان نزدیک ہیں نزدیک والے ہمسایہ کے حقوق زیادہ ہیں یا وہ ہمسایہ مراد ہیں جو دین و مذہب کے اعتبار سے انسان سے زیادہ قریب ہیں۔

’’ والجار الجنب ‘‘ دور کے ہمسایہ، یہاں بھی مکان کی دوری مراد ہے کیونکہ حدیث کی رو سے گھر کے چاروں طرف کے چالیس گھروں تک ہمسایہ شمار ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وارد ہونے والی احادیث کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔ لفظ ہمسایہ کا مفہوم محدود ہے جو نزدیک کے ہمسایہ ہی کو سمجھا جاتا ہے لہٰذا اسلام کی رو سے اس کے مفہوم کی وسعت کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ دور کے ہمسایوں کے ناموں کی تصریح کی جائے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ دور کے ہمسایوں سے غیر مسلم مراد ہوں کیونکہ ہمسایہ کا حق صرف مسلمان ہمسایوں ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ غیر مسلم کو بھی شامل ہے ہاں جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔

یہ تھا نزدیک و دور کے ہمسایوں کے بارے میں قرآن کا نظریہ، اب ہم اس سلسلہ میں نبی ؐ اور ائمہ معصومین ؑ سے وارد ہونے والی احادیث کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ہمسایہ کے حقوق حدیث کی روشنی میں

ہمسایہ کے حق، اس کے احترام اور انسان کی زندگی کے امن وامان میں جو ہمسایہ کا کردار ہوتا ہے اس کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں بہت سی حدیثیں بیان ہوئی ہیں :

قال رسول ؐ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سیورثہ۔

رسول ؐ فرماتے ہیں جو شخص اپنے گھر کا دروازہ اس لء یبند کرتا ہے کہ اسے ہمسایہ سے اپنے اہل و مال کا خوف ہوتا ہے تو اس کا ہمسایہ مومن نہیں ہے۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول ہمسایہ کا ہمسایہ پر کیا حق ہے؟ فرمایا: اس پر اس کا معمولی حق یہ ہے کہ اگر وہ قرض مانگے تو اسے قرض دے، اگر مدد طلب کرے تو اس کی مدد کرے اور اگر کوئی چیز عاریتہ طلب کرے تو عاریت دے اور اگر اسے عطا و بخشش کی ضرورت ہوتو اسے عطا وبخشش سے نوازے، اگر وہ دعوت کرے تو اسے قبول کرے اگر وہ مریض ہوتو اس کی عیادت کرے،اگر اس کا انتقال ہوجائے تو اس کے جنازہ میں شریک ہو اگر اسے کوئی اچھی چیز نصیب ہوتو خوشی منائے اس پر حسد نہ کرے اور اگر اسے کوئی صدمہ پہنچے تو اس پر غم منائے اور اس کے گھر سے اونچا گھر نہ بنائے کہ جس سے اس کے گھر کا حصہ نظر آئے اور اسے تکلیف ہو اور اس کے گھر کی کھڑکیوں کو بند نہ کرے تاکہ اس کے گھر میں صاف ستھری ہوا جائے۔ اگر کوئی چیز خرید کر اپنے گھر ہدیہ کے طور پر لے جائے تو اس میں سے اسے بھی ہدیہ دے بشرطیکہ اسے یہ معلوم ہو کہ اس کے پاس نہیں ہے یا اس چیز کو چھپا کر اپنے گھر لے جائے کہ جس سے ہمسایہ اور اس کے بچے اسے نہ دیکھیں پھر فرمایا: جو میں تم سے بیان کر رہا ہوں اسے خوب اچھی طرح کان کھول کر سن لو، ہمسایہ کا حق وہی معدودے چند افراد ادا کرتے ہیں جن پر خدا نے رحم کیا ہے خدا نے ہمسایہ کے بارے میں مجھے اتنی تاکید فرمائی ہے کہ میں یہ سوچنے لگا : ہمسایہ انسان کے وارثوں میں ہے۔

رسولؐ کے اس جامع بیان میں تین اہم نکات ہے۔ پہلا نکتہ ہمسایہ کی ثروت و عزت کا تحفظ ہے اصولی طور پر ہر انسان کا گھر اس کے لئے امن و چین کا مرکز ہے۔ اگر یہاں یہ بھی بے امان ہوجائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ محفوظ ترین جگہ سے محروم ہوگیا ہے اور یہ ہر فرد بشر کا حق ہے اس کو برباد نہیں ہونا چاہیے۔

رسولؐ فرماتے ہیں : اگر کسی شخص کا طرز زندگی ایسا ہے کہ جس سے اس کے ہمسایہ کو خطرہ لاحق ہے تو وہ سچے مومنوں کی فہرست سے خارج ہوگیا ہے۔ کسی نے دریافت کیا: ہمسایہ کا ہمسایہ پر کیا حق ہے؟

رسولؐ نے حقوق بیان فرمائے:

اس حدیث میں رسولؐ نے دوسرا نکتہ یہ بیان فرمایا ہے کہ اتنا اونچا گھر نہ بناؤ کہ جس سے اس کے گھر کی بے پردگی ہوتی ہو واضح رہے کہ جس زمانہ میں رسول اکر مؐ رسول کی حیثیت سے آئے تھے اس زمانہ میں اونچی اونچی عمارتیں نہیں بنتی تھیں کم ازکم حجاز اور مکہ میں ایسے مکانات نہیں تھے لیکن رسول ک کے دستورات اور ان کا دین ہر جگہ اور ہر زمانہ کے لئے تھا اسی لئے آپ نے فرمایا کہ ہمسایہ کے گھر کو اتنا بلند اور اونچا نہیں ہونا چاہیے جس سے دوسرے کے گھر کا صحن وغیرہ نظر آئے۔ یہ اسلام کے دستورات کی جامعیت کا ایک راز اور دین مبین کی حقانیت کی سند ہے۔

آج کا معاشرہ جن مشکلات سے دوچار ہے ان میں سے ایک رہائش اور زندگی بسر کرنے کے لئے محفوظ جگہ کی تلاش بھی ہے اس مشکل

سے ہمارا ملک ہی نہیں بلکہ دنیا کے اکثر ممالک دوچارہیں اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لاینحل ہے یا اس کا حل تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ مغربی تہذیب نے کئی کئی منزلہ کالونیاں تعمیر کرائی اس کے برے نتائج بھی بھگتے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں بھی اس کا رواج ہوگیا ہے اور اس کے بھیانک نتائج پر توجہ نہیں ہے۔

حدیث کے آخر میں تیسرا نکتہ یہ بیان ہوا ہے کہ جو چیز اپنے بچوں کے لئے خریدے اگر وہ ہمسایہ کے یہاں نہ ہوتو اس کے لئے بھی خریدے یا اسی میں سے کچھ حصہ اسے دیدے خصوصا ان چھوٹے بچوں کو دیدے جو وہاں موجود ہوں اور اگر انھیں نہیں دینا چاہتا تو اسے چھپا کر گھر لے جائے کیونکہ رسولؐ نے اس کی تصریح کی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کی رسولؐ نے ہمسایہ کے حق میں رعایت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

ہمسایہ کو آزردہ کرنا حرام ہے:

عن ابی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جارہ۔

امام صادق ؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ملعون ہے وہ شخص جو اپنے ہمسایہ کو ستائے اس کے برخلاف ہمسایہ کو خوش کرنا گناہوں کی بخشش کا سبب ہے:

القطب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔غفرلہ۔

قطب راوندی نے لب اللباب میں روایت کی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جو شخص دنیا سے رحلت کرے اور اس سے اس کے تین ہمسائے راضی ہوں تو اسے بخش دیا جائے گا۔

قال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جارہ۔

رسول ؐ کا ارشاد ہے: جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے ہمسایہ کو نہ ستائے۔

قال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔امہ۔

آپ ہی نے فرمایا: ہمسایہ، ہمسایہ کے لئے ایسے محترم ہے جیسے اس کے لئے اس کی ماں محترم ہے۔

ہمسایہ سے شکایت:

وعنہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جارہ۔

امام صادق ؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک شخص نے رسولؐ سے اپنے ہمسایہ کی شکایت کی رسولؐ نے اس کی طرف سے منھ پھیر لیا وہ دوبارہ آپ کے سامنے آگیا۔ رسول نے علی ؑ، سلمان اور مقداد سے فرمایا: جاؤ اور کہدو کہ جو شخص اپنے ہمسایہ کو اذیت دیتا ہے اس پر خدا اور فرشتوں کی لعنت ہے۔

ہمسایہ کے ساتھ نیک برتاؤ:

قال رسول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الدیار۔

رسولؐ نے فرمایا: ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنا رزق میں اضافہ کا اور شہروں کی آبادی کا سبب ہے۔

فقہ الرضا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یرثنی۔

فقہ الرضا میں امام رضاؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جو تمہارا ہمسایہ ہو اس کے ساتھ اچھی ہمسائیگی کا مظاہرہ کرو کیونکہ خداوند عالم

ہمسایہ کے بارے میں تم سے سوال کرے گا۔ رسولؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: خداوند عالم نے ہمسایہ کے بارے میں مجھے اتنی تاکید کی ہے کہ میں یہ سوچنے لگا وہ میری میراث میں پائے گا۔

ہمسایہ کی خبر رکھو:

عن النبی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جائع۔

رسول سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: و ہ شخص مومن نہیں ہے جو شکم سیر ہو اور اس کے جواروپڑوس میں اس کا ہمسایہ بھوکا ہو۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

ما آمن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عاری۔

وہ شخص میرے اوپر ایمان نہیں لایا جو شکم سیر کے ساتھ رات بسر کرے اور اس کا ہمسایہ بھوکا ہو اور وہ شخص میرے اوپر ایمان نہیں لایا جس نے لباس پہنے ہوئے رات بسر کی ہو اور اس کا ہمسایہ برہنہ ہو۔

حضرت علی بن ابی طالب ؑ نے اپنے مقرکردہ حاکم عثمان بن حنیف کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا:

ابیت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حریٰ

کیا میں اس حال میں زندگی بسر کروں کہ میرا شکم پر ہواور میرے اطراف میں بھوکے پیٹ اور پیاسے دل موجود ہوں۔

برا ہمسایہ:

عن رسول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سرہ۔

رسولؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: میں اس برے ہمسایہ سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں کہ جس کے جوار میں گھر ہو، اس کی دونوں آنکھ تمہیں دیکھتی ہیں اور اس کا دل تمہارے چکر میں رہتا ہے اگر تمہیں کوئی نیکی اور فائدہ پہنچتا ہے تواسے اس سے تکلیف ہوتی ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف و نقصان پہنچتا ہے تو اسے اس سے مسرت ہوتی ہے۔

خریدنے سے پہلے ہمسایہ کی تحقیق:

عن النبی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔الطریق۔

رسولؐ نے فرمایا: گھر خریدنے سے پہلے اپنے ہمسایوں کی تحقیق کرلو اور سفر پر جانے سے قبل کوئی ہم سفر تلاش کرلو۔

ہمسائیگی کی حد

عن ابی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جوانبھا۔

امام صادق ؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: امیر المومنین ؑ کا ارشاد ہے: مسجد کا حریم چالیس گھروں تک اور ہمسایہ کی حد بھی چاروں طرف چالیس گھروں تک ہے۔

ہمسایہ کے حق کے سلسلہ میں امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : تمہارے گھر چاروں طرف چالیس گھروں تک تمہارا ہمسایہ ہے۔ تمہیں ان کے حقوق کا لحاظ رکھنا چاہیے اور ان کے ساتھ صلح و صفائی کی زندگی بسر کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں خدا ہی سے توفیق طلب کرنا چاہیے۔

ساتھی کا حق

لیکن تمہارے رفیق او رساتھی کا حق یہ ہے کہ جہاں تک تم سے ہوسکے اس کے ساتھ بخشش و فضل کرتے رہو اور اگر یہ نہ کرسکو تو کم از کم اس ک یساتھ انصاف سے کام لو اور جس طرح وہ تمہارا احترام و اکرام کرتا ہے اسی طرح تم بھی اس کا احترام و اکرام کرو، جس طرح وہ تمہاری حفاظت کی کوشش کرتا ہے اسی طرح تم بھی اس کی حفاظت کی کوشش کرو کسی بھی اچھے کام میں اسے تم سے آگے نہیں جانا چاہیے اور اگر وہ تمہارے اوپر سبقت لے گیا تو تم اس کی تلاف کرو اور اسے اتنی محبت دینے میں دریغ نہ کرو کہ جتنی کا وہ مستحق ہے، تم اپنے اوپر یہ لازم کرلو کہ اس کے خیر خواہ محافظ اور اپنے رب کی طاعت میں اس کے مددگار رہو گے اور اس سلسلہ میں اس کی مدد کروگے کہ وہ اپنے پروردگار کی معصیت کا ارادہ بھی نہیں کروگے پھر تمہیں اس کے لئے محبت کا سرمایہ ہونا چاہیے نہ کہ عذاب کا، خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

امام زین العابدین ؑ کے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔جہاں تک تم سے ہوسکے اس پر فضل وکرم کرتے رہو، کم از کم اس کے ساتھ انصاف کرو۔

۲۔جس طرح وہ تمہارا احترام کرتا ہے اسی طرح تم بھی اس کا احترام کرو اچھے کام میں تم اس سے پیچھے نہ رہو اور اگر وہ تم سے آگے بڑھ جائے تو اس کا خیال رکھو اور اس کی تلافی کرو۔

۳۔اس کی دوستی و محبت میں اور اپنے پروردگار کی طاعت میں اس کی مدد کرنے میں کوتاہی نہ کرو۔

۴۔ اسے ہمیشہ گناہوں کے ارتکاب اور خدا کی معصیت کے ارتکاب سے باز رکھو اور اس پر لطف و رحم کرو، عذاب و سختی نہ کرو۔

صحبت کے معنی رفاقت اور ساتھ رہنا ہیں اور صاحب کے معنی رفیق و ساتھی کے ہیں۔ راغب کہتے ہیں عرف میں اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو زیادہ ساتھ رہتا ہے۔

یا صاحبی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔القہار۔

یوسف نے کہا: اے میرے قید کے ساتھیوں، متفرق خدا بہتر ہیں ایک قہار خدا ؟ ما۔۔۔۔۔۔۔ یہاں صاحبہ سے مراد صاحبہ ہی ہے : ماضل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

صاحبکم سے رسول مراد ہیں۔ اصحاب اس کی جمع ہے یعنی رفیق اور ساتھی، لفظ اصحاب قرآن میں ۷ بار استعمال ہوا ہے اکثر جنت و جحیم کے ساتھ آیا ہے اصحاب السبت، اصحاب مدین، اصحاب کہف، اصحاب الیمین، اصحاب الفیل وغیرہ بھی استعمال ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ صاحب کے معنی ہیں : دوست، جیسا کہ حضرت یوسف نے اپنے قید کے ساتھیوں کو دوست کہا ہے اور قرآن نے رسولؐ کو لوگوں کا دوست قرار دیا ہے۔ لہٰذا اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں صاحب یا مصاحب اس شخص کو کہتے ہیں جو انسان کے ہمراہ ہم سفر ہوتا ہے یہ ہمراہی خواہ قلیل مدت کی ہو یا طولانی مدت کی اس مصاحبت و رفاقت سے ایک دوسرے پر کچھ حقوق عائد ہوجاتے ہیں انھیں ادا کرنا ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔

خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے:

انسان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی عادت اختیار کرتا ہے، وہ دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے اور دوسرو ں کا اثر قبول کرتا ہے، انسان کی شخصیت سازی کے طریقوں میں سے ایک طریقہ دوسروں کے اخلاق و عادات کا قبول کرنا بھی ہے اسی بنا پر قرآن مجید نے انسانوں کو خبردار کیا ہے اور قیامت کے ایک منظر کو بیان کیا ہے کہ انسان کو وہاں یہ معلوم ہوجائے گا کہ وہ اپنے دھوکے باز اور نادان دوستوں کی بنا پر گمراہ ہواہے لہٰذا وہاں وہ یہ تمنا کرے گا کہ اے کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔لیکن اس کو اس افسوس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، قرآن مجید فرماتا

ہے:

ویوم یعض۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خذولا۔

جس دن ظالم افسوس کے مارے اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا اے کاش میں نے رسول ؐ کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا وائے ہو میرے اوپر اے کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا اس نے مجھے حق کے ذکر سے گمراہ کردیا ہے جب کہ اس کی خبر مجھ تک آئی تھی اور شیطان انسان کو ہمیشہ ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ ان آیتوں میں یہ بیان ہوا ہیکہ قیامت میں انسان پر کیا بیتے گی یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ جس سے انسان اپنے گمراہ دوست کی وجہ سے دوچار ہوگا، یعض، عض سے مشتق ہے یعنی دانت سے کاٹنا یہ جملہ زیادہ تر ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو زیادہ حسرت و افسوس کی بنا پر بے چین ہوتے ہیں ان آیتوں نے تو قیامت کے حلات کی نقشہ کشی کی ہے لیکن بہت سے لوگ دنیوی زندگی میں بھی دوست کی بنا پر نقصان اٹھاتے ہیں اور عزت گنوا دیتے ہیں۔

احادیث کی روشنی میں نااہل دوست

انسان کو اس قسم کی حسرت و یاس سے بچانے کے لئے احادیث میں بعض لوگوں کی رفاقت و ہم نشینی سے روکا گیا ہے ان احادیث میں سے بعض یہ ہیں :

عن علی ؑ :۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تعلم۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : ناہنجار دوست اور برے آدمی کی صحبت اختیار نہ کرو کہ تمہاری طبیعت اس کی طبیعت سے بدی و برائی کو چرا لے گی او تمہیں اس کی خبر تک نہ ہوگی۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : من۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یسلم۔

جو شخص برے آدمی کی صحبت اختیار کرتا ہے وہ محفوظ نہیں رہتا ہے۔

آپ ہی کا ارشاد ہے:

من لم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔باخلاقہ۔

جو شخص احمق و بے وقوف کی دوستی و صحبت سے پرہیز نہیں کرتا ہے وہ بھی عنقریب اس کی عادت و اخلاق سے متاثر ہوجائے گا۔

ان حدیثوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس طرح خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے اسی طرح انسان دوسروں کے کردا ر اور ان کے چال چلن کو اختیار کرلیتا ہے۔ اگر مصاحب برے اور بے وقوف و پست لوگ ہیں تو نہ دانستہ طور پر انسان ایسے ہی کام کو پسند کرنے لگتا ہے اور پھر وہ یک بارگی متوجہ ہوتا ہے کہ جن کاموں سے وہ بچنا چاہتا تھا انھیں میں مبتلا ہوگیا ہے۔

اطباء کہتے ہیں : بعض امراض متعدی و مسری ہیں چنانچہ اگر ایک صحیح سالم آدمی ایسے مریض کے پاس چلا جائے تو اسے بھی وہ مرض لگ جائے گا حضرت علی ؑ کا یہ قول کہ تمہاری طبیعت اسے دوسروں کی طبیعت سے چرالیگی، برے صفات کے سرایت کرنے ہی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اس طرح سرایت کر جاتے ہیں او رجس میں سرایت کرتے ہیں اسے خبر تک نہیں ہوتی ہے۔ امام صادق ؑ فرماتے ہیں : جو شخص غلط اور برے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے وہ ان کی عادت سے محفوظ نہیں رہتا ہے خود بھی ان کے رنگ میں رنگ جاتا ہے یا جو شخص احمق و بیوقوف لوگوں سے پرہیز نہیں کرتا ہے وہ کم عقلی و بیوقوفی میں مبتلا ہوجاتا ہے اور جب اسے اس کی خبر ہوتی ہے تو اس وقت وہ بد کرداری کے غا ر میں گر چکا ہوتا ہے۔

بیوقوف دوست کی پیروی کا نتیجہ

ایک شخص نے یہ محسوس کیا کہ اسے گھر کے پانی وغیرہ کے لئے گھر میں ایک کنواں کھدوانا چاہیے، اس نے ایک کنواں کھود نے والے کو بلایا اور اس سے کہا: میرے گھر میں ایک کنواں کھودو۔ کنویں کی کھدائی کے نتیجہ میں جو مٹی نکلی اس کا گھر میں ڈھیر لگ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اس کا ایک دوست احمق تھا وہ اس کے پاس گیا اور اس سے مشورہ کیا۔ دوست نے کہا: چاہ کن سے یہ کہو کہ وہ صحن کے دوسری طرف ایک کنواں اور بنائے اور اس مٹی کو اس کنویں میں ڈال دے اس نے اپنے دوست کی بات پر عمل کیا۔ کنواں کھدوایا اور پہلے کنویں کی مٹی اس کنویں میں ڈال دی۔ لیکن اب دوسرے کنویں کی مٹی کا کیا کرے، پھر اپنے دوست کے پاس گیا اور اس سے صورت حال بتائی۔ اس نے کہا: اس کنویں کی مٹی پہلے کنویں میں ڈال دو۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟!

نادان سے مشورہ:

ایک گائے نے کچھ کھانے کے لئے کسی ٹھلیا میں سر ڈالا، اتفاق سے اس میں اس کا سر پھنس گیا، گائے کے مالک نے سر نکالنے کے بارے میں بہت دیر تک غور کیا لکین اس کی عقل نے کام نہ کیا، مجبوراً وہ ایک شخص کے پاس گیا اور اس سے صورت حال بتائی۔ اس نے کہا: جب تک میں خود نہ دیکھو نگا اس وقت تک تمہاری مشکل حل نہیں کرسکونگا وہ اسے اپنے گھر لایا۔ اس نے صورت حال دیکھتے ہی فیصلہ سنا دیا کہ گائے کا سر کاٹ دو، گائے کا سر کاٹ دیا گیا لیکن ساب بھی اس سے باہر نہ نکلا اس نے کہا: اب اس ٹھلیا کو توڑ دو اور گائے کا سر باہر نکال لو، اس بیوقوف کے مشورے سے گائے بھی ہاتھ سے گئی اور ٹھلیا بھی ٹوٹ گئی یہ ہے بیوقوف کی بات ماننے کا نتیجہ۔

حضرت سلیمان سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

لا تحکموا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔واخدانہ۔

کسی شخص کے بارے میں اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک کہ اس کے دوست کو نہ دیکھ لو کیونکہ ہر شخص اپنے دوستوں، ساتھیوں اور رفیقوں سے پہچانا جاتا ہے۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں :لا خیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔من بنعمتہ۔

اس شخص کی رفاقت و مصاحبت میں کوئی بھلائی نہیں ہے کہ جس میں درج ذیل چھ صفات ہوں :

۱۔اگر وہ تم سے کوئی بات کہتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔

۲۔اگر تم اس سے کوئی بات کہتے ہوتو تمہیں جھٹلاتا ہے۔

۳۔اگر تم اسے امانت دار سمجھو گے تو وہ خیانت کرے گا۔

۴۔اگر وہ تمہارے پاس کوئی امانت رکھے گا تو تمہیں خیانت کار سمجھے گا۔

۵۔اگر تم اسے کوئی چیز دو گے تو وہ شکریہ ادا نہیں کرے گا ناشکری کرے گا۔

۶۔اگر وہ تمہیں کچھ دے گا تو احسان بتائیے گا۔

ان کی صحبت اختیار نہ کرو

وقال ابو جعفر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مواضع۔

حضرت امام محمد باقر ؑ فرماتے ہیں : مجھے میرے والد نے وصیت کی اور فرمایا: بیٹے پانچ قسم کے لوگوں کی صحبت اختیار نہ کرنا اور نہ ان سے کوئی بات کہنا اور نہ راستہ میں ان کے ساتھ چلنا۔ میں نے عرض کی :یہ کون لوگ ہیں ؟ فرمایا: فاسق و بدکار کی صحبت میں نہ رہنا کہ وہ تمہیں پیٹ بھر کھانے کے عوض فروخت کردے گا یا اس سے بھی کم میں میں نے عرض کی اس سے کم کیا ہے؟ فرمایا: ایک لقمہ کے عوض فروخت کردے گا۔لیکن اس کی توقع پوری نہیں ہوگی میں نے عرض کی: دوسرے کون لوگ ہیں ؟ فرمایا: بخیل و کنجوس کے ساتھ مت رہنا کیونکہ جب تمہیں شدید ضرورت ہوگی تو وہ تمہیں اپنے مال میں سے کچھ بھی نہیں دے گا۔ میں نے کہا تیسرا کون ہے؟ فرمایا: بہت جھوٹے لوگوں کے ساتھ نہ رہنا کیونکہ ان کی مثال سراب کی سی ہے وہ تمہیں راہ اطاعت سے جو کہ نزدیک ہے دور کردیں گے اور نافرمانی کی راہ سے تمہیں قریب کردیں گے جو کہ دو ہے، میں نے عرض کی چوتھی قسم کے کون لوگ ہیں ؟ فرمایا : نادان و کم عقل لوگوں کی مصاحبت اختیار نہ کرنا کیونکہ وہ تمہیں فائدہ پہنچانے کی فکر میں نقصان پہنچا دیں گے۔ میں نے کہا:پانچواں طبقہ کون ہے؟ فرمایا: جو لوگ قطع رحم کرتے ہیں ان کی ہم نشینی اختیار نہ کرنا کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ قرآن میں ان کو تین جگہ ملعون قرار دیا گیا ہے۔

امام محمد باقر ؑ نے اس حدیث میں فاسق و بدکار لوگوں کی رفاقت و مصاحبت سے منع کیا ہے۔ فاسق کے معنی لغت میں حد سے آگے بڑھنے والے کے ہیں، فسق مصدر ہے، یعنی خدا کے حکم پر عمل نہ کرنا، ظلم و جور سے کام لینا، بندہ کا نافرمان ہونا، عیاشی کرنا۔

فاسق و بدکار شخص خدا کی حدود سے نکل جاتا ہے اور وہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کی پروا نہیں کرتا ہے اسی لئے دوست کی بھی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

دوسرا طبقہ کنجوس و بخیل لوگوں کا ہے، بخل کے معنی لغت میں خست، کم خرچ، طمع پرور، مال کا لالچی اور فرومایہ ہیں، کذاب مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت جھوٹ بولنے والا۔

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : قطع رحم کرنے والے پر قرآن میں تین جگہ لعنت ہوئی ہے وہ تین جگہیں یہ ہیں :

فھل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ابصارھم۔

کیا یہ قریب ہے کہ اگر تم روگرداں ہو جاؤ یا حاکم بن جاؤ تو زمین میں فساد کرو اور قطع رحمی کرو؟ یہی وہ لوگ ہیں جن پراللہ نے لعنت کی ہے اور پھ انھیں بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا بنا دیا ہے۔

یہ آیتیں منافقوں کے بارے میں ہیں، خداوند عالم فرماتا ہے : اگر تم مخالفت کرو گے اور خدا کے حکم اور اس کی کتاب کے مطابق عمل نہیں کرو گے تو زمین پر فساد کروگے اور قطع رحمی کروگے۔ یہ ترجمہ اس صورت میں ہے کہ جب ’’ تولیتم ‘‘کو ’’ تولیٰ ‘‘ سے فرض کریں کہ اس کے معنی روگردانی کرنا ہیں۔

لیکن اگر اس کو ہم ولایت سے فرض کریں کہ جس کے معنی حکومت ہیں جیسا کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے تو یہ ترجمہ ہوگا۔ اگر زمام حکومت تمہارے ہاتھوں میں آجائے تو تم تباہی، خونریزی اور قطع رحمی ہی کرو گے۔

۲۔ والذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سوء الدار۔

اور جو لوگ خدا کے عہد کو محکم کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں او ر جس چیز کو وصل کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اس کو توڑ دیتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں لعنت انھیں کے لئے ہے اور ان کے لئے بہت برا ٹھکانہ ہے۔

خداوند عالم نے اس آیت میں دنیا پرستوں کے عقیدتی و عملی مفاسد کو تین جملوں میں بیان کیا ہے : ۱۔ وہ خدا کے عہد، فطری، عقلی اور تشریعی عہد کو توڑ دیتے ہیں۔ ۲۔ قطع روابط کرتے ہیں، خدا سے رشتہ توڑ لیتے ہیں، خدا کے نمائندوں سے قطع تعلقی کرلیتے ہیں، مخلوق اور خود سے منھ موڑ لیتے ہیں۔ ۳۔ روئے زمین پر فساد پھیلاتے ہیں۔

۳۔ الذین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الخاسرون۔

فاسق تو وہی ہیں جو خدا کے عہد کومحکم کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان رشتوں کو توڑ ڈالتے ہیں کہ جن کو استوار کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور وہ روئے زمین پر فساد پھیلاتے ہیں، یہی گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔

صلہ رحمی کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ رسولؐ فرماتے ہیں :

صلۃ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اخیار۔

صلہ رحمی شہروں کو آباد کرتی ہے۔ عمر بڑھاتی ہے خواہ صلہ رحم کرنے والے نیک افراد بھی نہ ہوں۔

مصاحبت کے بارے میں امام حسن ؑ کا نظریہ

امام حسن ؑ جنادہ بن امیہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

اگر تمہارا نفس تم سے سرکشی کرے اور تم مردوں کی ہم نشینی اختیار کرنے پر مجبور ہوجاؤ تو ایسے لوگوں کی مصاحبت اختیار کرنا جو تمہارے لئے باعث زینت ہوں اور اگر تم ان کی خدمت میں ہوتو وہ تمہاری حفاظت کریں اور اگر تمہیں ان کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ تمہاری مدد کریں اگر تم ان سے کوئی بات کہو تو وہ تمہاری بات کی تصدیق کریں اگر ان سے تمہاری دوستی ہوتو وہ اسے محکم کریں اور اگر تمہیں ان کے لطف و کرم کی توقع ہوتو وہ تمہاری توق کو پورا کریں اور اگر تمہاری کوئی بات ان پر آشکار ہوجائے کہ جس سے تمہای عزت کو خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ اس کا سد باب کریں اور اگر تمہاری طرف سے نیکی دیکھیں تو اسے یاد رکھیں، اگر تم ان سے سوال کرو تو عطا کریں اور اگر تم خاموش رہو تو وہ خود سلسلہ کلام شروع کریں اور اگر تم کسی مصیبت میں گھرے ہوتو وہ تمہاری مالی مدد کریں۔

علماء اور صاحبان علم کی مصاحبت و ہم نشینی کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں :

لاتصحب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وفیا۔

عقل مند اور پرہیز گار لوگوں ہی کی مصاحبت و ہم نشینی اختیار کرو اور اس عالم کے علاوہ کسی سے نہ گھلو ملو کہ جس نے اپنا تزکیہ کرلیا ہے اور وفا دار مومن کے علاوہ کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔

وقال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ومماتھم۔

فرمایا: یاد رکھو! عالم کی ہم نشینی و صحبت اور ان کی پیروی ایسا عمل ہے جس کی جزا دی جائے گی اور عالم کی اطاعت سے نیکیاں ملتی ہیں اور گناہ محو ہوتے ہیں اور مومنوں کے لئے ذخیرہ ہے اور اس سے ان کو زندگی میں بھی بلندی ملتی ہے اور موت میں بھی۔

شریک کا حق

شریک کا حق یہ ہے کہ اگر وہ موجود نہ ہوتو تم اس کے امور کو انجام دو اور اگر موجود ہوتو اسے اپنے برابر قرار دو اور اس سے مشورہ کے بغیر کوئی ارادہ و منصوبہ نہ بناؤ اور اس کے لئے اس کے مال کی حفاظت کرو اور اس کے ساتھ کم و زیادہ خیانت نہ کرو کیونکہ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ دو شریکوں کے

اوپر اس وقت تک خدا کا ہاتھ ہے جب تک انھوں نے خیانت نہیں کی ہے اور خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

شرک، شرکت اور مشارکت کے معنی شریک ہونا ہیں اور اشراک کے معنی شریک کرنا ہیں، سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہے : اشدد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فرعون کو تبلیغ کرنے میں موسیٰ کے لیے بھائی کو شریک کرنے کے معنی میں ہے۔

شریک اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کام یا کسی چیز میں دوسرے کا حصہ دا و ساجھے دار ہو، سورۂ فرقان میں ارشاد ہے: ولم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ملک و حکومت میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں ہے۔ یہاں شریک سے مراد، مستقل و مستعار شریک ہے ورنہ کائنات کے نظم و نسق اور اس کی تدبیر کے لئے، خداوند عالم نے بہت سے اسباب و واسطے قرا ر دیئے ہیں، مثلاً فرشتوں کو پیدا کیا ہے۔

’’شرک‘‘ اسم ہے یعنی عملِ شرک، شرک حصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے چنانچہ آیہ، ام لھم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا ان کا آسمانوں میں حصہ ہے اور مشرک اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کا شریک قرار دیتا ہے۔

شرکت فقہی نقطۂ نظر سے

ان اموال میں شرکت ہوتی ہے ج وتمام صفات میں یکساں ہوں او ر محفوظ ہوجائیں اور دونوں شرکاء میں سے ہر ایک دوسرے کو تصرف کی اجازت دیدے بعض فقہا نے شرکت میں صیغہ (عربی یا دوسری زبانوں میں ) پڑھنے کو بھی شرط جانا ہے۔ جو لوگ عقد شرکت کے ذریعہ باہم شریک ہوتے ہیں ان کو بالغ و عاقل ہونا چاہیے اور اسے قصد و اختیار کے ساتھ شرکت کرنا چاہیے اور وہ اپنے مال میں تصرف کرسکتا ہو پس سفیہہ کی شرکت جائز نہیں ہے۔

علامہ حلی، قواعد الاحکام میں تحریر فرماتے ہیں :

شرکت کی چار قسمیں ہیں : شرکت اموال، شرکت ابدان، شرکت مفاوضہ اور شرکت وجود، پہلی کے علاوہ اور سب باطل ہیں۔ بنا برایں صرف اموال میں شرکت ہوسکتی ہے۔ وہ بھی فقہا کی بیان کی ہوئی شرطوں کے ساتھ۔

معاملات میں آداب کی رعایت

شریعت اسلامیہ میں تجارت و معاملات کے کچھ احکام و دستورات ہیں کہ جن کی رعایت کی جانی چاہیے تاکہ معاملہ صحیح اور اسے سے ملنے والا فائدہ حلال ہو، اسی لئے کتاب ’’ وسائل الشیعہ ‘‘ میں تجارت کے آداب سے متعلق کچھ ابواب بیان ہوئے ہیں چونکہ شرکت بھی ایک قسم کا معاملہ ہے لیکن اشتراکی صورت میں لہٰذا اس میں ان آداب کی رعایت کرنا چاہیے، اس سلسلہ میں وارد ہونے والی احادیث میں سے ایک درج ذیل ہے:

امام صادق ؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا: خرید و فروخت کرنے والے کو پانچ احکام کی رعایت کرنا چاہیے۔

۱۔اسے سود لینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۲۔معاملہ میں قسم نہیں کھانا چاہیے۔

۳۔فروخت کی جانے والی چیز کو چھپانا نہیں چاہیے۔

۴۔بیچتے وقت اس کی تعریفیں نہیں کرنا چاہیے۔

۵۔ لیتے وقت اس میں فی نہیں نکالنا چاہیے۔

دوسری حدیث: ابن طاؤس نے کتاب استخارات میں احمد بن محمد یحییٰ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا۔ ہمارے ایک دوست نے یہ

طے کیا کہ وہ تجارت کرے گا سفر تجارت پر جانے سے پہلے اس نے کہا۔ میں امام صادق ؑ سے ملاقات کئے بغیر سفر پر نہیں جاؤنگا۔ آپؑ سے مشورہ کرونگا اور دعا کی درخواست کرونگا چنانچہ وہ امام صادق ؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ آپ ؑ نے فرمایا: تمہارے لئے ضروری ہے کہ سچ بولو، فروخت کی جانے والی چیز کے عیب کو نہ چھپاؤ، جو تم سے خریدے اس کو دھوکا نہ دو کہ غلط قیمت بتا کر فروخت کرنا حلال نہیں ہے اور جو چیز اپنے لئے پسند کرو وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرو، قسم کھانے سے پرہیز کرو کیونکہ جھوٹی قسم کھانا انسان کو جہنم میں پہنچا دیتا ہے او رتاجر گھاٹے میں ہے مگر یہ کہ حق دے اور حق لے پھر جب تم سفر کا قصدکرو تو خدا سے دعا کرو اور اس سے خیر طلب کرو۔میرے والد نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ رسولؐ اپنے اصحاب سے فرماتے تھے کہ سفر پر جاتے وقت خدا سے خیر طلب کرو کہ قرآن بھی یہی کہتا ہے:

شرکت حدیث کی روشنی میں

قال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بینھما۔

رسولؐ فرماتے ہیں : بیشک خداوند عالم کا ارشاد ہے جب تک دو شریکوں میں سے کوئی دوسرے سے خیانت نہیں کرتا ہے اس وقت تک میں بھی ان کا شریک رہتا ہوں لیکن جب ان میں سے کوئی خیانت کرتا ہے تو میں ان سے جدا ہوجاتا ہوں۔

حسین بن مختار سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے ابو عبداللہ امام صادق ؑ کی خدمت میں عرض کی:

ایک شخص کا ایک آدمی شریک ہے، اس پر یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اس کے شریک نے کچھ خیانت کی ہے، کیا وہ بھی اپنے شریک پر واضح کئے بغیر اتنا ہی مال لے سکتا ہ یجتنا اس کے شریک نے خیانت کرکے لیا ہے؟ فرمایا: یہ کتنی بری بات ہے ! یہ دونوں اس لئے شریک ہوئے تھے تاکہ خدا کی پناہ میں رہیں اور ایک دوسرے کی امانت کا پاس ولحاظ رکھیں، میں تو یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ اگر اس نے اپنے دوست کو خیانت کرتے ہوئے دیکھا ہ یتو بھی اس سے چشم پوشی کرے اور مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ وہ اپنے دوست کو اطلاع دئے بغیر کوئی چیز اٹھائے۔

مذکورہ حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دو شریکوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہیں کرنا چاہیے اور دوسرے کی عدم موجودگی میں مشترک مال میں تصرف نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ فعل شریک کے حق کے منافی ہے۔ امام زین العابدین ؑ نے شریک کے حق کے سلسلہ میں چند چیزیں بیان فرمائی ہیں :

۱۔ ایک شریک کو دوسرے شریک کی عدم موجودگی میں مشترک مال میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہ یبلکہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے امور کو انجام دے۔

۲۔ اس کی موجودگی میں اس کے حق کی رعایت کرے اور مساوات و برابری کو فراموش نہ کرے۔

۳۔اس کی رائے کے خلاف کوئی منصوبہ نہ بنائے اور اس کو یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انھوں نے شروع میں ہی یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ اس مال کو امانت سمجھیں گے۔

۴۔اس کے مال کا نگہبان رہے اور شریک کے ساتھ کسی قسم کی خیانت نہ کرے اور اسے یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ خدا ان لوگوں پر مہربان ہے جو شریک بننے کا ارادہ کرتے ہیں جب تک کہ وہ خیانت نہ کریں لیکن جب خیانت سرزد ہوجاتی ہے تو وہ ان سے اپنی نظر لطف کو ہٹا لیتا ہے۔

مال کا حق

مال کا حق یہ ہے کہ اسے حلال طریقہ ہی سے حاصل کرو اور حلال راہ میں ہی خرچ کرو اور بیجا خرچ نہ کرو، صحیح راستہ سے منتقل کرو اور جو مال

تمہارے پاس ہے وہ خدا کا مال ہے اسے راہِ خدا میں ہی خرچ کرو اور اس چیز میں صرف کرو جو خدا تک رسائی کا سبب ہو او ر جو تمہارا شکر گزار نہیں ہے اسے اپنے اوپر مقدم نہ کرو، تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس سلسلہ میں طاعت ترک نہ کرو کہ وہ دوسروں کے لئے تمہاری میراث بن جائے اور تم وارث کے معاون قرار پاؤ اور وہ اس کو تم سے بہتر راستہ میں اور طاعت خدا میں خرچ کرے، اسے اس کا فائدہ ہو اور گناہ و افسوس تمہارے حصہ میں آئے، اور خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

امام زین العابدین ؑ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔مال کس راہ سے آنا چاہیے اور کہاں خرچ ہونا چاہیے۔

۲۔مال کا ایک موقع، محل ہوتا ہے لہٰذا اسے وہاں سے نہیں ہٹانا چاہیے۔

۳۔چونکہ خدا کی طرف سے ملتا ہے لہٰذا راہِ خدا میں ہی خرچ ہونا چاہیے۔

۴۔مال سے صحیح اور عاقلانہ طریقہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے ورنہ وارث کے ہاتھ میں جائے گاممکن ہے وہ اس سے صحیح طور سے استفادہ کرے اور وہ اس مال کی برکت سے دنیا و آخرت میں کامیاب ہو جائے، اور اس کا ضرروگناہ کمانے والے کے اوپر ہو آئے۔

مال کے لغوی معنی

انسان جس چیز کا مالک بنتا ہے وہی اس کا مال ہے جیسا کہ قاموس اور اقرب الموارد میں مرقوم ہے : المال۔۔۔۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بادیہ نشینوں کے نزدیک چوپائے بھی مال ہیں۔ عربی میں مال مذکر بھی ہے اور مؤ نث بھی : مثلاً ھو مال۔ وہی مال۔

راغب کہتے ہیں : مال کو اس لئے مال کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ مائل و زائل رہتاہ ے (آتا ہے دھن جاتا ہے دھن) ایک سے دوسری کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے اسے عارضی کہتے ہیں۔ اس میں دوام نہیں ہے اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے : مال کی مثال طوائف کی سی ہے کہ ایک دن عطا ر کے گھر میں رہتی ہے تو دوسرے دن جراح کی آغوش میں اور قرآن مجید میں بیان ہوا ہے :المال۔۔۔۔۔۔۔

مالکیت کے اقسام

مالکیت کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ حقیقی ۲۔ اعتباری و فرضی،

مالکیت حقیقی یہ ہے ایک موجود دوسرے پر تکوینی تسلط رکھتا ہوجیسے علت، معلول پر تسلط رکھتی ہے، یا ذہنی صورتوں پر نفس کا تسلط، جب بھی وہ کسی پھول کا تصور کرتا ہے اسی وقت ذہن میں پھول کی تصوی آجاتی ہے اور اگر توجہ ہٹا لیتا ہے تو پھول کی تصویر محو ہوجاتی ہے۔ خداوندعالم اس کائنات کا حقیقی مالک ہے۔

اور جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے وہ سارے کاسارا خدا ہی کا ہے اور خدا ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

مالکیت حقیقی کو مالک سے منتقل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ تکوینی چیز قابل نقل و انتقال نہیں ہوتی ہے۔ مالکیت اعتباری یہ ہے کہ ایک موجود کا دوسرے موجود پر اعتباری تسلط ہوتا ہے کہ جس سے وہ اس میں تصرف کرسکتا ہے اور دوسروں کو اس میں تصرف کرنے سے منع کرسکتا ہے جیسے انسان کا اپنے اموال کا مالک ہونا یہ مالکیت انسانوں کے آپسی روابط سے وجود میں آئی ہے اس کو اس لئے اعتباری کہتے ہیں کہ مالک و ملک کے درمیان کوئی حقیقی اور تکوینی رابطہ نہیں ہوتا ہے لہٰذا اس کو منتقل کیا جاسکتا ہے۔

انسان محور کائنات

اسلام کے نقطۂ نظر سے انسان تمام موجودات کا محور ہے سبھی اس کے فائدے کے لئے حاضر ہیں قرآن مجید نعمت کا شمار کراتے ہوئے کہتا ہے: سب کچھ انسان کے فائدے کے لئے ہے۔

خداوہ ہے جس نے زمین کی ساری چیزوں کو تمہاے لئے پیدا کیاہے۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس کو تمہارے لئے مسخر کردیا ہے؟

اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا پھر تمہیں اس میں آباد کیا۔

اور انھیں خدا کے اس مال میں سے عطا کرو جو اس نے تمہیں دے رکھا ہے۔

اس آیت کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مال خدا ہی کا ہے، تو اس کی بخشش میں زحمت نہیں ہونا چاہیے۔ مذکورہ آیتوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر چیز انسان کے لئے خلق ہوئی ہے یہاں تک کہ خدا نے مال کو بھی انسان ہی کے لئے بنایا ہے، اقتصادی نظام، اسلامی نظام ہے، یہ اسلام کے کلی نظام کا ایک جز ہے جو کہ انسان کی مادی ضرورتوں، جیسے روٹی، کپڑا، مکان، دفاعی اسباب، تہذیب و حفظان صحت طبی سہولتوں اور بعض نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔

دنیا اسلام کی نظر میں

دنیوی زندگی کی حقیقیت و ہویت کے بارے میں جو آیات و روایات وارد ہوئی ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض میں تو دنیا کی مذمت کی گئی ہے۔ سورۂ محمد کی آیت ۳۶، سورۂ انعام کی آیت ۳۲، سورۂ عنکبوت کی آیت ۶۴ اور سورۂ حدید کی آیت ۲۰ میں دنیا کو لہو و لعب، کھیل تماشا قرا ر دیا گیا ہے اسی طرح اس کو متاع قلیل، متاع الغرور، تکاثر اور تفاخر کا ذریعہ قرار دیا گیاہے جو کہ دنیا کی پستی کی علامتیں ہیں۔

بعض آیات و احادیث میں دنیوی زندگی اور اس کے متعلقات کو ایسے عنوانات دیئے گئے جو اس کے محبو ب و مطلوب ہونے کا پتہ دیتے ہیں مثلاً سورۂ توبہ کی آیت ۲۸، سورۂ نحل کی ۱۶، سورۂ نساء کی ۳۷ اور سورۂ نور کی آیت ۲۴ میں فضل اللہ اور سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۰، ۲۵۱، ۲۷۲، سورہ عادیات کی ۱۶ اور سورہ معارج کی آیت ۷۰میں ’’ خیر ‘‘ اور سورۂ ہود کی آیت ۹، سورۂ اسراء کی ۱۰۰ اور سورۂ کہف کی آیت ۸۲ اور سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۰ او سورۂ توبہ کی آیت ۵۰ میں لفظ حسنہ بیان ہوا ہے اس کے برخلاف بعض آیتوں اور حدیثوں میں بعض حالات میں مادی چیزوں سے محرومی اور خدا کا عذاب بیان ہوا ہے۔

بعض آیتوں اور حدیثوں میں دنیا کی وضاحت ہوئی ہے ان آیتوں میں دنیا کو مطلوب قرار دیا گیا ہے کہ یہ آخرت کا مقدمہ اور آخرت کا دریچہ ہے اگر اسی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تو قابل مذمت ہے مثلاً جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہیں اور انھوں نے دنیوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے اور اس سے مطمئن ہوگئے ہیں اور جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں تو انھوں نے جو اعمال کئے ہیں ان کی سزا کے لئے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اس آیت میں آخرت سے بے اعتنائی کی وجہ سے دنیا کی مذمت ہوئی ہے۔

دنیا حدیث کی روشنی میں

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : دینا اولیاء خدا کی تجارت گاہ ہے، رسولؐفرماتے ہیں : دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ آخرت کے لئے دنیا بہترین مدد

گار ہے۔ صالح بندہ کے لئے شائستہ مال کتنا کھپتا ہے۔

ان حدیثوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دنیا آخرت کا پیش خیمہ ہے، اس کے لئے استعمال ہونے والے لفظ، تجارت گاہ، کھیتی و مزرعہ اور مددگار،ان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر دنیا نہ ہوتو آخرت بھی نہیں ہوگی۔ لیکن انسان کبھی دنیا ہی کو اصل سمجھ لیتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ وہ پیش خیمہ ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو وہ خدا سے اپناآرام و رفاہ حاصل کرنا فراموش کردیتا ہے۔ ارشاد ہے:

اگر خدا اپنے بندوں کے رزق کو وسیع کردیتا تو وہ ضرور روئے زمین پر فساد پھیلاتے۔

بیشک جب انسان خود کو بے نیاز سمجھتا ہے تو سرکشی کرتا ہے۔

اور جب ہم انسان کو نعمت دیتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے۔

اسی لئے خدا کے نمائندوں نے بقدر ضرورت رزق کے حصول کی طرف تشویق کی ہے، رسولؐ کا ارشاد ہے:

اے اللہ محمد و آل محمد اور ان سے محبت کرنے والے کو پاکیزہ اور بقدر ضرورت رزق عطا فرما۔

نہج البلاغہ میں ہے:

دنیا میں ضرورت سے زیادہ طلب نہ کرو اتنا ہی لو جتنا آگے بھیج سکو۔

ان آیتوں اور حدیثوں سے مال کی قدروقیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کی زندگی میں مال کا اہم کردار ہوتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح اعتقاد کے ساتھ ہو اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے مال کے حصول کے لئے کیا احکام و دستورات مقرر کئے ہیں، امام زین العابدین ؑ اسے ایک حق کے عنوان سے دیکھتے ہیں۔

کسب مال

کم و بیش ہر انسان مال سے محبت کرتا ہے لیکن اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ انسان کو مال سے جو محبت ہے وہ فطرتی ہے یا عارضی ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عزیزی اور فطری عمل ہے اور انسان کی فطرت میں اس کا قدرتی اور حیاتی اثر ہے۔

صاحبان علم کہتے ہیں کہ مال سے جو انسان کو لگاؤ ہے وہ کوئی مستقل و طبیعی کشش نہیں ہے، بلکہ یہ خواہش کو پورا کرنے کا وسیلہ ہے تاکہ انسان ثروت کا مالک بن کر اپنی زندگی کی ضرورتوں، مثلاً روٹی، کپڑا اور مکان، جنسی خواہش کی تسکین اور بچوں وغیرہ کی حفاظت کرے۔

جانور بھی بہت سی چیزوں کو اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جمع کرتے ہیں، تملک کی مدہ صورت خوراک، ہمدم، آشیانہ اور وطن سے مربوط ہے جانوروں کے اندر ملکیت بنانے کا جو رجحان ہے اس کا سرچشمہ وہ جذبہ طاقت ہے جو بھوک، تنا سل اور اپنے بچہ کی حفاظ کے رجحان سے زیادہ شدید و قوی ہے۔

’’ویلیم جیمز‘‘ نے معاشرہ میں مالکیت کو شخصیت کی وسعت یا ایک قسم کی نفسیاتی ضخامت قرار دیا ہے وہ کہتا ہے۔ ’’ میں اور انا‘‘ صرف نفسیاتی طاقت و قوت ہی کو شامل نہیں ہے،بلکہ لباس، گھر، سواری، ملک اور بینک کے حساب کو بھی شامل ہے اور یہ تمام چیزیں اس کے اندر عواطف کو ایجاد کرتی ہیں۔

اگرچہ مال کا محبوب ہونا فطری نہیں ہے لیکن یہ زندگی چلانے، خواہشوں کو پورا کرنے اور اقتدار حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے مال انسان کی بہت سی تمناؤں کو پورا کرسکتا ہے اور انسان کی شخصیت کا وقار بڑھا سکتا ہے اس سلسلہ میں قرآن کہتا ہے: انسان مال سے بہت زیادہ محبت رکھتا

ہے۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : اس شخص میں کوئی خوبی نہیں جو حلال طریقہ سے مال حاصل کرنے کی خواہش نہ رکھتا ہو کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی زت و آبرو کی حفاظت کرسکے، اپنے فرض کو ادا کرسکے اور صلہ رحمی کرے۔

مال حاصل کرنے کا مقصد

ایک دن رسولؐ اپنے بعض اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک طاقتور چست جوان کو دیکھا جو صبح سے کام و کوشش میں مشغول ہے۔ اصحاب نے کہا، افسوس ہے اس جوان کے اوپر، کاش یہ اپنی جوانی اور اس طاقت کو راہ خدا میں صرف کرتا! رسولؐ نے فرمایا: یہ نہ کہو، کیونکہ اگر وہ اپنی زندگی کے اخراجات پورا کرنے کے لیے کوشش کررہا ہے تاکہ دوسروں سے بھیک نہ مانگنا پڑے اور وہ لوگوں سے مدد طلب کرنے سے بے نیاز ہوجائے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہے اور اگر وہ اس لئے کوشش و کام میں مشغول ہے تاکہ اپنے ضعیف ماں، باپ اور اپنے کمسن بچوں کے اخراجات کو پورا کرے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہے اور اگر وہ مال کی کثرت اور اس پر فخر کرنے کے لئے جمع کررہا ہے تو یہ شیطان کا راستہ ہے۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچنے کے لئے کوشش کرنا بھی عبادت ہے۔ اس قسم کی کمائی کی مذمت نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی روز مرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کوشش کرے۔ ہمارے معصوم ائمہ کا عمل اس کا ثبوت ہے۔امام محمد باقر ؑ کے بارے میں محمد بن منکدر کی باتیں ملاحظہ ہوں :

امام صادق ؑ سے روایت ہے کہ محمد بن منکد ر کہتا ہے : میرا خیال تھا کہ علی بن الحسین (زین العابدینؑ) اپنے سے بہتر جانشین نہیں بنا سکیں گے یہاں تک کہ ایک دن میری ملاقات ان کے فرزندمحمد بن علی سے ہوئی، میں نے سوچا کہ انھیں کچھ نصیحتیں کروں لیکن انھوں نے مجھ ہی کو نصیحت کردی۔ اس کے ساتھیوں نے معلو م کیا: کس طرح تمہیں نصیحت کی؟ اس نے کہا: ایک دن میں گھر سے نکلا اور گرمی کے وقت مدینہ کے اطراف میں نکل گیا۔ دیکھا کہ ایک کھیت میں د و غلاموں کے ساتھ ایک آدمی کام میں مشغول ہے، میں نے اپنے دل میں سوچا سبحان اللہ ! یہ قریش کا بوڑھا اس شدید گرمی اور ضعیفی کی عمر میں دنیا کی طمع میں کام کررہا ہے۔ مجھے چاہیے کہ اسے نصیحت کرو، میں آگے بڑھا، ان کے قریب پہنچا، سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا۔ آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ میں نے عرض کی: خدا آپ کا بھلا کرے ! قریش کا بزرگ اس عالم میں دنیا طلبی میں مشغول ہے ! اگر اس حال میں ملک الموت قبض روح کے لئے آجائے تو آپ کیا کریں گے؟

فرمایا: اگر ملک الموت آجائے تو وہ مجھے اس حال میں خدا کی عبادت میں پائے گا، میں اپنے اور اپنے اہل و عیال کے اخراجات پورا کرنے کے لئے کام کررہا ہوں مجھے تمہارے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو اس بات سے ڈرتا ہوں کہ ملک الموت آجائے اور مجھے خدا کی اطاعت میں نہ پائے۔ میں نے عرض کی: خدا آپ پر رحم کرے، آپ صحیح فرماتے ہیں میں نے سوچا تھا کہ آپ کو نصیحت کروں لیکن آپ نے مجھ ہی کو نصیحت کردی۔

ہمارے ائمہ اس لئے محنت و مشقت کرتے تھے تاکہ اپنی زندگی کے اخراجات کو پورا کریں اور پست فطرت لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے اس طرح انھوں نے اپنے ماننے والوں کو یہ سبق بھی دے دیا کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں بلکہ اپنے خون پسینہ کی کمائی سے استفادہ کریں۔

جو لوگ اپنے اہل و عیال کے اخراجات پورا کرنے کی خاطر کام کرتے ہیں وہ دین اسلام کی نگاہ میں ان لوگوں کی مثل ہیں جو محاذ جنگ پر دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : اپنے بچوں اور بیوی کے لئے کام کرنے والا راہ خدا میں جہاد کرنے والے کی مانند ہے۔

اس کے برخلاف جو شخص اپنے اہل و عیال کو چھوڑ دیتا ہے اور ان کو نان و نفقہ سے محروم کردیتا ہے اس کے بارے میں رسولؐ فرماتے ہیں : ملعون ہے اور رحمت خدا سے دور ہے وہ شخص جو ان لوگوں کے حق کو ضائع کردیتا ہے جو اس پر حق رکھتے ہیں۔

حلال طریقے سے مال حاصل کرنا

امام محمد باقر ؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ ؐ نے حجۃ الوداع میں فرمایا: دیکھو! جبریل نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ کسی بھی نفس کو اس وقت تک موت نہیں آتی ہے جب تک کہ اس کا رزق پورا نہیں ہوجاتا پس تلاش رزق کے سلسلہ میں خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور اختصار سے کام لو اگر تمہارا رزق تھوڑی دیر کے بعد تم تک پہنچے تو اسے تم خدا کی معصیت کے ساتھ حاصل نہ کرنا بیشک اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے درمیان حلال طریقہ سے رزق تقسیم کیا ہے لیکن جو شخص پردہ دری کرتا ہے اور حرام طریقہ سے جلد از جلد رزق حاصل کرتا ہے تو اس کی حلال روزی کم ہوجاتی ہے اور روز قیامت اس سے اس کا حساب لیا جائے گا۔

اس حدیث میں صبر کرنا اہم چیز ہے۔ اگر انسان کو اس کی توقع کے مطابق رزق و روزی نہ ملے تو اسے حرام رزق کی طرف ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے کہ روز قیامت عادل خدا کی بارگا ہ میں اس کا حساب دینا پڑے۔

رزق کی دو قسمیں

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : رزق کی دو قسمیں ہیں : ایک قسم اپنے مالک تک پہنچ جاتی ہے خواہ وہ اسے تلاش بھی نہ کرے لیکن دوسری اسے ڈھونڈنے اور تلاش کرنے ہی سے ملتی ہے، جو رزق تقسیم ہوچکا ہے وہ تو انسان تک پہنچ جاتا ہے خواہ وہ اسے تلاش نہ کرے لیکن جو رزق تلاش کرنے ہی سے میسر ہوتاہے اس کے لئے انسان کو چاہیے کہ اسے حلال طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرے، اگر اس نے اسے حرام طریقہ سے طلب کیا اور پالیا تو اس کا حساب اس کے رزق میں ہوگ اور روز قیامت اسے اس کا حساب دینا ہوگا کہ حرام راستہ سے حاصل کیا ہے۔

مال کے سلسلہ میں امام زین العابدین ؑ نے فرمایا ہے کہ اسے حلال طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرو اور حرام راستہ سے پرہیز کرو، مذکورہ حدیثیں امام زین العابدین ؑ کے بیان کی تکمیل کرتی ہیں۔آخر میں مال کے حق کے سلسلہ میں فرماتے ہیں : ممکن ہے مال وارث کے ہاتھ میں پہنچ جائے اور وہ اس کو صحیح راہ میں خرچ کرے اور روز قیامت اس کا نتیجہ بھی حاصل کرے، اس سلسلہ میں امیر المومنین ؑ فرماتے ہیں :

روز قیامت سب سے زیاد ہ حسرت اس شخص کو ہوگی کہ جس نے خدا کی نافرمانی میں مال جمع کیا ہو اور پھر اس مال کو اس شخص کومیراث میں دے گیا ہو کہ جو اس کو طاعت خدا میں خرچ کرے اور اس کے نتیجہ میں جنت میں جائے اور پہلا شخص جہنم میں جائے۔

یقینا یہ بہت بڑی حسرت ہے کہ کسی کا مال دنیا میں دوسرے کے ہاتھ لگ جائے اور وہ دنیا میں بھی اس سے استفادہ کرے اور آخرت میں بھی اور جس نے اس مال کو زحمت و مشقت کے ساتھ حاصل کیا تھا وہ حرام طریقہ سے حاصل کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو۔

قرض خواہ کا حق

تمہارے قرض خواہ کا حق یہ ہے کہ اگر تمہاری استطاعت میں ہے تو اس کا قرض ادا کردو اور اس کا کام چلا دو اور اسے بے نیاز کردو، ٹال

مٹول کرکے اسے پریشان نہ کرو کہ رسولؐ نے فرمایا ہے: ثروت مند کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اور اگر تم تنگ دست ہوتو اس سے نرم لہجہ میں بات کرو، مہلت طلب کرو اورسلیقہ سے واپس کردو کہ تم نے اس کا مال لے رکھا ہے اس سے بدسلوکی نہ کرو کیونکہ یہ پست اور گری ہوئی بات ہے، خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

غریم کے معنی لغت میں، قرض خواہ، دشمن، حریف اور رقیب ہیں، مطل تاخیر کرنا کسی حق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا، وقت میں تاخیر کرنا ہیں، موسر، جو ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے،اس کے مقابلہ میں ’’ معسر ‘‘ ہے جو قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے۔

امام زین العابدینؑ نے رسالۃ الحقوق کے اس حصہ میں قرض خواہ کے حق کو خلاصہ کے طور پر بیان فرمایاہے:

۱۔ اگر مقروض اپنا قرض ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے تو اسے ادا کردینا چاہیے قرض چکانے میں تاخیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ قرض خواہ سے خوش خلقی کے ساتھ پیش آئے اور اس سے اس طرح گفتگو کرے کہ اسے تکلیف نہ ہو، اور اگر ایسا نہیں کرے گا تو اپنی پستی کا ثبوت فراہم کرے گا کیونکہ اس نے مد مقابل کا مال بھی لے لیا اور اس سے دست گریباں بھی ہورہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص سرزنش کا مستحق ہے۔

انسان کی زندگی کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ نشیب و فراز سے بھری ہوئی ہے اس کی کوئی ایک ڈگر نہیں ہے۔ کبھی مالداری و ثروت مندی ہے کبھی مفلسی و ناداری ہے، انسان کو دونوں صورتوں میں اپنے قوی ارادہ کی حفاظت کرنا چاہیے۔ مالدار ہونے کی صورت میں سرکشی نہیں کرنا چاہیے اور غربت و مفلسی کے زمانہ میں اپنا بھرم نہیں کھونا چاہیے۔ دین اسلام میں جو دلچسپ او رقیمتی مسائل بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک قرض دینا اور لوگوں کی مدد کرنا اور استطاعت نہ رکھنے والے لوگوں کو مہلت دینا بھی ہے۔ قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں اس مسئلہ کی اہمیت کو واضح کیا ہے ان میں سے بعض آیتیں درج ذیل ہیں۔

قرض حسنہ قرآن کی روشنی میں

سورۂ تغابن میں مال سے متعلق گفتگو کے بعد اموال کو فتنہ قرار دیا ہے ارشاد ہے:

اگر تم خدا کو قرض حسنہ دو گے تو وہ اسے تمہارے لئے دوگنا کردے گا اور تمہیں بخش دے گا، بیشک خدا قدرداں اور حلیم ہے۔

قرض کے معنی کسی چیز کو قطع کرنا ہیں اور جب ’’ حسن‘‘ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اس کے معنی مال کو خود سے جدا کرکے نیک کام میں خرچ کرنے کے ہوتے ہیں۔ یغفر لکم ‘‘ اس بات کی دلیل ہے کہ انفاق و خرچ گناہوں کی بخشش کا سبب ہوتا ہے اور لفظ شکور اس بات کی دلیل ہے کہ خدا عظیم جزاء کے ذریعہ اپنے بندوں کی قد ر کرتا ہے یا ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

سورۂ حدید میں ارشاد ہے:

کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے تاکہ خدا اس کو کئی گنا کردے اور اس کو اجر کریم عطا کرے۔

اسی سورہ میں ارشاد ہے:

بیشک انفاق کرنے والے مرد اور عورتیں خدا کو قرض حسنہ دیتے ہیں جو ان کے لئے کئی گنا ہوجاتا ہے اور ان کے لئے بڑا اجر ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خداوند عالم کو ’’ قرض حسنہ ‘‘ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیں کیونکہ خدا قرض سے بے نیاز ہے یہمومن بندے ہیں جن کو قرض کی ضرورت ہوتی ہے لیکن آیتوں کے سیاق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تمام آیتوں میں قرض الحسنہ سے مراد راہ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ اگرچہ خدا کے بندوں کو قرض دینا بہت عظیم عمل ہے۔ فاضل مقداد نے بھی ’’ کنز العرفان ‘‘ میں یہی معنی بیان کئے ہیں ہر

چند تمام صالح اعمال سے اس کی تفسیر کی جاسکتی ہے۔

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے تاکہ خدا اس کو اس کے لئے کئی گنا کردے بیشک خدا رزق و روزی کو محدود و تنگ اور کشادہ و فراخ کرتا ہے اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

یہ تھیں قرض الحسنہ کی اہمیت سے متعلق چند آیتیں جو ہم نے بطور نمونہ پیش کی ہیں۔ ورنہ اس موضوع پر بہت سی آیتیں دلالت کررہی ہیں۔

سود خوی قرآن کی نظر میں

اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے قرض الحسنہ اور کلی طور پر صدقات و انفاق، کہ جن سے ضرورت مندوں کی مدد کی جاتی ہے قرض دینے والا صرف خدا کی رضا کے لئے قرض دیتا ہے، اس کا اجرو ثواب احادیث میں بیان ہوا ہے اس کے برخلاف سود خودی ہے اس کا حکم اور معاشرہ مرتب ہونے والے اس کے منفی اثرات بھی قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو! اور سود میں سے جو باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑدو۔ اگر تم مومن ہو اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو جان لو کہ تم خدا اور اس کے رسولؐ سے جنگ کروگے۔ پھر اگر تم توبہ کرلو گے تو تمہارا سرمایہ تمہارے ہی پاس رہے گا۔ (یعنی اصلی پونجی تمہارے ہی پاس رہے گی نہ کہ اس کا سود)تم ظلم نہ کرو تمہارے اوپر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

پہلی آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ سود خوری روح ایمانی سے میل نہیں کھاتی ہے اور دوسری آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ مسلسل سود کھانا خدا اور اس کے رسولؐ سے جنگ کا اعلان کرنا ہے اگر وہ توبہ کر لیں او رپشیمان ہوجائیں تو ان ک یلئے عدل سے کام لیا جائے گا یعنی ان کی اصلی پونجی سود کے بغیر واپس کردی جائے گی۔ اس صورت میں وہ نہ ظالم ہونگے اور نہ مظلوم۔

اس سورے کی دوسری آیتوں میں اس طرح ارشاد ہے:

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اس شخص کی مانند کھڑے ہونگے کہ جو شیطان کے چھونے کی وجہ سے پاگل ہوگیا ہے اور اپنا تعادل برقرار نہیں رکھ سکتا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں : تجارت بھی تو سود ہی جیسی ہے، جب کہ خدا نے بیع(تجارت ) کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ خدا سود کو نابود کرتاہے اور صدقات میں اضافہ کرتا ہے اور خدا کسی بھی ناشکرے گناہگار انسان کو دوست نہیں رکھتا۔

’’ خبط‘‘ کے معنی لغت میں، راستہ چلنے یا اٹھنے میں بدن کے تعادل کا برقرارنہ رہنا ہیں۔ اس آیت میں سود خو ر کو دیوانہ و پاگل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیا اس کا مطلب سود خور لوگوں کا دنیا میں سماجی و اجتماعی سلوک ہے؟ کہ وہ پاگلوں جیسا کام کرتے ہیں، کیونکہ ان کے اندر صحیح و اجتماعی فکر نہیں ہے مثلاً ان میں تعاون، ہمدردی، انسانی محبت نہیں ہے۔

یا قیام کرنے اور کھڑا ہونے سے مراد قیامت میں اٹھنا ہے کہ وہاں وہ دیوانوں اور پاگلوں کی طرح محشور ہونگے؟ اکثر مفسرین نے دوسرے احتمال کو قبول کیا ہے کیونکہ قیامت میں انسان کے اعمال مجسم ہوجائیں گے اور ممکن ہے کہ دونوں معنی مراد ہوں۔ امام صادق ؑ نے فرمایاہے:

سود خور دنیا سے نہیں اٹھے گا مگر اس سے پہلے ایک قسم کے جنون میں مبتلا ہوجائے گا۔

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ اس جنون و پاگل پن کا سبب شیطان ہے؟ جب کہ یہ بات واضح ہے کہ جنون و دیوانگی ایک نفسیاتی بیماری ہے اور اس کے اسباب بھی معلوم ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مس شیطان کے کنائی معنی نفسیاتی بیماری ہے اور یہ عرب میں بولا جاتا تھا اور یہ بھی بعید نہیں

ہے کہ شیطان کی پیروی کرنے والے پر اس نے اثر کیا ہو اور اس کا طبیعی اثر زائل ہوگیا ہو اور اس سے منطقی فکرکی صلاحیت سلب ہوگئی ہو بہر صورت اس آیت میں سود کھانے والوں کی دنیوی اور اخروی حاجت بیان ہوئی ہے۔

سود کھانے والوں کی منطق

سود کھانے والے کہتے ہیں : تجارت بھی سود ہی کی مانند ہے، اس میں کیا فرق ہے ؟ یہ بھی معاملہ ہے اور وہ بھی !! قرآن ان کا جواب دیتا ہے، خدا نے تجارت اور خرید و فروخت کو حلال قرار دیا ہے او رسود کو حرام گردانا ہے اور ان دونوں میں واضح فرق ہے کیونکہ خرید و فروخت، تجات، میں طرفین کو فائدہ بھی ہوسکتا ہے اور نقصان بھی لیکن سود والے معاملہ میں سود لینے والے کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ تجارت میں خرید و فروخت پیداوار اور استعمال کی راہ پر چلتے ہیں جب کہ سود خور ایسا کوئی کام انجام نہیں دیتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سود خوری کے عام ہونے کی صورت میں اصلی پونجی و سرمایہ کو خطرہ لاحق ہو جائے گا اور اقتصادی نظام متزلزل ہوجائے گا جب کہ صحیح تجارت مال و ثروت کا محفوظ محور ہے۔ اور سود میں دوسرا نقصان یہ ہوسکتا ہے کہ سود خوری طبقاتی دشمنیوں اور جنگوں کا سبب بن جائے گی حالانکہ صحیح تجارت میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۰ اور سورۂ نساء کی آیت ۱۵۹ میں بھی سود کا بیان ہے۔ صدقات، انفاق اور قرض الحسنہ کی اسلام نے اس لئے تشویق و ترغیب کی ہے کہ تاکہ طبقاتی کشمکش کا سد باب ہوجائے۔

مقروض لوگوں کو مہلت دینا

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : اگر مقروض استطاعت رکھتا ہے تو اسے اپنا قرض ادا کردینا چاہیے اور اگر وہ قرض چکانے پر قادر نہیں ہے، تو قرض خواہ کو چاہیے کہ وہ اسے اتنی مہلت دے کہ وہ اپنا قرض چکانے کے قابل ہوجائے۔ اس سلسلہ میں قرآن فرماتا ہے:

اگر مقروض، قرض چکانے پر قادر نہ ہوتو اسے مہلت دو (یہاں تک کہ وہ قرض ادا کرنے پر قادر ہوجائے ) یا اس کے قرض کو معاف کردو کہ اگر تم کچھ علم رکھتے ہوتو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

قرض الحسنہ اور سود کے حرام ہونے سے متعلق ہم پہلے بھی کچھ آیات و احادیث بیان کرچکے ہیں۔ اس آیت میں قرض خواہ کا سود کے بغیر اپنا اصلی سرمایہ لینے کے بعد ایک حق یہ بیان ہوا ہے کہ اگر مقروض اپنا قرض چکانے سے عاجز ہوتو نہ صرف یہ کہ تم جاہلیت کی رسم پر سود پر سود چلاؤ اور اس پر اور زیادہ بوجھ بڑھاؤ بلکہ اصل قرض کو ادا کرنے کے لئے اس کو مہلت دو تاکہ وہ مستطیع ہونے کی صورت میں قرض ادا کرسکے۔ اسلامی قوانین میں جو کہ اس آیت کے مفہوم کو روشن کرتے ہیں۔ اس بات کی تصریح ہوئی ہے کہ مقروض سے کسی بھی صورت میں قرض کے عوض گھر اور ضروریات زندگی کو قرق نہیں کیا جاسکتا ہاں !قرض خواہ ان میں سے اضافی چیزوں کو اپنے حق کے عوض لے سکتا ہے۔ یہ پسماندہ طبقات کے حقوق کی حمایت ہے۔

اس آیت کے دوسرے ٹکڑے میں اس سے عظیم مرحلہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ اگر مقروض حقیقت میں اپنے حقوق کی ادائیگی سے عاجز ہو تو بہتر یہ ہے کہ قرض خواہ ایک انسانی قدم اٹھائے اور قرض کو معاف کردے کہ یہ اس کے لئے بہتر ہے اور جو بھی اس کام کے فوائد کو جانتا ہے وہ اس حقیقت کی تصدیق کرے گا۔ اگر ہم اس آیت کا موازنہ امام زین العابدین ؑ کے اس قول ’’ تم نے اس کا مال لیا ہے کہ اس کے ساتھ بدسلوکی سے پیش نہ آؤ کیونکہ یہ انسانیت سے گری ہوئی بات ہے ‘‘ سے کریں تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے اور اس کے اتباع میں ائمہ نے مسلمانوں کے لئے کتنے دلچسپ اور اہم مسائل بیان فرمائے ہیں اور ان کے لئے قرض خواہ اور مقروض کے حقوق کی اچھی طرح وضاحت کردی ہے۔

اس حق کے آخر میں ہم ’’ باب فی انظار المعسر ‘‘ کی طرف اشارہ کرتے ہیں :مرحوم فیض نے کتاب شافی، کی دوسری جلد میں لکھا ہے : اس بات میں اس شخص کاثواب بیان ہوا ہے کہ جو اس مقروض کو مہلت دیتا ہے جو قرض ادا کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

امام صادق ل فرماتے ہیں : جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا اس روز اسے سایہ میں رکھے کہ جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا(اسی جملہ کی تین بار تکرار فرمائی لوگ اس کے حق کے بارے میں سوال کرنے کے لئے بے تاب تھے) آپ ؑ نے فرمایا: اس شخص کو ادا کرنے کی مہلت دینے والا کہ جو مقروض ہو اور قرض ادا کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو یا اس کا قرض معاف کردے اس عمل کے نتیجہ میں وہ روز قیامت حضرت حق کے زیر سایہ ہوگا۔

امام صادق ؑ سے مروی ہے کہ ایک روز رسول ؐ منبر پر تشریف لے گئے خدا کی حمد و ثنا کی اور انبیاء پر درود و سلام بھیجا پھر فرمایا: جو لوگ میرے سامنے موجود ہیں وہ ان لوگوں تک میری بات پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں جان لو کہ جس شخص نے اس مقروض کو مہلت دی جو قرض ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے اس کا خدا پر یہ حق ہے کہ اسے قرض کی ادائیگی تک ہر روز اس مال کے برابر صدقہ کا ثواب دے۔ پھر امام صادق ؑ نے اس آیت کی تلاوت کی :

اگر تنگ دست ہے تو اسے مہلت دو یہاں تک کہ وہ قرض ادا کرنے کے قابل ہوجائے اور اگر قرض معاف کردو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ وہ تنگ دست ہے اپنا مال اسے صدقہ میں دیدو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔

رسولؐ سے منقول ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا: جس طرح تمہارے مقروض کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ و ہ استطاعت رکھتے ہوئے قرض چکانے میں ٹال مٹول کرے اسی طرح تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم اس کو نادار سمجھتے ہوئے اس سے قرض کا مطالبہ کرو۔

امام صادق ؑ سے عرض کیا گیا کہ عبدالرحمٰن بن سیابہ کا ایک شخص پر کچھ قرض تھا وہ مرگیا : ہم نے ابن سیابہ سے درخواست کی کہ وہ اس قرض کو معاف کردیں لیکن انھوں نے معاف نہیں کیا۔ امام ؑ نے فرمایا: وائے ہو اس پر کیا اسے یہ خبر نہیں ہے کہ اگر وہ معاف کردے گا تو اسے ہر درہم کے عوض دس درہم ملیں گے اور اگر معاف نہیں کرے گا تو ایک درہم کے بدلے ایک ہی درہم ملے گا۔

معاشر کا حق

تمہارے اوپر معاشر کا حق یہ ہے کہ اسے فریب نہ دو، اس سے دغا نہ کرو، اس سے جھوٹ نہ بولو، اس کو غافل نہ کرو اور اس کے ساتھ دشمن جیسا سلوک نہ کرو کہ جو مد مقابل کا کوئی پاس و لحاظ نہیں کرتا ہے اگر وہ تم پر اعتماد کرتا ہے تو جہاں تک ہوسکے اس کے لئے کوشش کرو اور یہ بات تم جانتے ہو کہ اعتماد کرنے والے کو دھوکا دینا سود کی مانند ہے اور خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

خلیط، اس شخص کو کہتے ہیں جس کی زندگی کسی بھی عنوان سے دوسرے سے گھلی ملی ہو، جیسے شریک، ساتھ کام کرنے والا ہم سبق، امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : جو شخص تم سے گھل مل گیا ہے اس کا تمہارے اوپر ایک حق ہے اور وہ یہ کہ اسے فریب نہ دو اور اس سے دغا نہ کرو اس کے ساتھ دشمن جیسا سلوک نہ کرو اور جب اس نے تم پر اعتماد کرلیا ہے تو اسے نقصان نہ پہنچاؤ۔

مصاحب و رفیق کے سلسلہ میں ہم اس سے قبل بہت سی آیات و روایات نقل کرچکے ہیں کہ جن کا معاشر کے حق سے کوئی ربط نہیں ہے لہٰذا یہاں ان کی تکرار نہیں کریں گے لیکن جو احادیث خلیط و معاشر سے متعلق ہیں ان کو نذر ناظرین کریں گے۔

معاشر احادیث کی روشنی میں

امام صادق ؑ سے منقول ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: سب سے زیادہ سعادت مند وہ انسان ہے جو شریف اور بزرگ لوگوں کے ساتھ معاشرت کرے۔ اس حدیث میں انسان کی سعادت کا ایک سبب یہ بیان ہوا ہے کہ انسان بزرگ و شریف لوگوں سے دوستی رکھتا ہو۔

آپ ؐ کا ارشاد ہے:

علماء سے دریافت کرو حکماء سے گھل مل جاؤ اور فقیروں کے ساتھ نشست و برخاست کرو۔ اس حدیث میں رسولؐ نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ لوگوں کو حکماء سے رابطہ نہیں توڑنا چاہیے۔

اچھے دوست کے صفات

رسولؐ نے فرمایا:

جس شخص کو خدا خیر دینا چاہتا ہے اسے نیک و صالح دوست عطا کرتا ہے اگر یہ اسے فراموش کردیتا ہے تو وہ اسے یاد کرتا ہے اور اگر یہ اس کو یاد کرتا ہے تو وہ اس کی مدد کرتا ہے۔

انسان کو ایسے دوست کا انتخاب کرنا چاہیے جو سلیم و کامل عقل رکھتا ہو اور تجربہ کار ہو یہ بات ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ نادان و کم عقل دوستوں سے کنارہ کشی کرنا چاہیے۔ اسے دیندار، نیک منش، خوش خلق اور مہذب ہونا چاہیے کہ بد اخلاق دوست اسے شرارت و بدی کے میدان میں کھینچ لے جائے گا۔ وہ خود دوستی کرنے کا رجحان رکھتا ہو اور دوست سے دو، روئی سے نہ ملتا ہو۔

امام زین العابدین ؑ نے انسان کو دوست کے ساتھ مکروحیلہ کرنے سے منع کیا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اصول کافی میں ’’ المکر والغد والخدیعہ ‘‘ کے عنوان سے ایک باب قائم ہوا ہے۔ اس کی پہلی حدیث یہ ہے:

اگر یہ نہ ہوتا کہ مکاراور دھوکا باز جہنم میں جائیں گے تو اس سلسلہ میں میں سب سے آگے ہوتا۔لیکن مکار ہرگز عقلمند نہیں ہے، مکر وخدعہ اس فعل کو کہتے ہیں کو جس کا فاعل باطن میں اس کے ظاہر کے خلاف قصد وارادہ کرے۔ اس باب کی تیسری روایت میں اس طرح بیان ہوا ہے:

امام صادق ل سے روایت ہے کہ رسولؐنے فرمایا، جس شخص نے کسی مسلمان سے مکر کیا اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جھوٹے کا بھائی بننے سے بچے کیونکہ جو جھوٹ میں مشہور ہوجاتا ہے اگر وہ سچ بھی بولتا ہے تو بھی اس کو جھٹلایا جاتا ہے۔ دوست خداوند عالم کی عظیم نعمت ہے انسان پر اس کا حق ہے مکروفریب کے ذریعہ اس کے حق کو پامال نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہر دوست کو چاہیے کہ وہ اپنے دوست کا حق ادا کرے۔

مدعی اور مدعا علیہ کا حق

جس شخص نے تم پر دعویٰ کیا ہے اس کا تم پر یہ حق ہے کہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچا ہے تو اس کی دلیل کو باطل نہ قرار دو اور اس کے دعوے پر خط تنسیخ نہ کھینچو بلکہ اس موقع پر تم اپنے مخالف بن جاؤ اور اس کے حق میں اپنے خلاف فیصلہ کرو او گواہوں کی گواہی کے بغیر اس کے حق کے گواہ بن جاؤ کیونکہ یہ تمہارے اوپر خدا کا حق ہے اور اگر اس نے تمہارے اوپر جھوٹا دعویٰ کیا ہے تو اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، اس کو ڈراؤ، اسے اس کے دین کی قسم دو اور خدا کو یاد دلا کر اس کی شدت و تندی کو گھٹاؤ، اس کے ساتھ سخت کلامی سے پیش نہ آؤ کیونکہ یہ کام دشمن کے ظلم کو تم سے نہیں ہٹا سکتا، بلکہ اس سے تم گناہ کے مرتکب ہوگے اور اس کے باعث دشمن کی تلوا تمہارے لئے اور زیادہ تیز ہوجائے گی کیونکہ بری بات شر انگیز ہوتی ہے جب کہ نیک اور اچھی بات برائی کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ جس شخص نے تمہاے اوپر دعویٰ کیا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہے یا وہ اپنے دعوے میں سچا ہے اور حق اس کے ساتھ ہے تو اس صورت میں تم پر اس کا حق یہ ہے کہ اس کی بات مان لو اور اپنے خلاف اقدام کرو کیونکہ یہ خدا کا حق ہے اور اگر اس کا دعویٰ باطل ہے تو اس کا حق یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرو اور اس کی حدت و سختی کو کم کرو تلخ لہجہ میں گفتگو کرکے اس کی شدت میں اضافہ نہ کرو کہ نتیجہ میں اس کی تلوار کی دھا ر تمہارے خلاف اور زیادہ تیز ہوجائے گی بلکہ صبروتحمل کے ساتھ اس سے بات کرکے اس کی غلط فہمی دور کرو۔

لیکن جس نے تم پر دعویٰ کیا ہے اس کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ اگر تم اس دعوے میں حق بجانب ہوتو اس سے حق لینے کے لئے تحمل و صبر سے کام لو کیونکہ مدعا علیہ کے لئے دعویٰ شدید جھٹکا ہے اسے آرام کے ساتھ اپنی دلیل سمجھاؤ اسے مہلت دو اور واضح و روشن بیان کے ذریعہ اس سے پوری مہربانی کے ساتھ پیش آؤ اور اس کے ساتھ قیل و قال سے جو جھگڑا ہوجاتا ہے اس کے سبب اپنی دلیل سے دست کشی اختیار نہ کرو کہ تمہارے ہاتھ سے دلیل نکل جائے، اور پھر تم اس کی تلافی نہ کرسکو، خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر حق تمہارے ساتھ ہے تو اطمینان و سکون کے ساتھ اپنا استدلال پیش کرو اور صبر و تحمل کے ساتھ اپنے دعوے کو ثابت کرو، کچھ اس طرح استدلال کرو کہ جس سے دعویٰ باطل نہ ہو اور تمہارا حق تلف نہ ہو۔

اختلاف کا سبب

انسانوں کی ایک اہم آرزو یہ ہے کہ وہ اس دنیا کی مختص زندگی کو آرام و چین سے بسر کریں، ان کے حق پر کوئی بھی حملہ نہ کرے اور ان کی زندگی میں عشق و محبت کی حکمرانی ہو نزاع و تکرار اور لڑائی جھگڑے کا گذر تک نہ ہو لیکن دوسری طرف سارے انسانوں کوحرص و طمع، خود پسندی، اور تکبر نے گھیر رکھا ہے، انھیں باتوں کی وجہ سے وہ اپنے حق پرقناعت نہیں کرتے اور دوسروں کے حق کو چھیننا چاہتے ہیں۔ یہیں سے ان کے درمیان جنگ و جدال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ فطری بات ہے کہ جس جگہ زیادہ انسان رہتے ہیں وہاں ان کے درمیان نزاع و جھگڑا بھی زیادہ ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس نزاع میں فریقین حق پر نہیں ہوسکتے یقینا ایک فریق زیادتی پر ہوتا ہے۔ یہاں سے انسانی معاشرہ کو قاضی اور ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے اختلاف کو ختم کرکے حق، حقدار تک پہنچا دے، یہ بات ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ معاشرۂ انسانی میں انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد ان کے اختلافات کو برطرف کرنا تھا۔

اسلام اختلافات کو رفع کرنے کی دعوت دیتا ہے

پہلے مرحلہ میں اسلام لوگوں کو ایک دوسرے سے محبت و مؤ دت کرنے کی دعوت دیتا ہے اس سے بڑھ کر وہ انھیں درگزر کرنے اور ایثار سے کام لینے کی تشویق کرتا ہے۔ انھیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اختلافات پیدا نہ ہونے دیں۔ مہاجرین و انصار کے بعد پیدا ہونے والے تابعین کے بارے میں خدا فرماتا ہے:

جو ان لوگوں کے بعد آئے ہیں وہ کہتے ہیں ہمارے پروردگار ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم پر سبقت کی ہے اور ہمارے دلوں میں مومنوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ ہونے دے، ہمارے رب ! تو مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

ان کے لئے یہ تین اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ ۱۔ ان کو اپنی اصلاح، بخشش اور توبہ کی فکر تھی۔ ۲۔ اپنے سے پہلے لوگوں کو مومن بھائی سمجھتے تھے کہ جو ہر لحاظ سے قابل احترام ہیں۔ ۳۔ وہ اپنے دل سے کینہ و حسد کو باہر رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا تعلق دنیوی زندگی سے ہے آخرت کی ابدی زندگی کے بارے میں سورۂ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

ان کے دلوں میں جو کینہ و حسد ہے ہم اسے باہر پھینک دیتے ہیں (تاکہ وہ صدق و صفا کے ساتھ زندگی بسر کریں ) اور ان کے محلوں کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور وہ کہتے ہیں ساری تعریف خدا کے لئے ہے کہ جس نے ان نعمتوں کی طرف ہماری راہنمائی کی ہے۔

جس خوشگوار اور صدق و صفا اور خلوص آگیں زندگی کو انسان اس دنیا میں تلاش کرتا ہے اور حاصل نہیں کرپاتا، خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ زندگی ہم تمہیں جنت میں دیں گے۔ اسلام نے پہلے مرحلہ میں اس زندگی کی دعوت دی ہے کہ جس میں دشمنی و حسد نہ ہو اگر ایسا نہیں کریں گے تو انسانوں کے درمیان جنگ و جدال ہوگا اسلام کا ایک دستور اصلاح ذات البین بھی ہے یعنی دو افراد کے درمیان صلح کرانا۔

اختلافات ختم کرانا اور صلح کرانا

کافی میں ایک با ’’ الاصلاح بین الناس ‘‘ قائم کیا گیا ہے، اگر دو بھائیوں کے درمیان اختلاف و نزاع ہوجائے تو مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ ایک عبادت کے عنوان سے ان میں صلح کرادیں۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

حبیب احول سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا میں نے امام صادق ؑ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس صدقہ کو خدا دوست رکھتا ہے وہ لوگوں کے درمیان اس وقت صلح کرانا ہے جب ان میں اختلاف ہو اور جب نزاع کے سبب ان میں دوری ہوگئی ہو اس وقت انھیں ایک دوسے سے قریب کرنا ہے۔

دوسری حدیث میں امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

کیونکہ دو افراد کے درمیان صلح کرانا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ دو دینار صدقہ دوں۔ لیکن اگر فرد ثالث کے ذریعہ ان کا اختلاف رفع نہ ہو اور بات عدالت تک پہنچ جائے تو عدل گستری اور حق کو حقدار تک پہنچانے کے لیے اسلام نے اپنے قضائی دستورات میں بہترین قضائی معیار مقرر کئے ہیں۔قاضی کو عادل ترین انسان ہونا چاہیے کہ وہ دونوں کی باتوں کو غیر جانب دارانہ طور پر سنے، دوسرے اپنے فیصلے میں اس کی نظر خدا کی رضا پر مرکوز ہو۔

ہم اپنی اس بحث میں اسلام کے قضائی دستورات کو پیش کریں گے جو مدعی اور مدعا علیہ کے حق سے مناسبت رکھتے ہیں۔

اسلام کے قضائی قوانین

یورپی ممالک میں قضاوت کے سلسلہ میں جو اہم ترین اقدامات کئے گئے ہیں ان کا تعلق درج ذیل تین چیزوں سے ہے۔

الف۔ قاضی تحفظ و استقلال کا حامل ہوتا کہ وہ خیانت کا ر کو، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو سزا دے سکے۔

ب۔ قاضی کی تنخواہ اتنی ہونا چاہیے کہ جس سے اس کی زندگی کی تمام ضروریات پوری ہوجائیں تاکہ وہ خیانت کرنے والے مالدارکی طمع دلانے میں نہ آئے اور قانون کی رو سے اس کو اس کی خیانت کی سزا دے سکے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کی حکومت نے اس سلسلہ میں بڑا قدم اٹھایا ہے کیونکہ اس نے ججوں کے لیے، حقوق و تنخواہیں معین نہیں کی ہیں بلکہ حکومت کے دستخط شدہ سادہ چیک ججوں کے پاس موجود ہتے ہیں جتنا جج چاہے نکالے۔

ج۔ عدالت میں جج کی نظر میں سب یکساں ہونگے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہوگی۔

یہ تین چیزیں یورپ کا عظیم شاہکار ہیں لیکن ہم اسلام کے قضائی دستورات میں ان امتیازات کو بخوبی ملاحظہ کرسکتے ہیں۔

جج کے اختیارات

دین اسلام نے ججوں کو جتنے اختیارات دیئے ہیں اتنے حکومت کے دوسرے اعضاء کو نہیں دیئے ہیں ہاں حاکم او ر اس کے نائب کی بات ہی دوسری ہے۔ حضرت امیر المومنین ؑ نے دستور العمل کے عنوان سے مالک اشتر کو اس وقت ایک دستاویز لکھی تھی جب انھیں مصر کا حاکم مقرر کیا تھا، تحریر فرماتے ہیں :

پھر لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے اس شخص کا انتخاب کرو جو تمہارے نزدیک عام لوگوں سے افضل و شائستہ ہو، اپنے یہاں اس کو اتنی عزت و عظمت دو کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس کی طمع نہ کرسکے اور اس طرح وہ تمہاے مصاحبوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہے۔ اے مالک قاضی و جج کو اتنی سہولتیں اس لیے دو تاکہ ملک میں اسے آزادی حاصل ہو کہ وہ مجرم کو بغیر کسی خوف و ہراس کے عدالت میں کھینچ لائے اور اسے قانون کے کٹہرہ میں کھڑا کردے خواہ وہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو۔

جج مالی لحاظ سے مستغنی ہو

زندگی کے اخراجات کے سلسلہ میں حضرت علی ؑ نے انھیں مالی استقلال کا بلند ترین درجہ دیا ہے، اسی دستاویز میں تحریر فرماتے ہیں :

اور اسے اتنی تنخواہ و معاوضہ دو جو اس کی ضروریات کو پورا کردے تاکہ انھیں دوسوں کا دست نگر نہ ہونا پڑے اگر وہ دوسروں کے دست نگر ہونگے تو انھیں کوئی بھی طمع دلا سکتا ہے۔ لہٰذا مالک کو حکم دیتے ہیں کہ انھیں بیت المال سے اتنا دو کہ وہ دوسروں سے بے نیاز ہوجائیں۔

عدالت میں جج کے فرائض

تیسرا موضوع مساوات ہے دین اسلام نے عدالت میں مساوات کے پایوں کو اتنا بلند کیا ہے کہ جن کی بلندیوں تک نہ صرف یہ کہ یورپی ممالک نہیں پہنچ سکتے بلکہ ابھی دسیوں صدیوں تک دنیا عدالت میں ایسی مساوات قائم نہیں کرسکے گی۔ اسلام کے نقطہ ٔ نظر سے عدالت میں قاضی و جج کے فرائض یہ ہیں :

الف۔ فریقین کو ایک نظر سے دیکھنے کے لیے دین اسلام نے کچھ احکام مقرر کئے ہیں، فریقین کے بیٹھنے کی ایک جگہ ہوگی اور ان دونوں کو اوپر یا نیچے ایک ہی جگہ بیٹھنا ہوگا۔ اگر ایک فریق حکومت کا آدمی ہو اور دوسرا پست رعایا سے تعلق رکھتا ہوتو بھی قاضی کا فرض ہے کہ انھیں ایک جگہ بٹھائے اور عدالت میں ان کے درمیان امتیاز نہ برتے، اس دعوے کی دلیل کے لیے درج ذیل داستان ملاحظہ ہو:

ہارون اور جج

لکھا ہے کہ ہارون رشید خ بنی عباس کا مقتدر خلیفہ، اعمال حج کے انجام دہی کے بعد مدینہ پہنچا۔اہل مدینہ نے اس سے کہا: ہمارے جج کا انتقال ہوگیا ہے لہٰذا مدینہ میں کسی پاک دامن جج کا تقر کردیجئے انھوں نے اہل مدینہ میں سے دو پاک دامن افراد کی تائید کی۔ ہارون رشید نے یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ علم و شائستگی رکھتا ہے اور منصب قضاوت کو کون اچھی طرح سنبھال سکتا ہے ان میں سے ایک کو طلب کیا۔ ہارون رشید کا وزیر اعظم بھی اس کے پاس کھڑا تھا، ہارون رشید نے اس آدمی سے سوال کیا:میرے اور میرے وزیر اعظم کے درمیان ایک ملک کے سلسلہ میں اختلاف ہوگای، ہارون نے اختلاف کی وجہ بیان کرنے کے بعد اس سے کہا: اس کا فیصلہ کرو، اس شخص نے کچھ غور کرنے کے بعد کہا: اس مقدمہ میں خلیفہ حق بجانب ہیں۔ ہارون رشید نے اسے رخصت کردیا اور دوسرے آدمی کو طلب کیا اور وہی فرضی جھگڑا اس سے بیان کیا اور کہا : تم اس کا فیصلہ کرو، اس شخص نے کہا: میں فیصلہ نہیں کرسکتا کیونکہ قضاوت و فیصلہ کے شرائط موجود نہیں ہیں جھگڑے و مقدمہ کے ایک فریق آپ ہیں کہ مخصوص جگہ تشریف فرما ہیں اور وزیر اعظم جو کہ دوسرا فریق آپ کے سامنے کھڑا ہے جب کہ اسلام کے نقطہ ٔ نظر سے مدعی اور مدعا علیہ کی جائے

نشست ایک ہی ہونا چاہیے۔ ہارون رشید کو اس کی یہ بات بہت پسند آئی اور اس کو جج مقرر کردیا۔

ب۔ فریقین کے درمیان مکمل طور سے مساوات برقرار کرنے کے لیے جج کا فریضہ ہے کہ وہ ان دونوں کی طرف اشارہ اور نگاہ کرنے میں بھی مساوات کا خیال رکھے اور عدالت میں ایک کی طرف دوسرے سے زیادہ ملتفت نہ ہو یا اس کی طرف ہاتھ سے زیادہ اشارہ نہ کرے۔

ج۔ عدالت کی کرسی پر جج کا فرض ہے کہ فریقین سے برابر گفتگو کرے اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ ایک سے دوسرے سے زیادہ گفتگو کرے۔

د۔ فریقین میں سے ایک کی طرف اتنی ہی دیر ملتفت رہے جتنی دیر دوسرے کی طرف ملتفت تھا، حضرت امیر المومنین ؑ نے محدثین ابی بکر کو تحریر فرمایا:

ان کے لیے خاکسار بن جاؤ، ان سے کشادہ روئی اور خندہ پیشانی سے پیش آؤ اور سب کو ایک آنکھ سے دیکھو،

خواہ گوشہ چشم سے دیکھو یا بھر پورے طریقے سے تاکہ بڑے آدم تم سے یہ توقع نہ کریں کہ چھوٹوں پر ظلم کرو اور ناتواں و پسماندہ لوگ تمہارے عدل سے مایوس نہ ہوں۔

دوسرے والی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

گوشۂ چشم سے دیکھو نظر بھر کر دیکھو ایک آنکھ سے دیکھو اشارہ یا زبان سے سلام کرنے میں سب کے ساتھ یکساں سلوک کرو تاکہ بڑے آدمیوں کو تمہاری بے جا طرف داری کی امید نہ ہوجائے۔

جج کے فرائض کے سلسلہ میں شہید اول کا نظریہ

جج و قاضی پر واجب ہے کہ وہ فریقین سے بات کرنے، دیکھنے، سلام کرنے، بات سننے، انصاف کرنے، اور دوسرے احترامات میں یکساں برتاؤ کرے لیکن اگر فریقین میں ایک مسلمان اور دوسرا کافر ہوتو مسلمان کو بلند جگہ پر بٹھائے یا مسلمان کو بٹھائے اور کافر کو کھڑا رکھے ہاں قاضی پر یہ وجاب نہیں ہے کہ وہ قلبی طور سے دونوں کو برابر سمجھے۔ یہ تھا قاضی و جج سے متعلق فقہی حکم لیکن قضاوت و فیصلہ کے وقت:

اور جب فریقین میں سے ایک پہلے اپنا دعویٰ پیش کردے تو قاضی اس کی بات سنے گا اور اگر دونوں ایک ساتھ پیش کریں تو قاضی دائیں طرف والے کی بات پہلے سنے گا اور اگر دونوں خاموش ہوں تو قاضی کہے گا کہ جو مدعی ہے وہ مدعا بیان کرے یا یہ کہے گا کہ تم دونوں بات کرسکتے ہو، قاضی کا کسی ایک کو مخاطب قرار دینا مکروہ ہے۔

مذکورہ عبارت شہید اول کتاب لمعہ سے ماخوذ ہے۔

مدعی و مدعا علیہ

مدعی کون ہے اور منکر کون ہے ؟شہید لکھتے ہیں : مدی وہ ہے کہ اگر وہ اپنا دعویٰ ختم کردے تو قضیہ ہی ختم ہوجائے اور منکر اس کا مد مقابل ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر وہ چھوڑ دے تو چھوٹ جائے بلکہ وہ مدعی کا جواب دہ ہے۔ مدعا علیہ بھی تین حالتوں سے خالی نہیں ہے :منکر یا مدعی علیہ یا اس کو قبول کرے یا اسے رد کردے یا خاموش ہوجائے اور قاضی کے لیے ان تینوں کا حکم ایک ہے۔

قضاوت کے دو معیار

کتاب وسائل الشیعہ کے ابواب کیفیت حکم و احکام دعویٰ کے تیسرا باب ’’ البینۃ۔۔۔۔۔‘‘ کے عنوان سے ہے اس میں اس طرح بیان ہوا ہے :

امام صادق ل سے منقول ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: دعویٰ کرنے والے بینہ اور دلیل پیش کرنا ہوگی اور منکر کو قسم کھانا پڑے گی۔

ابو بصیر نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا: بیشک خدا نے تمہارے خون کے بارے میں حکم فرمایا ہے۔ یہ حکم تمہارے

اموال کے حکم سے مختلف ہے اموال کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ دعویٰ کرنے والا دلیل و بینہ پیش کرے گا اور منکر قسم کھائے گا لیکن تمہارے خون کے بارے میں مدعا علیہ بینہ پیش کرے گا اور مدعی قسم کھائے گا تاکہ مسلمان کا خون رائیگاں نہ جائے۔

امام رضاؑ نے ایک سوال کے جواب میں اس کی وہ اس طرح بیان فرمائی ہے :

خون کے علاوہ تمام امور میں دعویٰ کرنے والے پر بینہ اور مدعا علیہ کے لیے قسم یا اس کی علت یہ ہے کہ منکر اپنے انکارپر بینہ قائم کرنے سے قاصر ہے کیونکہ معلوم نہیں ہے لیکن خون میں بینہ منکر کے لیے اور قسم دعویٰ کرنے والے کے لیے ہے اس لیے کہ یہ ایک احتیاط ہے جس سے مسلمان کا خون رائیگاں نہیں جائے گا دوسرے یہ بات قاتل کو جھنجھوڑنے والی ہے۔ منکر کے لیے بینہ قائم کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ ایسی گواہی دینے والے بہت کم ہیں کہ وہ قاتل نہیں ہے۔

ان روایات سے اسلام میں قضاوت کا معیار معین ہوگیا اور یہ معلوم ہوگیا کہ بینہ مدعی کے لیے اور قسم منکر کے لیے ہے ہاں خون میں ایسا نہیں ہے کہ جس کا فلسفہ بیان ہوچکا ہے۔ امام زین العابدین ؑ نے رسالۃ الحقو میں مدعی و مدعا علیہ کے فقہی حکم کے اخلاقی پہلو کو بیان فرمایا ہے۔

امام زین العابدین ؑ نے مدعی اور منکر کے اخلاقی پہلو کو بیان فرما دیا ہے اور ان کے لیے حق کو اس طرح روشن فرمایا ہے کہ جس مخالف نے تمہارے اوپر دعویٰ کیا ہے اس کا تم پر حق ہے کہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچا ہے تو تم خود اپنے خلاف اور اس کے حق میں گواہی دو اور اس پر ظلم نہ کرو اور اس کا پورا پورا حق ادا کرو اور اگر اس کا دعویٰ صحیح نہیں ہے تو اس سے نرمی سے پیش آؤ اور اس سے سختی سے پیش نہ آؤ اس کے سلسلے میں خدا کو ناراض نہ کرو، اور جس پر تم نے دعویٰ کیا ہے اس کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ تم اپنے دعوے میں سچے ہوتو اس سے خوش اسلوبی سے گفتگو کرو اور اس کے حق کا انکار نہ کرو اور اگر اپنے دعوے میں تم سچے نہیں ہوتو خدا سے ڈرو! او رتوبہ کرو اور دعوے سے دست کش ہوجاؤ۔

امام زین العابدین ل نے فریقین کو حقیقت کی طرف دعوت دی ہے اور ان کو ظلم و ستم کرنے سے منع کیا ہے اور انھیں ظالم ججوں کے پاس جانے سے منع فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں اور اسلامی قضا و فیصلہ سے متعلق ہیں اس کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔

مشورہ لینے والے کا حق

جو تم سے مشورہ لیتا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اگر اس کے کام کے بارے میں تمہارے پاس کوئی رائے ہے تو اس کی نصیحت و خیر خواہی کے لیے کوشش کرو اور تم جو کچھ جانتے ہو وہ اسے سمجھاؤ او ر اس سے یہ کہو کہ اگر تم اس کی جگہ ہوتے تو اس پر عمل کرتے یہ اس لیے ہے تاکہ تمہاری طرف سے اس پر مہربانی ہو کیونکہ نرمی و مہربانی وحشت کو ختم کردیتی ہے سختی وحشت پیدا کرتی ہے اور اگر تم اسے کوئی مشورہ نہیں دے سکتے لیکن تمہاری نظر میں کوئی ایسا آدمی ہو جس پر تمہیں اعتماد ہے اور اس سے مشورہ لینے کو پسند کرتے ہو تو اس کی طرف اس کی راہنمائی کردو اور اسے اس کا پتہ بتا دو اس کے بارے میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور اس کو نصیحت کرنے میں دریغ نہ کرو، خدا کی پناہ کے علاوہ کوئی پناہ نہیں اور اس کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ امام زین العابدین ؑ یہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی سے مشورہ کرتا ہے اس کا مشیر پر ایک قسم کا حق ہوجاتا ہے اور وہ حق یہ ہے کہ اگر اس سلسلہ میں تمہاری کوئی صحیح رائے ہو تو اس کو پیش کرنے میں دریغ نہ کرو، بلکہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کردو اوراگراس سلسلہ میں کوئی رائے نہ ہو لیکن ایسے آدمی کو پہچانتے ہو کہ جو مشورہ دے سکتا ہے تو اسے اس کے پاس پہنچا دو تاکہ یہ اس کے صحیح مشورہ سے مستفید ہو۔

مشاورت اسلام کی نظر میں

اسلام میں اجتماعی اہم مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ مشورہ ہے یہ کاموں کے استحکام و پائیداری کا سبب ہوتا ہے۔ مشورہ کے بغیر کوئی بھی کام ناقص ہوتا ہے، فکروخیال کے لحاظ سے کوئی شخص کتنا ہی قوی ہو لیکن اس کی نظر مسائل کے ایک یا چند پہلوؤں ہی تک پہنچتی ہے اور اس کے دوسرے پہلو اس پر مخفی رہتے ہیں مگر جب وہ مسائل کمیٹی میں پیش ہوتے ہیں اور مختلف عقلیں، تجربہ اور نظریات ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں تو اس کے نقائض کم ہوجاتے ہیں۔

اسلام میں مشورہ کی اتنی اہمیت ہے کہ اس سے قطع نظر کہ رسولؐ پر وحی نازل ہوتی تھی اور آپ ؐ کی فکر و نظر بہت قوی تھی اور آپ کو مشورہ کی ضرورت نہیں تھی لیکن ایک طرف مسلمانوں کو مشورہ کی اہمیت سے آگاہ کرنے اور دوسری طرف لوگوں میں غوروفکر کی استعداد بڑھانے کے لیے آپ ؐ مسلمانوں کے ان عام امور میں کہ جن میں خدا کے قوانین جاری ہونے کا پہلو تھا، نہ کہ قانون گذاری میں مشورہ لیتے تھے اور صاحبان نظر کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔

مشورہ کے نتائج

۱۔ جو لوگ اپنے اہم کام ایک دوسرے کے مشورہ اور اصلاح سے انجام دیتے ہیں ان سے کم لغزش ہوتی ہے اس کے برخلاف خود رائے اور استبداد پسند افراد خود کو دوسروں کی رائے و مشورہ سے بے نیاز سمجھتے ہیں ہر چند وہ بڑے دور اندیش ہوں لیکن یہ ان کی خام خیالی ہے، خودرائی انسان کی شخصیت کو لوگوں کے درمیان میں کچل دیتی ہے، اور اس کی بلند خیالی کو منجمد کردیتی ہے، اس کی ابھرنے والی صلاحیتوں کو دبا دیتی ہے۔

۲۔ جو شخص کسی کام کی انجام دہی کے لیے دوسروں سے مشورہ کرتا ہے اگر وہ اس میں کامیاب ہوجاتا ہے تو لوگ اس سے کم حسد کرتے ہیں، کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی ہماری وجہ سے کامیابی ملی ہے اور جس کام کو انسان خود انجام دیتا ہے اس پر حسد نہیں کرتا ہے اور اگر اس میں ناکامی ہوتی ہے تو لوگ اسے ملامت نہیں کرتے ہیں کیونکہ کوئی اپنے کام کے نتیجہ پر اعتراض نہیں کرتا ہے بلکہ اس کی شکست و ناکامی پر لوگوں کو افسوس ہوگا۔

۳۔ مشورہ کا ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنے بارے میں یہ سمجھ لیتا ہے کہ کس کو اس سے محبت ہے اور کس کو عداوت ہے اور اس سے اس کی کامیابی کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے۔ شاید رسول ؐ بھی انھیں وجوہ کی بنا پر مشورہ لیتے تھے۔

مشورہ قرآن کی نظر میں

خدا کے فضل سے آپ ؐ ان کے لیے نرم ہیں اگر تند مزاج اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے بنابریں انھیں معاف کردو اور ان کے لیے استغفار کرو لیکن جب ارادہ کرچکو تو پھر خدا پر بھروسہ کرو بیشک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

’’ فظ‘‘ لغت میں اس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جو سخت و تند لہجہ میں بات کہتا ہے اور غلیظ القلب اس شخص کو کہتے ہیں جو سنگدل اور سخت ہوتا ہے اگرچہ یہ دونوں لفظ سختی و شدت کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن ان میں سے ایک لہجہ میں سختی کے معنی میں زیادہ استعمال ہوتا ہے جب کہ دوسرا عمل میں سختی و شدت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

رسول ؐ پر یہ آیت جنگ احد میں نازل ہوئی تھی۔یہ اس صفت کی عکاسی کرتی ہے جو قیامت کے لیے ضروری ہے اوروہ ہے ان لوگوں کو معاف کردینا جنھوں نے روگردانی کی ہے اور بعد میں پشیمان ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ اگر رہبر و قائد تند مزاج ہو، درگذر نہ کرتا ہوتو اس کا منصوبہ عنقریب ناکام ہو جائے گا اور لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور وہ قیادت کے فرائض کو انجام نہیں دے سکے گا۔

اس آیت میں رسولؐ کو خدا کی طرف سے یہ ذمہ داری ملی ہے کہ ان سے مشورہ کیجئے ’’ وشاور ھم فی الامر‘‘ اگرچہ لفظ امر کے بہت وسیع معنی

ہیں۔ تمام کاموں کو شامل ہیں لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ رسولؐ احکام خدا کے بارے میں کسی سے مشورہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں وحی کے تابع تھے۔ ہاں اس سلسلہ میں مشورہ کرتے تھے کہ خدا کے احکام کو کیسے نافذ کیا جائے۔ بعبارت دیگر قانون سازی میں رسولؐ کبھی کسی سے مشورہ نہیں کرتے تھے قانون کے اجزاء کے طریقہ کار کے بارے میں مشورہ فرماتے تھے۔ مثلاً جنگ بدر میں لشکر اسلام رسولؐ کے فرمان کے مطابق ایک جگہ پڑاؤ ڈالنا چاہتا تھا کہ آپ ؐ کے ایک صحابی حباب بن منذر نے کہا: لشکر کے پڑاؤ ڈالنے کے لیے یہ جگہ آپ نے خدا کے فرمان کے تحت معین کی ہے یا اپنی صوابدید سے اس کا انتخاب کیا ہے؟ رسولؐ نے فرمایا اس انتخاب میں خدا کا کوئی خاص فرمان نہیں ہے۔ اس صحابی نے عرض کی : یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ رسولؐ نے بھی ان کی رائے کی تائید کی۔

دوسری آیت سورۂ شوریٰ کی ہے:

اور جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت کو قبول کرلیا ہے اور نماز قائم کی ہے اور ان کاکام آپس کے مشوہ سے انجام پذیر ہوتا ہے اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے وہ انفاق کرتے ہیں۔

لفظ شوریٰ اگر مصدر ہے اور مشاورت کے معنی میں ہے تو مذکوہ آیت میں لفظ ’’ ذو ‘‘ مقدر ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے یا اس کو مبالغہ پر حمل کریں گے او ر یہ تاکید ہوگا کیونکہ صفت کی جگہ مصدر کا ذکر کرنا انھیں معنی کو بیان کرتا ہے لیکن اگر شوریٰ کے معنی وہ ہیں کہ جس کے بارے میں مشورہ کیا جاتا ہے جیسا کہ راغب نے لکھا ہے : تو پھر مصدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس آیت میں خدا کی دعوت قبول کرنے اور نماز قائم کرنے کے بعد اجتماعی مسئلہ مشورہ بیان ہوا ہے کہ اس کے بغیر تمام کام ناقص ہیں۔ اسی آیت کی وجہ سے اس سورہ کو شوریٰ کہا جاتا ہے۔

مشاورت حدیث کی روشنی میں

مشورہ کے بارے میں ائمہ معصومین ؑ سے وارد ہونے والی روایات بہت ہیں اصل مشورہ کے بارے میں رسولؐ کی ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا:

مشورہ سے کوئی شخص بد بخت نہیں ہوا اور خودرائی سے کوئی خوشبخت نہیں ہوا۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں :

جو شخص خود رائے ہوتا ہے وہ ہلاک ہوجاتا ہے اور جو بزرگوں سے مشورہ کرتا ہے وہ ان کی عقلوں میں شریک ہوجاتا ہے۔

اس روایت میں بھی رسولؐ سے منقول ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا:

جب تمہارے زمام دار حاکم نیک و شیرف اور تمہارے مال دار سخی افراد ہوں اور تمہارے کام مشورہ سے انجام پذیر ہوتے ہوں تو اس وقت روئے زمین تمہارے لئے زیر زمین سے بہتر ہے (یعنی تمہارا زندہ رہنا مناسب ہے ) لیکن اگر تمہارے حاکم بدکار اور تمہارے مالدار افراد بخیل ہوں اور اپنے کاموں میں مشورہ کرنے سے پرہیز کرتے ہو اس صورت میں تمہارا مرجانا بہتر ہے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم ؑ نے فرمایا:

اے ہشام دین داروں کی ہم نشینی دنیا و آخرت کا شرف ہے اور خیرخواہ آدمی سے مشورہ کرنا باعث خوش بختی اور شد وبرکت اور خدا کی توفیق کا سبب ہے پس جب تم خیر خواہ عاقل سے مشورہ کروتو پھر اس کی مخالفت نہ کرو ورنہ زحمت میں مبتلا ہوگے۔

مشورہ کس سے کریں ؟

کتاب وسائل الشیعہ کے ابواب احکام العشرہ کے اکیسویں بائیسویں باب میں یہ بیان ہوا ہے کہ ہم کس سے مشورہ کریں ؟ اس سلسلہ کی چند روایتیں درج ذیل ہیں :

امام جعفر صادق ؑ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: رسول ؐ سے دریافت کیا گیا :اے اللہ کے رسولؐ! حزم کیا ہے ؟ فرمایا: صاحبان رائے سے مشورہ کرنا اور ان کی پیروی کرنا۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : رسولؐ نے حضرت علی ؑ کی جو وصیتیں کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مشورہ سے زیادہ قابل اعتماد کوئی پشت پناہ نہیں ہے اور امور کے بارے میں تامل کرنے جیسا کوئی غوروفکر نہیں ہے۔

امام باقر ؑ فرماتے ہیں : توریت میں چار سطریں مرقوم ہیں ان میں سے پہلی یہ ہے:

جو مشورہ نہیں کرے گا وہ پشیمان ہوگا۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : مشورہ جیسا کوئی پشت پناہ نہیں ہے۔

حضرت امام صادق ؑ فرماتے ہیں : اپنے امور میں ان لوگوں سے مشورہ کرنا جو خدا سے ڈرتے ہیں۔

آپ ؑ ہی کا ارشاد ہے: مردوں میں سے صاحب عقل سے مشورہ کرو کہ وہ تمہیں نیک مشوہ دے گا خبردار صاحب ورع عقلمند کی بات کی مخالفت نہ کرنا کیونکہ صاحب ورع عاقل کی مخالفت کرنے سے انسان کا دین بھی برباد ہوجاتا ہے اور دنیا بھی۔

امام صادق ؑ ہی فرماتے ہیں : مشورہ کے کچھ حدود ہوتے ہیں انھیں کے مطابق مشورہ کرنا چاہیے ورنہ مشورہ لینے والے کو اس کے فائدے سے زیادہ نقصان ہوگا۔

۱۔ صاحب عقل ہو۔ ۲۔ آزاد دین دار ہو۔ ۳۔ دوست اور بھائی ہو۔ ۴۔ اسے ایسا ہونا چاہیے کہ اگر اسے تم اپنا راز بتا دو تو وہ اسے اسی طرح چھپائے جس طرح تم چھپاتے ہو۔

اِن سے مشورہ نہ کرو

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر ایک سے مشورہ نہیں لیا جاسکتا۔ یہ بات تو ہمیں پہلے ہی معلوم ہوچکی ہے کہ صحیح واستوار رائے کے حامل کون لوگ ہیں، انھیں سے مشورہ کرنا چاہیے، خدا سے ڈرنے والے عقلمند، امانت دار اور سچے انسان سے مشورہ کرنا چاہیے کہ یہ خیر خواہ انسان ہیں۔ لیکن بعض افراد سے مشورہ کرنا بدبختی و ناکامی کا باعث ہوتا ہے۔ حضرت علی ؑ نے ان لوگوں کی نشاندہی فرمائی ہے جن سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے یہ بات آپ ؑ نے مالک اشتر کو لکھے گئے مکتوب میں تحریر فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں : خبردار بخیل و کنجوسوں سے مشورہ نہ کرنا کہ وہ تمہیں سخاوت سے روک دیں گے اور ناداری سے ڈرائیں گے۔

۲۔ اور نہ بزدل افراد سے مشورہ کرنا کہ وہ تمہیں اہم کام سے باز رکھیں گے۔

۳۔ اور نہ حریص سے مشورہ کرنا کہ وہ مال جمع کرنے یا منصب پانے کے لئے تمہاری نظر میں ظلم کو اچھا بنا دے گا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ مشورہ، انسان کو صحیح راستہ دکھانا اور اس منزل تک پہنچنے میں اس کی مدد کرنا ہے۔ بخل و بزدلی اور حرص ایسے پست صفات کے حامل افراد سے کبھی بھی مشورہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ مشورہ لینے والے کی کوئی مدد نہیں کریں گے بلک اسے معرض ہلاکت و نابودی سے قریب کردیں گے۔

اس حق کے سلسلہ میں امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : مشورہ لینے والے کا تم پر یہ حق ہے کہ اسے صحیح رائے دو اور اگرصحیح رائے نہیں رکھتے تو اسے کسی صاحب رائے کا پتہ بتا دو کیونکہ مشورہ کا مقصد حقیقت تک پہنچنا ہے۔

چونکہ یہ بحث مشورہ اور مشاور سے متعلق ہے لہٰذا آخر میں ہم اس چھ رکنی کمیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو صدر اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کے لئے بنی تھی۔

صدر اسلام میں چھ رکنی کمیٹی

اہل سنت کے تمام مفسرین اور صاحبان علم جب سورہ آل عمران کی آیت ۱۵۹ پر پہنچتے ہیں تو اس کی ایسی تفسیر کرتے ہیں کہ جس سے یہ آیت چھ رکنی کمیٹی پر منطبق ہوجائے۔ یہاں پر یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حق اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور درج ذیل دلیلوں کی رو سے یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

۱۔ جانشین رسولؐ اور امام کا انتخاب خدا کی طرف سے ہوگا جیسا کہ کلام کی کتابوں میں اس کی وضحت کردی گئی ہے کیونکہ امام کو بھی نبی کی طرح عصمت و علم ایسے صفات کا حامل ہونا چاہیے اور اس کے علم و عصمت کی خبر خدا ہی کو ہے۔ جس طرح مشورہ سے کسی نبی کا انتخاب نہیں کیا جاسکتا اسی طرح امام کا انتخاب بھی مشورہ سے نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ چھ رکنی کمیٹی، مشورہ کے معیار پر کسی طرح بھی پوری نہیں اترتی۔ کیونکہ مشورہ سے مراد اگر تمام مسلمانوں کا مشورہ ہے تو چھ رکنی کمیٹی ہی کو کیوں مخصوص کیا گیا؟ اور اگر امت کے مفکرین اور صاحبان حل و عقد سے مشورہ مراد ہے تو مفکرین چھ افراد ہی نہیں تھے بلکہ وہ مسلمان، جو رسولؐ کے مشیر تھے، ابوذر، مقداد اور ابن عباس ایسے افراد بھی موجود تھے جن کو اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بنابرایں ان چھ افراد کی کمیٹی بنانا ایک سیاسی گروہ بنانا ہے یہ مجلس مشاورت ہی کی مانند ہے اور اگر مشورہ کے لئے صاحب نفوذ افراد کا انتخاب مراد ہے تاکہ دوسرے لوگ ان کی بات مان لیں تو انصار کے رئیس سعد بن عبادہ، ابوذر غفاری، بنی غفار کے رئیس ایسے لوگ موجود تھے اور ان کو اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

۳۔ہم جانتے ہیں کہ اس مشورہ کے لیے سخت و سنگین شرائط رکھے گئے تھے اور مخالفت کرنے والوں کو موت کی دھمکی دی گئی تھی، حالانکہ اسلام کے مشورتی نظام میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔

شوریٰ کے نام پر انھوں نے اسلام کے نظام کو اس کے حقیقی محور سے ہٹا دیا اور لوگوں کو گمراہی میں ڈھکیل دیا، امام علی تقی ؑنے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

جو شخص مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی اور امت کا حق غصب کرنے کے لئے ان سے مشورہ کے بغیر حاکم بن جائے تو اس کو قتل کردو بیشک خدا نے اس کی اجازت دی ہے۔

مشاور کا حق

لیکن جو تمہاا مشیر ہے اور تمہیں مشورہ دیتا ہے اس کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ اگر اس کی رائے تمہارے موافق نہ ہو تو تم اسے متہم نہ کرو، کیونکہ نظریات اور رایوں کے لحاظ سے لوگ مختلف ہوتے ہیں پھر اگر اس کی رائے میں تمہیں کوئی خرابی نظر آئے تو تمہیں اختیار ہے لیکن اسے مہتم کرنا جائز نہیں ہے خصوصاً جب تمہارے نزدیک اس میں مشورت کے شرائط پائے جاتے ہوں۔ اور اگر وہ تمہیں نیک مشورہ دے تو اس کے شکریہ اور خدا کی حمد و ثناء کو فراموش نہ کرو اور اس انتظار میں رہو کہ اگر وہ کبھی تم سے مشورہ کرے تو تم اسے اس کی جزاء ایسی ہی دو۔ خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مشیر کے حق میں امام زین العابدین ؑ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اس کا مشورہ تمہارے لحاظ سے صحیح نہیں ہے تو اسے متہم نہ کرو اور اگر اس کا مشورہ تمہارے موافق ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرو۔

مشیرکی امانت و صداقت

مشیر کے صفات کو ہم روایات کی روشنی میں بیان کرچکے ہیں اور مشیر و مستشیر کی وضاحت بھی کرچکے ہیں۔ وسائل الشیعہ کے، ابواب احکام العشرہ میں ایک باب ’’باب وجوب نصح المستشیر‘‘ ہے اس کی پہلی روایت یہ ہے:

امام جعفر صادق ؑ فرماتے ہیں : ایک شخص امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: میں اس لئے حاضر ہوا کہ آپ سے حسن و حسین اور عبداللہ بن جعفر کی شادی کے بارے میں مشورہ کروں۔ آپ نے فرمایا: جس کو تم مشورہ کے لئے منتخب کرو اسے امین ہونا چاہیے اور اسے وہی بیان کرنا چاہیے جو اس کی نظر میں حق ہو۔ اس کے بعد آپ نے اپنا نظریہ بیان کیا آپ ہی کا ارشاد ہے:

جس شخص نے اپنے بھائی سے مشورہ کیا اور مشیر نے وہ چیز بیان نہ کی جو اس نے در حقیقت سمجھی تھی تو خداوند عالم اس سے رائے صواب کو چھین لے گا۔

ان دو روایتوں میں دو اہم مطلب بیان ہوئے ہیں، پہلی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ جس سے مشورہ کیا جائے اسے امین ہونا چاہیے اور امین آدمی کبھی خیانت نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا مشورہ لینے والے کو بدگمانی کے سبب اس پر تہمت نہیں لگانا چاہیے۔ اسی چیز کو امام زین العابدین ؑ نے ایک حق کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ دوسری روایت کا لب لباب یہ ہے : مشیر کو وہی چیز بیان کرنا چاہیے جس کو اپنے اور خدا کے درمیان طے کرتا ہے اور اگر اس کو بیان کرنے میں دریغ کرتا ہے تو خدا اس سے نیک مشورہ اور رائے صواب کی صلاحیت کو سلب کرلے گا کیونکہ اس نے اس نعمت کا شکریہ ادا نہیں کیا ہے۔

ماتحت افراد سے مشورہ کرنا

مشاورت کے بارے میں ایک دلچسپ موضوع یہ ہے کہ انسان اپنے سے کم رتبہ افراد سے بھی مشورہ کرے، ضروری نہیں ہے کہ مشیر بہت بلند مرتبہ ہو، اس موضوع سے متعلق وسائل الشیعہ میں ایک باب اس عنوان ’’ باب جواز مشاورۃ الانسان من دونہ ‘‘ سے قائم کیا گیا ہے اس باب کی دوسری حدیث یہ ہے:

فضل بن یسار کہتے ہیں : امام صادق ؑ نے ایک مرتبہ کسی موضوع کے سلسلہ میں مشورہ فرمایا، میں نے عرض کی: خدا آپ کا بھلا کرے کیا مجھ جیسا آپ ایسے عظیم المرتبت کو مشورہ دے سکتا ہے ؟! فرمایا: ہاں جب میں تم سے مشورہ کروں (تو کیوں نہیں )

اس باب کی تیسری روایت میں بیان ہوا ہے:

حسن بن جہم کہتے ہیں : ہم امام رضا ؑ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ نے اپنے والد بزرگوار کا ذکر کیا اورفرمایا: آپ کی عقل ایسی تھی کہ اس زمانہ کے لوگوں میں سے ایسی کسی کی عقل نہیں تھی پھر بھی آپ کبھی کبھی اپنے کالے غلام سے مشورہ کرتے تھے۔ آپ ؑ سے کہ گیا: آپؑ اپنے کالے غلام سے بھی مشورہ کرتے ہیں ؟! فرمایا: ہوسکتا ہے خدا اسی کی زبان پر حقیقت کو جاری کردے آپ ؑ اکثر باغ و بستان کے بارے میں انھیں کے مشورہ پر عمل کرتے تھے۔

مشیر کے بارے میں حضرت علی ؑ کا نظریہ

نہج البلاغہ میں سید رضی نے حضرت علی ؑ سے روایت کی ہے جب عبداللہ بن عباس نے کسی چیز کے بارے میں آپ ؑ سے مشورہ کیا اور اس کے بارے میں آپ کا مشورہ موافق نہ پایا تو آپ نے فرمایا: تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم مجھ سے مشورہ لو پھر اگ میں تمہاری مخالفت کروں تو تم میری اطاعت کرو۔

یہ جملہ بھی امام زین العابدین ؑ کے بیان کے مطابق ہے:

علی بن مہزیار کہتے ہیں : حضرت امام محمدباقر ؑ نے مجھے ایک خط لکھا کہ فلاں شخص سے درخواست کرو کہ تمہیں مشورہ دے پھر وہ جو مشورہ دے اس پر عمل کرو کیونکہ وہ اپنے شہر کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور یہ جانتا ہے کہ حکام سے کیسے روابط رکھے جائیں۔ چونکہ مشورہ کرنا اچھی بات ہے لہٰذا خدا نے قرآن مجید میں اپنے رسولؐ سے فرمایا ہے : بعض امور میں لوگوں سے مشورہ کیجئے اور جب آپ ؐ ارادہ کرچکے تو خدا پر توکل کیجئے پھر اگر اس کی بات صحیح ہوتی ہے تو میں اس کی صحیح و صائب رائے سے استفادہ کرتا ہوں اور اگر صحیح نہیں ہوتی تو مجھے یہ امید ہوتی ہے کہ میں اسے انشاء اللہ صحیح راستہ پر لگا دونگا۔ ان امور کے سلسلہ میں مشوہ کیجئے یعنی اس کے بارے میں طلب خیر کیجئے۔

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : مشاورت جیسا کوئی مددگار و پشت پناہ نہیں ہے۔

نصیحت طلب کرنے والے کا حق

جو تم سے نصیحت چاہتا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اسے اتنی نصیحت کرو جتنا اس کا استحقاق ہے اور جتنی کو وہ برداشت کرسکتا ہے اور اس انداز میں نصیحت کرو کہ اس کے کان کو بھلی لگے، اس سے اس کی عقل کے مطابق بات کرو کیونکہ ہر عقل کے لئے ایک مخصوص انداز سخن ہوتا ہے وہ اسی کو سمجھتی ہے اور تمہاا انداز و چلن نرم ہونا چاہیے۔

امام زین العابدین ؑ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ نصیحت طلب کرنے والے کا تم پر یہ حق ہے کہ اسے اس کے ظرف و تحمل کے مطابق نصیحت کرو اور اس سے اس طرح گفتگو کروکہ جس سے وہ اسے قبول کرے اور نصیحت کرنے میں نرمی و مہربانی کو اپنا معیار بناؤ۔

’’نصح‘‘ بروزن فلس، یعنی خالص ہونا یا خالص کرنا، نصح العسل، یعنی اس نے شہد کو صاف اور خالص کیا۔ نہایہ میں ابن اثیر نے لکھا ہے : لغت میں نصح کے معنی خلوص اور نصح کے معنی اخلاص ہیں۔ قرب الموارد میں تحریر ہے۔ نصحہ،نصحاً یعنی اس نے اسے نصیحت کی نصیحت کرنے کو اس لئے نصح کہتے ہیں کہ یہ خلوص نیت اور خیر خواہی کے ساتھ ہوتی ہے۔

اسلام میں جن موضوعات کو اہمیت دی گئی ہے ان میں سے ایک دوسرے کو نصیحت کرنا بھی ہے۔ قرآن مجید انبیاء کو معاشر ہ کا ناصح اور اس کا خیر خواہ قرار دیتا ہے اور سورۂ اعراف میں تبلیغ میں انبیاء کی منطق کو نصیحت و خیر خواہی کی منطق قرار دیتا ہے۔ نمونے کے بطور چند آیتیں ملاحظہ فرمائیں۔

انبیاء معاشرہ کے ناصح

حضرت نوحؑ اپنی قوم سے فرماتے ہیں :

میں تو تمہیں خدا کی رسالت اور اس کا پیغام پہنچا رہا ہوں،اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور خدا کی طرف سے جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

حضرت صالح کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

پس صالح نے ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور فرمایا: میری قوم والو! میں تو تم تک اپنے پروردگار کاپیغام پہنچا رہا ہوں اور خیر خواہی کی شرط کو

پورا کررہا ہوں لیکن تم ہو کہ خیر خواہ اور نصیحت کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔

حضرت شعیب کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

پھر انھوں نے ان سے رخ پھیر لیا اور فرمایا: میری قوم والو! میں تو تم تک اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمہیں نصیحت کردی ہے (یا تمہاری خیر خواہی کی ہے) لیکن تم لوگ نصیحت کرنے والوں یا خیر خواہوں کو دوست نہیں رکھتے ہو۔

خدا کے تمام انبیاء کا مقصد لوگوں کو نصیحت کرنا اور ان کی خیر خواہی تھی اور انسان فطری طور پر خیر خواہی و نصیحت کو قبول کرتا ہے لیکن جن لوگوں نے توحید کی پاک فطرت کو گنوا دیا ہے وہ خدا کے انبیاء کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے تھے اور عذاب میں مبتلا ہوتے تھے۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ شیطان نے بھی نصیحت ہی کے حربہ کو استعمال کیا اور آدم کو بہکا دیا۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے:

اور اس نے دونوں سے قسم کھائی کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کو گمراہ کرنے کے لئے کبھی شیطان بھی خیر خواہ کے لباس میں آتا ہے جیسا کہ آدم و حوا کے لیے کیا ہے۔

جس طرح انبیاء کو قرآن میں انسانوں کا خیر خواہ و ناصح قرار دیا گیا ہے اسی طرح ائمہ کی روایات میں مومنوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور نصیحت کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔

مومنین ایک دوسرے کے خیر خواہ

اصول کافی میں ’’ نصحۃ المومن ‘‘ کے عنوان سے ایک باب قائم ہوا ہے۔

امام صادق ؑ سے منقول ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا: مومن پر واجب ہے کہ دوسرے مومن کو نصیحت کرے۔علامہ مجلسی نے کتاب ’’ مرأۃ العقول ‘‘ میں تحریر کیا ہے کہ نصیحت سے مراد دینی و دنیوی فوائد کی طرف راہنمائی کرنا اور غافل و جاہل لوگوں کو تنبیہ و تعلیم دینا ہے کہ ضررونقصان کو اس سے برطرف کیا جاسکے اور اگر وہ قبول نہ کرے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے طور پر انھیں نصیحت کرے۔

رسولؐ فرماتے ہیں : تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنے بھائی کو نصیحت کرے ا ور ا س کے لئے ایسے ہی خیر خواہ بنو جیسے اپنے نفس کے لئے خیرخواہ ہو۔

اس روایت کا مضمون تمام افراد سے مربوط ہے، مختلف پہلوؤں سے نصیحت کرے۔

نصیحت کرنے والا بہترین شخص

امام صادق ؑ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: خدا کے نزدیک اور روز قیامت ان لوگوں کی بڑی منزلت ہوگی جو روئے زمین پرنصیحت کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

اس حدیث میں وارد لفظ ’’مشی‘‘ممکن ہے اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہو تو اس لحاظ سے یہ معنی ہونگے کہ وہ لوگوں کی ہدایت کرنے کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور ممکن ہے معاشرہ کے امور کو زیادہ اہمیت دینا مراد ہو۔

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں : میں نے امام صادق ؑ کو فرماتے ہوئے سنا ! تمہارے اوپر خدا کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مخلوق کو نصیحت کرو تم نصیحت سے بلند عمل ہرگز نہ پاؤگے۔

ان روایات میں اہم موضوع یہ بیان ہوا ہے کہ راہِ خدا میں خلوص کے ساتھ نصیحت کرو لیکن اگر خدانخواستہ تم نے یہ عمل شیطانی مقاصد یا مادی اغراض کے لئے انجام دیا تو تم کو محرومیت کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔

رسولؐنے منا کی سرزمین پر جو خطبہ دیا تھا اس میں اس موضوع کی طرف اشارہ فرمایاہے:

رسولؐ نے فرمایا: تین چیزوں کے بارے میں مسلمان کے قلب کو خیانت نہیں کرنا چاہیے۔

۱۔خدا کے لئے اخلاص عمل میں۔

۲۔مسلمانوں کے پیشواؤں کو نصیحت کرنے میں۔

۳۔ ان کی نماز جمعہ میں شریک ہونے میں۔

اس حدیث میں رسولؐ نے عمل کو خدا کے لئے قرار دیا ہے اور نصیحت کا تعلق معاشرہ کے عام لوگوں ہی سے نہیں ہے بلکہ کبھی معاشہ کے زمامدار و حکام بھی نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں، یہ موضوع اس سے پہلے امامو ماموم والی بحث میں بیان ہوچکا ہے۔

نصیحت کا طریقہ

مذکورہ روایات کے مطالعہ سے ہماری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ خدا کے لئے نصیحت کرنا چاہیے، تاکہ مد مقابل کے دل پر اس کا اثر ہو۔ اسی طرح نصیحت کو مد مقابل کے فہم و شعود کے مطابق ہونا چاہیے ہم ہر شخص کو ہر قسم کی نصیحت نہیں کرسکتے بلکہ ہم کو نصیحت کا معیار اور مقدار معلوم ہونی چاہیے اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ کون سی بات نصیحت ہے اور مد مقابل کو کس انداز سے کی جائے۔

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : تمہیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ جو چاہے کہو اس لئے کہ ر سولؐ نے فرمایا ہے: خدا رحم کرے اس بندہ پر جو اچھی بات کہتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے یا خاموش رہتا ہے اور محفوظ رہتا ہے۔

حضرت علی ؑ سے روایت ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا: اس چیز کے بارے میں لب کشائی نہ کرو کہ جس کا تمہیں علم نہ ہو اور جس کی حقیقت سے تم واقف نہ ہو کیونکہ تمہاری بات تمہاری عقل پر دلالت کرتی ہے اور تمہاری عبارت تمہاری معرفت وآگاہی کی خبر دیتی ہے۔

نصیحت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سننے والا اس سے نہ اکتائے بلکہ ہمہ تن گوش ہو کر سنے۔ حضرت علی ؑ فرماتے ہیں :

بہترین کلام وہ ہے جو کانوں پر گراں نہ گزرے اور اس کو سمجھنے میں فہم و شعور کو زحمت نہ ہو۔

امام زین العابدین ؑ نے اسی چیز کو نصیحت طلب کرنے والے کے لئے ایک حق کے عنوا ن سے بیان فرمایاہے: نصیحت اس کے کان کے لئے نرم ہو کہ جس کو وہ آرام سے سن سکے اور اس انداز سے بات کہی جائے کہ جس کو اس کی عقل قبول کرلے۔ رسولؐ فرماتے ہیں : ہم انبیاء اس لئے بھیجے گئے ہیں تاکہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کریں۔

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : محبت و مہربانی کے ساتھ نصیحت کرو دہشت و دھمکی کے ساتھ نہیں کیونکہ اس سے اس کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوگا اور جس نصیحت کا کوئی اثر نہ ہو وہ بے فائدہ ہے۔ اس بحث کے آخر میں ہم اس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی درخواست منصور دوانیقی نے امام صادق ؑ سے کی تھی۔

منصور دوانیقی نے امام صادق ؑ کو اپنے دربار میں بلانے اور آپ ؑ کی آمد کو اپنی حقانیت کی دلیل بنانے کے لئے امام صادق ؑ کے پاس یہ پیغام بھیجا : آپ ہماے دربار میں اس طرح کیوں آمدورفت نہیں فرماتے جس طرح تمام لوگ ہمارے یہاں آتے جاتے ہیں ؟ منصور دوانیقی نے یہ

سوچا تھا کہ امام اس کی اس بات سے رعب میں آجائیں گے۔ لیکن امام صادق ؑ نے فرمایا:

منصور! ہمارے پاس دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم تجھ سے ڈریں اور تمہاے پاس آخرت کے لئے کچھ نہیں ہے کہ جس کی امید کریں۔ بتاؤ ہم تمہارے پاس کس لئے آئیں ؟

یہ بات منصور کو بہت ناگوار معلوم ہوئی لیکن ازروئے سیاست دوبارہ اس طرح لکھا : آپ نصیحت کرنے کے لئے ہمارے دربار میں تشریف لائیں تاکہ ہم آپ کی نصیحت سے مستفید ہوں۔ امام نے جواب دیا۔

اے منصور جودنیااور اس کی نعمتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہ تمہیں نصیحت نہیں کرے گا اور جو آخرت کا مشتاق ہے وہ تمہاری صحبت اختیار نہیں کرے گا۔ کیونکہ تمہاری صحبت سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

نصیحت کرنے والے کا حق

نصیحت کرنے والے کا حق یہ ہے کہ اس سے نرمی و خاکساری کے ساتھ پیش آؤ قلبی طور پر اس کی طرف جھک جاؤ او اس کی طرف کان لگاؤ تاکہ اس کی بات کو سمجھ جاؤ، پھر اس کی نصیحت کے بارے میں غورکرو اگر اس کی بات صحیح ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرواور اس کو قبول کرلو اور اس کی نصیحت کے بارے میں غور کرو اگر اس کی بات صحیح نہیں ہے تو اس پر مہربان ہو اور اس کو مہتم نہ کرو، تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے تمہاری خیر خواہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے ہاں اس سے غلطی ہوئی ہے، اگر وہ تمہارے نزدیک تمہمت کا مستحق ہو تو پھر کسی بھی حال میں اس کی کسی بات پر اعتماد نہ کرو، خدا کی عنایت و قدرت کے علاوہ کوئی طاقت و قدرت نہیں ہے۔

امام زین العابدین ؑ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو نصیحت کرنے والے کے ساتھ خاکساری سے پیش آنا چاہیے، اس کی نصیحت پر کان دھرنا چاہیے، اس کی نصیحت کے بارے میں غورکرنا چاہیے اگر اس نے صحیح بات کہی ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرے اور اس کی قدر کرے اور اگر صحیح نہیں کہی ہے تو اسے مہتم نہیں کرنا چاہیے، اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا ارادہ نیک تھا لیکن اس سے اشتباہ ہوگیا ہے اور شک و اشتباہ پر سزا نہیں دی جاتی۔

نصیحت لینے والے کے حق میں ہم نے ان آیات و روایات کی طرف اشارہ کیا ہے جو امام زین العابدین ؑ کے بیان سے ہم آہنگ تھیں۔ اب نصیحت کرنے والے کے حق سے ہم آہنگ امیر المومنین ؑ کی احادیث کو غررالحکم سے نقل کرتے ہیں :

تمہاری نظر میں اس شخص کو سب سے زیادہ محبوب ہونا چاہیے کہ جو محبت و شفقت کے ساتھ تمہیں نصیحت کرے۔

نیز فرمایا:

جو شخص نصیحت کرنے والے کی نصیحت سے روگردانی کرتا ہے وہ اس شخص کی آگ میں جلایا جاتا ہے جو دشمنی کو مخفی رکھتا ہے۔ حضرت امیر المومنین ؑ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

بیشک شفیق و مہربان اور عالم و تجربہ کار نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو نا ماننا حسرت و یاس اور پشیمانی کا سبب ہوتا ہے۔

آپ ؑ ہی کا ارشاد ہے:

اس شخص کی نصیحت سنو جو تمہارے پاس اس کا ہدیہ لائے اور اس کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلو تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں :

تمہارے اوپر سب سے زیادہ مہربان و شفیق آدمی وہ ہے جو تمہارے نفس کے خلاف تمہاری مدد کرے او ر تمہارے دین کے بارے میں تمہیں سب سے زیادہ نصیحت کرے۔

آپ ہی کا ارشاد ہے:

انسان کے لئے سب سے بڑی توفیق یہ ہے کہ مشفقانہ نصیحت پر عمل کرے او ر اسے حفظ کرلے۔

نیز فرماتے ہیں :

تمہیں نصیحت کرنے والا تمہارے اوپر مہربان ہے تمہارے اوپر احسان کرنے والا ہے وہ اپنی نظر سے تمہاری زندگی کے انجام کو دیکھتا ہے وہ تمہاری کوتاہیوں کی نشاندہی کرنے والا ہے پس اس کی اطاعت میں تمہاری سعادت پوشیدہ ہے اور اس کی نافرمانی میں تمہاری تباہی ہی نہفتہ ہے۔

لیکن نصیحت کرنے والے کو چاہیے کہ سب کے سامنے نصیحت نہ کرے۔ حضرت علی ؑ فرماتے ہیں : سب کے سامنے تمہارا نصیحت کرنا اس کی نابودی کا باعث ہوگا۔

بزرگ کا حق

بزرگ کا حق یہ ہے کہ تم اس کے سن و عمر کے لحاظ سے اس کا احترام کرو اور اس کے حق کو اہمیت دو اور اگر و ہ اسلام میں فضیلت رکھتا ہے تو اس کے اسلام کو بزرگ و عظیم سمجھو اور دشمنی میں اس سے مقابلہ کرنے سے پرہیز کرو اور راستہ میں اس کے آگے آگے چلو اور نہ اس پر سبقت کرو اور اس سے جہالت و نادانی سے پیش نہ آؤ اور اگر وہ تمہاے ساتھ ایسا کرے تو تم برداشت کرو اور اس کے اسلام و بزرگی کی وجہ سے اس کی تعظیم کرو کیونکہ بزرگی و سن درازی بھی اسلام کے برابر ہے۔ خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

’’کبر بروزن عنب ‘‘ یعنی سن و قدکی بزرگی۔ اس آیت میں کبر سے ضعیفی اور درازی عمر مراد ہے۔ اس آیت میں کبر سے ضعیفی اور درازی عمر مراد ہے۔ رہبر و رئیس کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے :

امام زین العابدین ؑ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بزرگوں اور بوڑھوں کا ان کے اسلام اور اان کی پیرانی سالی کے لحاظ سے احترام کیا جانا چاہیے۔ اور ان کے ساتھ بدتمیزی و تندخوئی سے پیش آنے کی مذمت فرمائی ہے۔اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن نے کبر اور پیری و ضعیفی کی کیا تعریف کی ہے:

انسان زندگی کے آغاز اور اس کے انجام میں ضعیف ہوتا ہے

انسان کی زندگی طفلگی کے ضعف سے شروع ہوتی ہے۔ اور بڑھاپے کی کمزوری و ناتوانی پر ختم ہوجاتی ہے۔ یعنی انسان کی زندگی کے آغاز میں بھی کمزوری وضعف ہے اور اس کے انجام میں بھی۔ ہاں دونوں میں یہ فرق ہے کہ بچے ترقی و بلندی کی طرف بڑھتے ہیں اور طاقت و قوت کی منزل طے کرتے ہیں، ہر روز وہ زیادہ قوت سے ہمکنار اور جوانی سے نزدیک ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف ضعیف اور بوڑھے پستی و کمزوری کی طرف جاتے ہیں، انحطاط کی منزل طے کرتے ہیں، مرور ایام کے ساتھ ان کے بدن میں نقاہت و فرسودگی آتی رہتی ہے، ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

خداوہ ہے کہ جس نے تمہیں اس وقت پیدا کیا جب تم کمزور تھے پھر تمہیں کمزوری و ضعف کے بعد قوت و طاقت عطا کردی اور قوت کے بعد کمزور و ضعیف بنا دیا۔

نیز ارشاد ہے:

اور جس کو ہم طویل عمر دیتے ہیں اس کو ہم اس کی ساخت میں جھکا دیتے ہیں کیا تم اس سلسلہ میں غو ر نہیں کرتے ؟

پیر وضعیفی میں آدمی کے بدن کے سارے قویٰ جھک جاتے ہیں اور پستی کی طرف مائل ہوتے ہیں، فہم نافہمی میں، یادداشت نسیان میں، طاقت کمزوری میں، کمال نقص میں، توانائی ناتوانی میں اور شادابی پژمردگی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ضعیف العمر بڑھاپے میں صرف نئی باتیں حفظ کرنے ہی پر قادر نہیں ہوتے بلکہ گزشتہ زمانہ کی یادداشت کو بھی فراموش کردیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید فرماتا ہے:

اور خداوند عالم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں موت دے گا اور تم میں سے بعض کو اتنی عمر دی جاتی ہے کہ اسے پست ترین عمر کی طرف پلٹایا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ زندگی بھر کی فراہم کردہ معلومات کو فراموش کردیتا ہے اور علم حاصل کرنے کے بعد نادان ہوجاتا ہے۔

جس شخص کی عمر طویل ہوتی ہے اور جو ضعیفی کے کرب ناک زمانہ میں پہنچ جاتا ہے وہ بڑی مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کے جسم کے قویٰ سست و کمزور ہوجاتے ہیں، نفسیاتی و روحانی طاقت ساتھ چھوڑ دیتی ہے، انسان کے وجود کی اندرونی و بیرونی طاقت گھٹ جاتی ہے۔

ضعیفی یعنی معاشرہ سے علیٰحدگی

ضعیف اور بوڑھے لوگوں کے لئے بڑی مشکلوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جبر طبیعی کے سبب معاشرہ کے سرگرم و فعال افراد سے جدا ہوجاتے ہیں، وہ اپنی ضعیفی و کمزوری کی بنا پر معاشرہ کے ہمہمہ کو چھوڑ کر گوشہ نشین ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اپنے خاندان میں اور گھر میں محدود ہوجاتے ہیں۔ اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے خاندان اور اہل و عیال میں بھی مناسب جگہ نہیں ملتی ہے۔ کبھی بیٹوں او رپوتوں کی بے توجہی کا شکار ہوتے ہیں، کبھی ان کی ڈانٹ پھٹکار سننا پڑتی ہے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انھیں گھر سے نکال دیا جاتا ہے تو حساس وزود رنج بوڑھے اس دنیا کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں۔

نفسیاتی دباؤ موت کا سبب

ڈاکٹراڈلف، جو کہ امریکہ کے جراحوں کے کالج کا رکن ہے، کہتا ہے: جب میں انٹرن میڈیکل میں تھا تو اس وقت ایک مریض ۷۰ سالہ عورت تھی، اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ریڈیو گرافی کے مطالعہ کے دوران میں اس بات کی طرف متوجہ ہوا کہ اس کی ہڈی ٹھیک کام کررہی ہے لہٰذا اس بات پر میں نے اس کو مبارک باد دی کہ تم بہت جلد شفا یاب ہورہی ہو، جو وہیل چیر سے بھی نہیں چل سکتی تھی اب وہ بیساکھیوں سے چل سکتی تھی۔

اس کا علاج کرنے والے جراح نے مجھ سے کہاتھا : یہ عورت ۲۴ گھنٹے بعد میڈیکل چھوڑ کر اپنے گھر جاسکتی ہے اور چونکہ اس کا مریض بہت جلد شفایاب ہوگیا تھا اس لئے وہ بہت خوش نظر آتا تھا جس دن اس کے معالج سے میری یہ بات ہوئی تھی اسی روز یعنی اتوار کے دن اس عورت کی بیٹی، اس کی عیادت کے لئے آئی میں نے اس سے کہا: کل تم اپنی ماں کو اپنے گھر لے جاسکتی ہو۔ اب ان کی طبیعت صحیح ہے،انھوں نے بہت جلدی شفا پالی ہے اب وہ بیساکھیوں کے سہارے چل سکتی ہے لیکن اس نے کوی اظہار خیال نہیں کیا اور مجھے کچھ نہیں بتایا بلکہ سیدھی اپنی ماں کے پاس گئی تاکہ ان سے تبادلۂ خیال کرے اور ان سے کہا: میری ابا سے گفتگو ہوئی ہے افسوس ہے کہ وہ میڈیکل سے رخصت ہونے کے بعد آپ کو اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتے البتہ یہ امکان تھا کہ وہ اسے اولڈ فلکس ہوم میں پہنچا دیں، میں انٹرن میں تھا کہ مجھے اس عورت کے پاس بلایا گیا، اس کی حالت

غیر ہورہی تھی چنانچہ ۲۴ گھنٹے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ مگر ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے نہیں بلکہ دل شکنی سے ہوا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی تو جڑ گئی تھی لیکن ٹوٹے ہوئے دل کا علاج نہ تھا۔

آج کا معاشرہ بوڑھوں کو خاندان کے محبت آگیں مرکز سے جدا کردیتا ہے اور انھیں اولڈ فلکس ہوم میں پہنچا دیتا ہے اور ان کے درد کا مداوا کرنے کے بجائے ان کے درد کو بڑھا دیتا ہے، ہاں اسلام نے اپنے تربیتی اور اخلاقی منصوبہ میں اس موضوع کو،بڑھاپے کے حق کے عنوان سے بہتر طریقہ سے بیان کیا ہے۔

بزرگوں کا احترام روایات کی روشنی میں

اصول کافی میں کتاب ’’ العشرہ ‘‘ میں ایک باب ’’ وجوب اجلال ذی الشیبۃ المسلم ‘‘ میں قائم ہوا ہے ہم اس باب کی روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ یہ روشن ہوجائے کہ اسلام نے اپنے مکتب اخلاقی میں بزرگوں کے حق کی رعایت کس طرح کی ہے اور ایسے افراد کے خاندانوں کو ان کے فرائض سے کیسے آشنا کیا ہے۔

عبداللہ بن سنان سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: مجھ سے امام صادق ؑ نے فرمایا: سن رسیدہ افراد اور بزرگوں کی تعظیم کرنا خدا کی عظمت و بزرگی کا قرار کرنا ہے۔

دوسری روایت میں امام صادق ؑ نے رسولؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا:

جو شخص بوڑھے آدمی کی تعظیم کرتا ہے اور اس کی منزلت کو پہچانتا ہے خداوند عالم اسے قیامت کے خوف سے محفوظ رکھے گا۔

اسحٰق بن عمار کہتے ہیں : میں نے سنا کہ ابوالخطاب نے امام صادق ؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے:

تین طبقے ایسے ہیں کہ جن کا حق پوشیدہ نہیں رہتا ہے، ان کے حق کو ہر ایک پہچانتا ہے مگر یہ کہ کوئی نفاق میں مشہور ہوگیا ہو۔

۱۔وہ بوڑھا جس نے اپنے بال اسلام میں سفید کئے ہوں۔

۲۔حامل قرآن۔

۳۔عادل امام و رہبر۔

دوسری روایت میں ابن سنان کہتے ہیں کہ مجھ سے امام صادق ؑ نے فرمایا:

کسی بوڑھے کا احترام کرنا گویا خدا کا احترام کرنا ہے اور جو کسی مومن کا اکرام و عزت کرتا ہے گویا اس نے خدا کے احترام و اکرام سے ابتدا کی ہے اور جس نے سفید بال والے مومن کو سبک سمجھا اس کے پاس خدا ایسے کو بھیجتا ہے جو اس کے مرنے سے پہلے اس کے ساتھ گستاخی کرے گا، یہ عمل اور رد عمل ہے۔ حدیث قدسی میں خداوند عالم فرماتا ہے:

سفید بال میرا نور ہے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں اپنے نور کو اپنی آگ کے ذریعہ عذاب دوں۔

ابن ابی شیبہ سے نقل ہوا ہے کہ انھوں نے کہا:

رسولؐ نے سفید بال اکھاڑنے اور نوچنے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ مومن کا نور ہے۔

قبیلہ ’’ ہذیل ‘‘ کا ایک شخص رسولؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی : اے اللہ کے رسولؐ! میری عمر زیادہ ہوگئی ہے، میری ہڈی کمزور ہوگئی ہے، میری طاقت کم ہوگئی ہے اب میں نماز، روزہ کو کما حقہ انجام نہیں دے پاتا ہوں رسولؐ نے فرمایا: اپنی بات کی تکرار کرو کہ تمہارے اطراف

کی ہر چیز تمہارے حال پر رحم کھا کر گریہ کررہی ہے۔ تو پھر خدا کیسے تم پر رحم نہیں کرے گا؟!

خداوند عالم نے سحر تک قوم لوط کے شہروں کا تختہ اس لئے نہیں پلٹا تھا کہ جناب لوط نے عذاب میں تاخیر کی دعا کی تھی۔ جبریل ؑ نے کہا: خداوند عالم فرماتا ہے ان لوگوں کے درمیان ایک سفید بال و ریش کا بوڑھا آدمی پیٹ کے بل سورہا ہے اس کی سفید داڑھی کی بنا پر میں نے عذاب میں تاخیر کی ہے تاکہ وہ سیدھا ہوجائے رسولؐ فرماتے ہیں :

خداوند عالم صبح و شام بوڑھے کے چہرے کو دیکھتا ہے اور فرماتا ہے : میرے بندے! تیرا سن زیادہ ہوگیا ہے تیری ہڈی کمزور ہوگئی ہے۔ تیرے بدن کی کھال باریک و نازک ہوگئی ہے، تیی اجل قریب آگئی ہے اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم میری طرف آؤ۔ مجھ سے شرم کرو : مجھے اس سے شرم آتی ہے کہ میں تمہارے سفید بال و ریش کے باوجود تمہیں آگ میں جلاؤں۔ پھر پیغمبر پر گریہ طاری ہوگیا۔ دریافت کیا کہ گریہ فرمانے کا کیا سبب ہے ؟ فرمایا: خدا کو عذاب کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے، بندہ کیسے خدا سے حیا نہیں کرتا ہے؟

امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

بیشک خداوند عالم ستر سالہ انسانوں کا احترام کرتا ہے اور اسی ۸۰ سالہ بوڑھوں سے حیا کرتا ہے حکم دیتا ہے کہ ان کی نیکیاں اور حسنات لکھے جائیں اور ان کے گناہوں کو محو کر دیا جائے۔

بزرگوں کا احترام باعث نجات

بزرگوں اور بوڑھوں کے احترام کے سلسلہ میں رسولؐ فرماتے ہیں :

جو شخص کسی کو بوڑھے کی اس کی سفید داڑھی کی وجہ سے تعظیم کرتا ہے خداوند عالم اسے روز قیامت کے شیب خوف سے محفوظ رکھے گا۔

امام زین العابدین ؑ کے بیان سے متعلق ہم نے کچھ روایات نقل کی ہیں جن سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ممکن ہے کسی معاشرہ میں سن رسیدہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہوجائے اور جدت پسند طبقہ ان کو اپنے خاندان سے جدا کنے کے علاوہ اس کا کوئی حل تلاش نہ کرسکے اور ان کو اولڈ فلکس ہوم میں داخل کر دے۔ لیکن اسلام سفید داڑھی اور بالوں کو اول تو عظمت و برکت کی علامت سمجھتا ہے دوسرے یہ حکم دیتا ہے کہ ہم سفید ریش والوں کا احترام کریں۔ ان کی عمر کا آفتاب غروب ہواچاہتا ہے۔ ہمیں ان کے مقابلہ میں نہیں کھڑا ہونا چاہیے اور ان سے ناراض ہو کر ان کو رنجیدہ نہیں کرنا چاہیے اور اس بت کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ وہ ضعیف العمری کے سبب تاب ضبط نہیں رکھتے ہیں اب ان میں بھوک، پیاس اور دوسری شکلوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

ان روایات سے دوسری اہم چیز یہ معلوم ہوئی کہ خداوند عالم بوڑھوں کو آگ و جہنم میں جلانے سے حیا کرتا ہے لہٰذا بوڑھوں کو گناہ و نافرمانی سے حیا کرنا چاہیے۔ بعض لوگوں کو گناہ کرنے کی عادت ہوگئی ہے انھیں چاہیے کہ جلد از جلد آب توبہ سے غسل کریں اور اپنی مغفرت کا سامان فراہم کریں۔

چھوٹے کا حق

کمسن و بچہ کا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ محبت سے پیش آؤ اس کی پرورش کرو، اس کو تعلیم دو، اس سے درگزر کرو، اسے لباس پہناؤ، اس کے ساتھ نرم رویہ رکھو، اس کی مدد کرو اور اس کی بچکانہ حرکتوں پ پردہ ڈال دو کیونکہ یہ چیز توبہ کا باعث ہے، اس کی رعایت کرو اور اسے بھڑکاؤ نہیں کیونکہ یہ بات اس کے رشد سے قریب ہے۔

صغر (بروزن فرس و عنب) یعنی چھوٹا پن، کبر (بڑے پن) کی ضد ہے ایک چیز کا دوسری سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے، خواہ زمانہ کے اعتبار سے ہو، جیسے کم سن ہونا یا جثہ کے لحاظ سے ہو یا قدرورتبہ کے اعتبار سے ہو۔

امام زین العابدین ؑ کے نقطۂ نظر سے بچہ کا حق یہ ہے کہ تعلیم کے سلسلہ میں دلچسپی ہو۔ اسے معاف کیا جائے اس کے عیوب کو چھپایا جائے۔ اس کی رعایت کی جائے اور اس کی مدد کی جائے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ حب ذات بچہ کی تربیت کا بنیادی عنصر ہو، اس چیز کو اگر بچہ کے اندر عاقلانہ طور پ اور صحیح منصوبہ کے تحت سمت دی جائے تو یہ خوش بختی و سعادت کا باعث ہوتی ہے۔ حب ذات کو قوی کرنے کا ایک طریقہ بچوں کی تعظیم و تکریم ہے، جس بچہ کی اپنے خاندان ہی میں عزت نہ ہو وہ احساس کمتری کاشکار ہوجاتا ہے، وہ خود کو حقیر و سست سمجھنے لگتا ہے حوصلہ ہار جاتا ہے اور نفسیاتی طور پرٹوٹ جاتا ہے ایسا بچہ کوئی بھی غلط کام کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے آپ ؑ اس کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔

بچوں کے بارے میں رسولؐفرماتے ہیں :

اپنے بچوں کا احترام کرو اور اپنا چال چلن صحیح رکھو۔

امام زین العابدین ؑ نے اس طرح بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ بچہ کا ایک حق ہے جو بزرگ کی گردن پر ہے اس سلسلہ میں ائمہ کا کردار گواہ ہے۔

بچہ کے اندر محبت پیدا کرنا

ایک روز امام حسن ؑ نے اپنے اور اپنے بھائی کے بچوں کو بلایااور ان سے فرمایا: تم ایک قوم کے چھوٹے ہو اور عنقریب ایک قوم کے بڑے بن جاؤ گے، پس علم حاصل کرو پھر جو تم میں سے اسے یاد نہ رکھ سکے اسے لکھ لینا چاہیے اور اسے گھر میں محفوظ جگہ پر رکھ دینا چاہیے تاکہ وقت ضرورت یہ لکھا ہوا کام آئے۔

اس حدیث میں امام حسن ؑ اپنے بچوں او ر بھتیجوں کے اندر حصول علم کا جذبہ پیدا کرنے اور انھیں فرحت و نشاط کے ساتھ علم حاصل کرنے کی رغبت دلانے میں ان کے فطری سرمایہ، حب ذات سے استفادہ کررہے ہیں، نہ انھیں ڈراتے ہیں نہ دھمکاتے ہیں بلکہ آسانی سے یہ سمجھاتے ہیں کہ آج کا پڑھا ہوا کل کی عزت و سرفرازی کا باعث ہے۔

اس حدیث میں جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ آج کی دنیا میں تعلیم کا بہترین نہج ہے۔ ہر خاندان اس طریقہ سے اپنے بچوں کو علم حاصل کرنے پر ابھا سکتا ہے اور ابھی سے انھیں بلند مرتبہ کا امیدوار بنا سکتا ہے۔ بچے خود ہی دلچسپی او ر شوق کے ساتھ علم حاصل کریں گے، پڑھنے کے لئے سختی و سزا کی ضرورت نہیں ہے۔

بچوں کی تربیت کا طریقہ

بچوں اور بڑوں کی بلندی کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ زندگی میں آزادی ہو۔ سختی و استبداد کے ماحول میں بلندی و سرفرازی کی امید نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس کے لئے پرسکون اور آزاد ماحول کی ضرورت ہے۔ اسی سے استعداد میں نکھار آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تربیتی آئین میں جہاں تک ممکن ہ یمربی سختی سے کام نہیں لیتا ہ ے۔ رسولؐ دنیائے بشر کے مربی ہیں۔ مہربان تھے۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ ایک شخص رسولؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس پر خوف طاری ہوگیا۔ آپ ؐ نے

فرمایا: ڈرو! نہیں میں بادشاہ نہیں ہوں۔

رسولؐ نے فرمایا: جس شخص کے پاس کوئی بچہ ہو اسے چاہیے کہ اس کی پرورش میں وہ بچوں جیسا کردار ادا کرے۔

حضرت علی ؑ نے فرمایا: جس کو کوئی بچہ ہو اسے چاہیے کہ وہ اس کی تربیت کے لئے بچہ بن جائے۔

رسولؐ نے فرمایا: خدا رحم کرے اس بندہ پر جو نیکی اور نیک منشی میں اپنے بچہ کی مدد کرے اور اس پر احسان کرے اور ایک بچہ کی مانند اس بچہ کا رفیق و دوست بن جائے تاکہ اسے علم و ادب سے آراستہ کرسکے۔

رسولؐ اور بچوں کا احترام

ایک مرتبہ رسولؐ سفر سے واپس آرہے تھے، راستہ میں کچھ بچے ملے، آپؐ ان کے احترام کے لئے کھڑے ہوگئے رسولؐ نے فرمایا: بچوں کو لاؤ، بچے لائے گئے تو آپ ؐ نے کسی کو گود میں لیا اور کسی کو دوش پر سوار کیا اور اپنے اصحاب سے فرمایا:بچوں کوگود میں لو اور ان کو دوش سوار کرو، بچوں کو اس سے بہت مسرت ہوئی۔ خوشی سے اچھلنے لگے۔ اس یادگار موقعہ کو وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتے تھے، اکثر و ہ جمع ہوتے اور اس واقعہ کو ایک دوسرے سے بیان کرتے تھے۔ فخر ومباہات کے ساتھ ایک کہتا تھا : رسولؐ نے مجھے گودمیں لیا تھا اور تمہیں دوش پر سوار کیا تھا دوسرا کہتا تھا رسولؐ نے اپنے صحابی کوحکم دیا تھا کہ تمہیں اپنے دوش پر سوار کرے۔

بچوں کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنا

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں کہ بچوں کی خطاؤں کو معاف کردو اورایسے بن جاؤ گویا انھوں نے کچھ کیا ہی نہیں، خطاؤں سے چشم پوشی کرنا اخلاقی موضوعات میں سے ایک ہے اور تعلیم وتربیت میں اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اور دوسروں کی لغزشوں سے غافل بننا ان کی اصلاح میں مؤ ثر ہوتا ہے امام صادق ؑ فرماتے ہیں :

زندگی کی بھلائی اور لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہنا بھرے ہوئے پیمانہ کی مانند ہے کہ جس کا دو تہائی فہم و آگہی ہے اور ایک تہائی تغافل ہے۔

اولیائے اسلام نے تغافل کی قدروقیمت اور اس کی اہمیت کو بیان کیا ہے:

رسولؐ فرماتے ہیں : تغافل کی دو قسمیں ہیں ! مذموم و ممدوح کا نصف تغافل ہے جس تغافل کو دینی دستورات میں ممدوح قرار دیا گیا ہے اور اولیائے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جس کی رعایت کرنے کا شوق دلایا ہے اس تغافل کا سرچشمہ عقل اور مصلحت ہے اور تغافل کر نے والا حسن نیت اور نیک خیال کے ساتھ تغافل کرتا ہے۔

اگر والدین اور تربیت کرنے والے بجا اور صحیح موقعہ پر تغافل کریں تو اس کا نتیجہ مثبت برآمد ہوگا اور تربیت میں اس کا اچھا اثر ہوگا۔ مثلاً ساری دنیا کے بچے کم وبیش چوری کرتے ہیں، بچوں کے اندر تملک کی فکر بہت جلد بیدار ہوجاتی ہے، وہ بہت سی اشیاء کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں، دوسرے بچوں کے کھلونوں کو بھی اپنا ہی مال سمجھتے ہیں اور انھیں اپنے گھر اٹھالاتے ہیں کبھی ابا کی جیب سے پیسہ نکالتے ہیں۔ باپ کہتا ہے : میری جیب سے پیسہ نکل گیا، ماں شکوہ آمیز انداز میں کہتی ہے :کیا اس گھر میں کوئی ایسا غلط بھی کرتا ہے۔ باپ کہتا ہے :معاف کیجئے گا : ہوسکتا ہے کہیں میری جیب سے نکل گیا ہوگا یا میں نے دوکاندار سے چھ کی بجائے پانچ ہی لئے ہونگے، بچہ بھی یہ باتیں سنتا ہے اور رات میں لیٹ کر سوچتا ہے، یہ میں نے کیا کیا تھا، بہت اچھا ہوا، کوئی نہیں سمجھا۔ سوچتا ہے اب کبھی ایسا کام نہیں کرونگا ایسی جگہ پر اگرچہ بچہ نے غلط کام کیا ہے لیکن اس کی اصلاح

کے لیے چشم پوشی کرنا چاہیے۔ امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں : بچہ کے اس غلط کام سے چشم پو شی کرنا اس کی اصلاح کا باعث ہوتا ہے۔

سائل کا حق

سائل کا حق یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس صدقہ تیار ہے تو اسے دیدو اور اس کی ضرورت کو پورا کردواور اس کی ناداری کے برطرف ہونے کی دعا کرو اور اس کی طلب میں اس کی مدد کرو اور اگر تمہیں اس کی صدق بیانی میں شک ہو اور اس سلسلہ میں اس پر پہلے تہمت لگائی جا چکی ہو اور تمہیں اس کا یقین نہ ہوتو اس تہمت کی پروا نہ کروہوسکتا ہے شیطان تمہیں تمہارے حصہ سے محروم کرنا چاہتا ہو اور وہ تمہارے اور تمہارے رب کے تقرب میں حائل ہونا چاہتا ہو۔ لہٰذا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور اسے شائستہ جواب دو اور اس صورت میں بھی اگر اسے کچھ دیدو تو یہ بہت اچھا ہے۔

مسؤل کا حق

جس سے سوال کیا جاتا ہے، جس سے طلب کیا جاتا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اگر اس نے کچھ دیا ہے تو اسے شکریہ کے ساتھ قبول کرلواور اس کی قدر کرو اور اگر وہ کچھ نہ دے سکے تو اسے معاف کردے اور اس کے بارے میں حسن ظن رکھے اور یہ جان لوکہ اگر منع کیا ہے تو اپنے ہی ضر ر میں منع کیا ہے اس میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے خواہ وہ ظالم ہی ہو کیونکہ انسان ظالم ہے اور حق کو چھپانے والا ہے۔

ان دو متقابل حقوق کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر انسان قدرت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ سائل کو محروم نہ کرے اور یہ دعا کرے کہ خدا اسے فقر و ناداری سے نجات عطا کرے اور اگر سائل کی بات میں شک ہوتواس شک کی پروا نہ کرے اور یہ تصور کرے کہ شیطان اسے فیض الٰہی سے محروم کرنا چاہتا ہے اور اگر استطاعت نہ رکھتا ہو شائستہ طریقہ سے جواب دیدے۔ جس سے سوال کیا گیا ہے اس کے حق کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اس نے عطا کیا ہ یتو اس کا شکریہ ادا کرے اور اس کی قدر کرے اور اگر نہ دے تو اس کو ملامت نہ کرے کیونکہ انسان کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے۔

بجا اور بے جا سوال

کچھ جاننے کے لئے سوال کرنا اسلام کے نقطۂ نظر سے بطور مطلق ممدوح ہے بلکہ اس کا حکم ہو اہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:

اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل ذکر(ائمہ معصومین ؑ)سے سوال کرو۔

سوال، عالم بننے کے لئے دریچہ ہے لیکن سائل ومسؤل کے بارے میں امام زین العابدین ؑ نے جوکچھ فرمایا ہے وہ بطور مطلق نہیں ہے بلکہ مال کی ضرورت کے وقت سوال کرنا ہے اور اس کا تعلق ناداروں اور فقیروں کے سوال سے ہے۔ کیا یہ سوال بھی قابل تعریف ہے یا یہ مذموم ہے؟ واضح ہے کہ اس موضوع کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ منفی ہے اور اس قسم کا سوال حرام ہے : مگر یہ کہ شدید حاجت ہو اور ناداروں کی جان کے لئے خطرہ ہوجائے تو وہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے سوال کرسکتا ہے اور جس سے سوال کیا جائے اس کو مثبت جواب دینا چاہیے۔ سورۂ معارج میں ارشاد ہے:

اور وہ لوگ کہ جن کے اموال میں سائل و محروم کا حق ہے۔

بنا برایں سائل کو محروم نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ سورۂ ضحی میں ارشاد ہے:

لیکن اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ حق سے کیا مراد ہے، زکوٰۃ، خمس اور تمام شرعی واجب حقوق ہیں یا انھوں نے خود پر واجب و لازم کرلیا ہے کہ اس صورت میں دوسرے غیر واجب حقوق بھی اس میں شامل ہونگے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے یہ صرف پہلی قسم کو شامل ہے اس میں واجب حقوق نہیں آتے کیونکہ واجب حقوق تمام لوگوں کے اموال میں ہوتے ہیں خواہ وہ پرہیز گارہوں یا ان کے غیر، اگر اس طرح معنی بیان کئے جائیں تو

مفہوم یہ ہوگا : نماز گزار اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ راہ خدا میں وہ اپنے اموال میں سے مانگنے والوں اور محروم لوگوں کو دیں گے۔

دوسری آیت ’’ لاتنھر‘‘ نھرسے مشتق ہے یعنی غصہ کی حالت میں دھمکا کر بھگانا۔ سائل مراد کون ہے؟ اس کی متعدد تفسیریں ہیں :۱۔ سائل یعنی علمی و اعتقادی مسائل معلوم کرنے والے۔ ۲۔جو لوگ مادی چیزیں نہیں رکھتے۔ ۳۔ دونوں معنی مراد ہیں۔

روایات میں سوال کی مذمت

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی متوات روایات میں لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے کی مذمت کی گئی ہے کیونکہ لوگوں سے سوال کرنا خدا پراعتماد نہ ہونے اور سوال کرنے والے کی ذلت کا سبب ہوتا ہے اور مومن چونکہ عزت نفس رکھتاہے لہٰذااسے چاہیے کہ سوال کرکے اپنی عزت برباد نہ کرے اور اپنی قدروقیمت کو نہ گنوائے۔ رسولؐ فرماتے ہیں :

امام صادق ؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: رسولؐ فرماتے ہیں : بیشک خداوند عالم ایک چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے لیکن اسے بندہ کے لئے پسند نہیں کرتا، خدا اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا بندہ اس سے سوال کرے لیکن اس بات کو نہیں پسند کرتا کہ بندہ اس کی مخلوق سے سوال کرے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ چیز یہ ہے کہ اس سے سوال کیا جائے اور اس سے طلب کیا جائے پس خدا سے سوال کرنے میں تم میں سے کسی کو شرم نہیں کرنا چاہیے خواہ جوتی کے تسمہ ہی کے لئے ہو۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ خدا اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے بندے لوگوں سے مال کا سوال کریں واضح ہے کہ اس شخص کا خدا پر اعتماد نہیں رہتا جو ہمیشہ لوگوں سے مانگتا ہے حالانکہ خدا کے نزدیک بہترین چیز یہ ہے کہ اس سے طلب کیا جائے۔

دوسری روایت میں اس طرح وارد ہوا ہے:

حسین بن ابوالعلاء نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا:خدا رحم کرے اس بندہ پر جو عفیف و پاکدامن اور خودار ہو اور سوال کرنے سے پرہیز کرتا ہو کیونکہ لوگوں سے مانگنا، دنیا میں پستی کا باعث ہوتا ہے بے نیازی کی سبب نہیں ہوتا ہے۔

حرمت انسان کا تحفظ

حضرت امیر المومنین ؑ نے امام حسن ؑ کو جو وصیتیں فرمائی ہیں ان میں سے ایک حرمت و کرامت انسان کے تحفظ کے بارے میں بھی ہے۔

اپنے نفس کو ہر پستی سے بلند رکھو خواہ وہ تمہیں پسندیدہ چیزوں ہی کی طرف لے جائے۔ کیونکہ اگر تم میں اپنے نفس کو پستی میں ڈھکیل بھی دو گے تو اس کا عوض نہیں پاؤ گے اور جب خدا نے تمہیں آزاد قرار دیا ہے تو کسی کے غلام نہ بنو۔

اسی وصیت نامہ کا جزیہ بھی ہے :

اگر تم یہ کرسکتے ہوکہ تمہارے اور خدا کے درمیان کوئی صاحب نعمت واسطہ نہ ہوتو ایسا کرگزرو کیونکہ اپنا حصہ حاصل کرلوگے اور اپنے نصیب ہی کا لو گے کہ خدا کی طرف سے جو ملتا ہے وہ کم بھی اس زیادہ سے محترم ہے جو اس کی مخلوقات میں سے کسی طرف سے ملتا ہے اگرچہ ساری نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی ؑ اپنے بچوں سے یہ فرماتے ہیں کہ وہ پستی کو قبول نہ کریں اور جلد ملنے والے فائدہ کے بارے میں نہ سوچیں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں، کیونکہ سب کا رازق خدا ہے، اس سلسلہ میں انسان اپنا بھرم نہ کھوئے کیونکہ سوال انسان کی شخصیت کو حقیر بنا دیتا ہے۔

آپ ؐ ہی کا ارشا د ہے:

سوال بولنے والے کی زبان کو ناتواں کردیتا ہے اور شجاع و دلیر کے دل کو توڑ دیتا ہے اورعزت والے آزاد کو ذیل غلام کی جگہ پہنچا دیتا ہے، اس کے چہرہ کی رونق کو ختم کردیتا ہے اور رزق کو مسدود کردیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام ؑ نے اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ اپنے اور خدا کے درمیان کسی صاحب نعمت کو واسطہ قرار نہ دو، تو ایسا کر گزرو اور اس سے حاجت روائی و مشکل کشائی کی درخواست نہ کرو بس خدا پر توکل کرو، یہ کام کرو، کیونکہ تمہارا حصہ تمہیں مل جائے گا، اگرچہ کم ہو لیکن یہ دوسروں کے زیادہ سے بہتر ہے یہ الگ بات ہے کہ صاحبان نعمت کے پاس اپنی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔

سوال کی ذلت سے پرہیز کرو

امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں :

لوگوں سے حاجت طلب کرنا زندگی بھر کے لئے ذلت اور حیا کا خاتمہ ہے شخصیت ووقار کو سبک کرنا اور حاضر فقر ہے۔

اسی سے ملتی جلتی حدیث امام صادق ؑ کی بھی ہے : فرماتے ہیں :

لوگوں سے حاجت طلب کرنا عزت کے چھن جانے اور حیا کے ختم ہونے کا باعث ہے اور لوگوں کی چیزوں سے بے نیازی دین میں مومن کی عزت کا سبب ہے اور طمع ایسا فقر ہے جو حاضر و موجود ہے۔

رسول ؐ فرماتے ہیں :

جس شخص نے اپنے اوپر لوگوں سے سوال کرنے کا دروازہ کھول لیا خدا اس پر فقر وناداری کے ستر دروازے کھول دیتا ہے ان میں سے چھوٹے دروازہ کو کوئی چیز بند نہیں کرسکتی۔

رسولؐ نے اس وصیت میں جو حضرت ابوذر کو کی تھی۔

فرمایاہے:

اے ابوذر! خبردار لوگوں سے سوال نہ کرنا کہ حاضر و موجود ذلت ہے اور ایسا فقر ہے جس کے لئے تم عجلت کرتے ہو اور سوال کرنے میں روز قیامت طویل حساب ہے۔ اے ابوذر سوال کے لئے لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا لیکن اگر سوال کے بغیر تمہیں کوئی چیز ملے تو اسے قبول کرلینا۔

حضرت امام رضا ؑ فرماتے ہیں :

ایک شخص رسولؐکی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی: مجھے ایسا عمل سکھا دیجئے کہ جس سے میں بے روک ٹوک جنت میں چلا جاؤں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: غضب و غصہ نہ کرو لوگوں سے سوال نہ کرو اور لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔

یہی مفہوم فارسی اور عربی نظم میں بھی بیان ہوا ہے۔چنانچہ حضرت علی ؑ سے منسوب دیوان میں مرقوم ہے:

اگر کمال آزادی کے ساتھ صبح میں داخل ہونا چاہتے ہوتو غلام کی مانند کوشش کرو اور لوگوں کے اموال سے اپنی امید منقطع کرلو اور لوگوں کے اموال سے نظر ہٹا لو۔

درج ذیل دو شعر امام حسین ؑ کی طرف منسوب ہیں :

خالق سے لو لگا کر خود کو مخلوق سے بے نیازکرلو اور صادق سے تمسک کرکے جھوٹے سے بے نیاز ہوجاؤ۔ خدا کے فضل و کرم کے رزق و روزی طلب کرو کہ خدا کے علاوہ کوئی رازق نہیں ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

جس شخص نے اپنی عزت و آبرو کو سوال سے بدل لیا ہے اس نے کوئی عوض نہیں پایا۔ اگرچہ اس نے سوال کے ذریعہ مال حاصل کرلیا ہو جب وہ ملنے والی بخششوں کو سوال کے ساتھ تولے گا تو اس وقت معلوم ہوگا سوال کا پلہ بخششوں سے بھاری ہے۔

حضرت علی ؑ سے منسوب ہے:

پہاڑ کی چوٹی سے پتھر اٹھا کر لانا میرے لئے دوسرے کی منت و سماجت کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ لوگ مجھ سے کہتے ہیں : کمانا ننگ و عا ر جب کہ مانگنا ننگ و عار ہے۔

حضرت امیر المومنین ؑ نے عرفات کی سرزمین پر ایک شخص کو لوگوں سے مانگتے ہوئے دیکھا تو آپؑ نے اسے تازمانہ کے اشارہ سے سمجھایا : افسوس ہے تمہارے حال پر آج بھی تم خدا کے غیر سے سوال کررہے ہو؟

رسولؐ نے فرمایا:

لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگو، اس وقت ایک شخص رسولؐ سے مدد مانگنے کے لئے آیا تھا۔ رسول ؐ نے اس کی تکرار کی۔

جو ہم سے سوال کرے گا ہم اسے دیں گے لیکن جو بے نیازی کا ثبوت دے گا خدا اسے غنی کردے گا۔ دوسری روایت میں اس طرح بیان ہوا ہے: جو ہم سے سوال نہیں کرے گا وہ ہماری نظر میں معزز و محترم ہے۔

اس نادار نے کوئی سوال نہ کیا اور واپس چلا گیا۔ اس کی بیوں نے کہا: تم نے رسولؐ سے مددکیوں نے مانگی ؟ اس نے کہا: رسولؐ نے یہ فرمایا تھا وہ آدمی صحرا میں گیا اور لکڑیاں کاٹ کر لایا اسی سے اس کا کاروبار بڑھ گیا ایک دن پھر رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا ماجرا بیان کیا۔ رسولؐ نے فرمایا: میں نے کہا تھا جو شخص لوگوں سے سوال نہیں کرتا ہے خدا اسے بے نیاز کردیتا ہے۔

جو روایات ہم نے یہاں تک بیان کی ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ سوال انسان کی عزت و آبرو ختم کردیتا ہے اس کے نفسیات کو متاثر کرتا ہے۔ اس پر فقر وناداری کے دروازے کھول دیتا ہے۔ پس جہاں تک ہوسکے انسان دوسروں سے سوال نہ کرے لیکن اگر حقیقت میں محتاج ہوگیا ہو اور سوال کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو اسلام کے دستورات میں یہ بیان ہوا ہے کہ ہرکس و ناکس سے سوال نہ کرے بلکہ اس کے اہل سے سوال کرے۔

مسؤل کے خصوصیات

حضرت علی ؑ فرماتے ہیں :

حاجت کا پورا نہ ہونا اس سے زیادہ آسان ہے کہ اسے نااہل سے طلب کیا جائے۔

نیز فرماتے ہیں :

تمہارے چہرہ کی آب و رونق برقرار ہے اسے سوال بہا لیا جائے گا پس یہ دیکھو کہ اسے کس کے سامنے بہا رہے ہو۔

عزت و آبرو کو بچانے کے لئے سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن اگر سوال کرنے پر مجبور ہو جائے تو یہ دیکھ لے کہ کس کے سامنے اپنی

آبرو کو پیش کررہا ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

اس شخص سے سوال نہ کرو کہ جس کے بارے میں تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ تمہای حاجت پوری نہیں کرے گا۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں :حاجت کا پورا نہ ہونا اس سے بہتر ہے کہ اس کو نااہل سے طلب کیا جائے۔

حضرت امام محمدباقرؑ فرماتے ہیں،

کسی نئے مال دار سے حاجت طلب کرنا ایسے ہی ہے جیسے تم اژدھا کے منھ سے کوئی درہم نکالنا چاہو لیکن اس سے تمہیں خطرہ بھی ہے اپنی حاجتوں کو کریم و سخی اور خوش خلق لوگوں سے بیان کرو، بداخلاق او رلیئم سے بیان نہ کرو۔

ایک عربی امیر المومنین ؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی: یا امیر المومنین ! میں تین بیماریوں میں مبتلا ہوں ایک بدن کے درد میں، دوسرے فقروناداری میں، تیسرے جہالت و نادانی کے درد میں۔ آپ ؑ نے جواب دیا : اے عرب بھائی اپنے نفس و بدن کے درد کا طبیب ڈاکٹر سے علاج کراؤ اور جہالت و نادانی کا علاج عالم سے کراؤ اور فقروناداری کا علاج سخی و کریم سے کراؤ۔ سائل نے عرض کی : آپ طبیب بھی ہیں، عالم بھی ہیں اور کریم و سخی بھی ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: اسے بیت المال سے تین ہزار درہم دیئے جائیں۔ فرمایا: ہزار درہم میں مرض سے شفا پاؤ، ہزار درہم میں علم حاصل کرو اور ہزار درہم سے اپنی ناداری کو برطرف کرو۔

امام حسن ؑ سے سوال:

ایک سائل امام حسن ؑ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ کے سامن بیٹھ گیا اور زمین پر اپنی حاجت لکھ دی وہ امام حسن ؑ کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ لکھ رہا تھا:

میرے پاس کوئی چیز باقی نہیں ہے کہ جس کو درہم کے عوض فروخت کرو ں۔ میری حالت زار ہی آپ کے لئے کافی ہے۔ بس ایک میری آبرو ہے جس کو میں نے بچا رکھا ہے وہ نہیں بکی ہے اب میں نے اس کا خریدار آپ کو پایا ہے۔

امام حسن ؑ نے اپنے خادم کو آواز دی اور معلوم کیا کہ تمہارے پاس کتنا مال باقی بچا ہے؟ اس نے جواب دیا میرے پاس بارہ (۱۲) ہزار درہم بچے ہیں۔ آپ ؑ نے فرمایا: یہ درہم اس ضرورت مند کو دیدو۔ مجھے اس سے شرم آتی ہے گویا خادم یہ کہنا چاہتا ہے کہ سارے درہم کیسے دیدوں ؟ ! آپ ؑ نے فرمایا: اسے دیدو اور خدا کے بارے میں حُسن ظن رکھو جب اس نے درہم لاکر اسے دیدئیے تو امام حسن ؑ نے اسے آواز دی اور فرمایا: معاف کرنا ہمارے پاس اس سے زیادہ نہیں تھا۔ پھر یہ اشعار پڑھے:

تم عجلت وجلدی میں ہمارے پاس آئے اور تمہیں ہماری تھوڑی ہی بخشش مل سکی اور دوسرے وقت آتے اور ہم کو تھوڑی مہلت دیتے تو ہم کوتاہی نہ کرتے اس عطا کو لے لو گویا تم نے کوئی چیز فروخت نہیں کی ہے اور کوئی معاملہ انجام نہیں دیا ہے ہم نے تیری عزت و آبرو نہیں خریدی ہے۔

انسان جو صدقہ دیتا ہے پہلے وہ خدا کے ہاتھ میں پہنچتا ہے، صدقہ کے حق میں ہم نے اس موضوع سے متعلق کچھ روایات نقل کی ہیں۔ لہٰذا سائل پر احسان نہیں رکھنا چاہیے اور اس کی شخصیت کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے مذکورہ روایت کو دیکھئے کہ امام حسن ؑ سائل کے ساتھ کس طرح پیش آئے ہیں۔ اولاً : جو کچھ گھر میں تھا وہ سب سائل کو دیدیا۔ ثانیاً: کم عطا پر عذر خواہی کی اور اس طرح اپنے ماننے والوں کو یہ درس دیا۔

امام حسین ؑ سے سوال:

ابن عساکر نے اپنی تاریخ کبیر میں لکھا ہے: ایک سائل مدینہ کی گلیوں میں گردش کررہا تھا یہاں تک امام حسین ؑ کے دروازہ پر آیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور عرض پرداز ہوا!

ابھی تک کوئی بھی سائل آپ ؑ کی عطا سے مایوس نہیں ہوا، جس نے آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا وہ خالی ہاتھ نہیں پھرا۔ آپؑ صاحب جودوکرم ہیں، آپؑ سخاوت کا سر چشمہ ہیں اور آپ ؑ کے والد فاسقوں او ر بدکاروں کو قتل کرنے والے ہیں۔

اس وقت آپ نماز میں تھے، آپ ؑ نے نماز کو اختصار کے ساتھ تمام کیا اور اس شخص کے پاس آئے اور اس نادار و فقیر کا زرد چہرہ دیکھا اور قنبر سے دریافت فرمایا: تمہارے پاس کتنا پیسہ ہے؟ عرض کی وہی دو سو درہم جن کے بارے میں آپ نے یہ فرمایا تھا کہ بچوں کو دیدینا۔ آپ ؑ نے فرمایا: ان سے زیادہ ضرورت مند آگیا ہے۔ لہٰذا لے آؤ قنبر لائے اور سائل کو دیدیئے اور سائل کے اشعار کے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

اس عطا کو لے لو میں تم سے معذرت خواہ ہوں، جان لو کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں تمہارا مہربان ہوں۔ اگر ہمارے ہاتھ موقعہ آگیا تو تمہارے اوپر ہماری عطا کی بارش ہوگی۔ لیکن زمانہ متغیر ہے اور ہمارے پاس (مال ) دنیا کم ہے۔

اس اعرابی نے عطا کو لیا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل آیا!

آپ اہل بیت کو طہارت و پاکی کا لباس و خلعت عطا ہوا ہے جہاں بھی آپ کا نام لیا جاتا ہے وہیں آپ پر درود بھیجا جاتا ہے۔ آپ سر بلند ہیں علم کتاب اور قرآن کے سورے اور خدا کی وحی آپ کے گھر میں اتری ہے۔ نسبت کے وقت جو شخص علوی نہ ہو لوگوں کے درمیان اس کے لئے کوئی فخر نہیں ہے۔

خوش کرنے والے کا حق

جس شخص کے ذریعہ خدا نے تمہیں خوش و مسرور کیا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اگر اس کا ارادہ تمہیں خوش کرنا تھا تو پہلے اس کا شکریہ ادا کرو اور پھر اسے اتنی جزا دو کہ جتنا اس نے تمہیں خوش کیا ہے اور ہمیشہ اس کے احسان کا بدلہ چکانے کی فکر میں رہو اور اگر اس کا ارادہ تمہیں خوش کرنا نہیں تھا تو خدا کی حمد اور اس کا شکرا داکرو اور یہ جان لو کہ یہ خوشی اسی کی طرف سے ہے اور چونکہ وہ تمہارے لئے خدا کی نعمتوں کا سبب بنا ہے اس لئے اس سے محبت کرو اور اس کے لئے خیرخواہ رہو۔ کیونکہ نعمتوں کے اسباب بھی نعمت میں چاہے کہیں بھی ہوں اور وہ اس کا قصد بھی نہ رکھتا ہو۔

زندگی کے مختلف حالات

جس دنیا میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس دنیا کے حالات مختلف ہیں۔ کبھی انسان کی زنگی رنج و غم اور مشکلات سے لبریز ہوجاتی ہے اور انسان کی کشتیٔ نجات کشتی شکن موجوں کی لپیٹ میں آجاتی ہیں جو کشتی کو ساحل تک پہنچنے میں مانع ہوتی ہیں اور کبھی انسان کی زندگی خوشیوں اور مسرتوں سے بھر جاتی ہے اور حالات ایسے ہوجاتے ہیں کہ انسان پھولے نہیں سماتا ہے، اسلام و قرآن کا سعادت بخش دستور ان دونوں مرحلوں میں انسان کو افراط کے راستہ سے ہٹا کر اعتدال و میانہ روی پر لگاتا ہے۔

بہت زیادہ مشکلوں میں گھرنے کے بعد بھی انسان کو خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور نجات کے تمام راستوں کو اپنے لئے بند نہیں سمجھنا چاہیے اسی طرح خوشحالی اور نشاط و عیش کی زندگی میں بھی غافل نہیں ہونا چاہیے اور خود کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نتیجہ میں خدا کو فراموش کردے بلکہ دونوں مرحلوں میں خدا کو یاد رکھنا چاہیے، خوشحالی کے زمانہ میں یہ سوچنا چاہیے کہ ساری نعمتیں خدا کی عطا کی ہوئی ہیں اور اگر لوگ اس کی طرف مائل ہیں تو یہ خیال کرلے کہ یہ خدا کی مرضی ہے اور اگر مشکلات وحوادث میں گھر جائے کہ جو انسان کی زندگی میں تعمیری اثر رکھتے ہیں تو بھی خدا پر نظر رکھنا

چاہیے۔ مختصریہ کہ رنج و مسرت میں افراط و تفریط سے بچنا چاہیے۔ جن چیزوں سے انسان خوش ہوتا ہے وہ ہے مقام و منصب، مال و دولت اور اقتدار و تمکن اور کبھی دوسروں پر احسان کرنا بھی انسان کی خوشحالی کا سبب بنتا ہے۔ امام زین العابدین ؑ نے اس بیان میں خوش کرنے والے کے حق سے متعلق مذکورہ جملے ارشاد فرماتے ہیں۔

مومنوں کو خوش کرنے کا ثواب

کتاب ’’ اصول کافی ‘‘ میں ایک باب ’’ ادخال السرور علی المومنین ‘‘ کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں اصل سرور اور دوسروں کو خوش کرنے کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور اس کے ثواب سے متعلق کچھ روایات نقل ہوئی ہیں ہم یہاں ان سب سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

ابوحمزہ ثمالی سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام محمد باقر ؑ کو فرماتے ہوئے سنا رسولؐ کا ارشاد ہے: جس شخص نے کسی مومن کو خوش کیا، اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے خدا کو خوش کیا۔

جو انسان زندگی بھر ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جس سے خدا اور رسول ؐ کو خوش کیا جاسکے اور اس کے ذریعہ خدا اور رسولؐ کا تقرب و قربت حاصل کی جاسکے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ خدا اور رسولؐ کو خوش کرنے کا ایک طریقہ دوسروں کو خوش کرنا بھی ہے اس کا معاشرہ کے اتحاد پر مثبت اثر ہوگا اور ان کے ذریعہ معاشرہ سے دشمنوں اور کدورتوں کو بھی برطرف کیا جاسکتا ہے۔ دوسری روایت میں اس طرح نقل ہوا ہے۔

جابر نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: کسی شخص کا اپنے بھائی کو ہنسانا ایک نیکی ہے اور مسلمان سے کسی نقصان و ضررکو برطرف کرنا ایک نیکی ہے اور جس چیز کے ذریعہ خدا کی عبادت کی جاتی ہے ان میں سے خدا کی نزدیک محبوب ترین چیز مومن بھائی کو خوش کرنا ہے۔

اس حدیث میں مومن کو ہنسانا اور اس سے قذیٰ کو برطرف کرنا بیان ہوا ہے (اور قذیٰ اس چیز کو کہتے ہیں جو آنکھ میں پڑ جاتی ہے) یہ حدیث مومنوں کی ایک دوسرے سے محبت پر دلالت کررہی ہے۔ اس کے علاوہ کہ اس حدیث میں مومن کے خوش کرنے کو عبادت شمار کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: کسی چیز کے ذریعہ خدا کی عبادت نہیں کی گئی کہ جو مومن کو خوش کرنے سے زیادہ خدا کو محبوب ہو۔ بنابرایں جو شخص کسی کو شاد و خوش کرنے کے لئے قدم اٹھاتا ہے درحقیقت وہ بہترین طریقہ سے خدا کی عبادت کرتا ہے۔

اس باب کی تیسری روایت میں امام محمد باقر ؑ فرماتے ہیں : حضرت موسیٰ بن عمران نے خدا سے جو مناجات کی تھی اس کے ذیل میں آیا ہے کہ خدا نے فرمایا : اے موسیٰ ! میرے ایسے بندے موجود ہیں جن کے لئے میں نے اپنی جنت کو مباح کردیا ہے اور انھیں میں جنت میں حکومت عطا کرونگا۔ موسیٰ نے عرض کی : پروردگار جن لوگوں کا جنت میں یہ رتبہ ہے وہ کون ہیں ؟ ارشاد ہوا: جس نے دوسرے مومن کو خوش کیا ہے۔

پھر یہ حدیث بیان کی:

اگر کوئی مومن ایسی جگہ زندگی گزارتا ہو جہاں کا حاکم ظالم و ستمگر ہو اور وہاں سے فرار کرکے ایسی جگہ جائے جہاں مشرکین بستے ہیں اور انھیں کی پناہ میں رہے تو خداوند عالم اس کی موت کے وقت اس پروحی کرتا ہے کہ میرے بندے! اگر میری جنت میں تمہارے لئے جگہ ہوتی تو میں اس میں تمہیں جگہ دیتا لیکن جس نے کسی کو میرا شریک قرار دیا ہے اس کے لئے جنت حرام ہے۔ آگ کو حکم ہوگا اس کو اپنی گرفت میں لے لو لیکن اس کو اذیت نہ دینا اور صبح و شام اس کو اس کا رزق پہنچتا ہے۔ سوال کیا گیا: کہاں سے ؟

فرمایا: جہاں سے خد ا چاہتا ہے۔ یہ شخص سے مربوط ہے جو ظالم کی سرزمین سے نکل کر مشرکوں کی سرزمین پر چلا جائے اور ان کے رنگ میں رنگ جائے۔ یہی مفہوم و مضمون قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔

بیشک خدا شرک کے گناہ کو معاف نہیں کرے گا اور جن کا گناہ شرک سے چھوٹا ہوگا ان میں سے جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

اس حدیث میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو لوگ دوسروں کی خوشی و مسرت کے اسباب فراہم کرتے ہیں وہ بہشت میں جائیں گے اور جنت میں ان کا خاص مرتبہ ہے۔

چھٹی حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

امام صادق ؑ فرماتے ہیں : تم میں سے جس شخص نے کسی مومن کو خوش کیا ہے وہ یہ تصور بھی نہ کرے کہ اس نے صف ممومن کو خوش کیا ہے بلکہ خدا کی قسم اس نے ہم کو بھی خوش کیا ہے خدا کی قسم اس نے رسول ؐ کو بھی خوش کیا ہے۔

بیشک جب رسولؐ اور ہمارے ائمہ علیہم السلام یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ماننے والے ایک دوسرے سے محبت کررہے ہیں اور ایک دوسرے پر مہربان ہیں اور ان کے معاشرہ میں محبت و خلوص کی حکمرانی ہے تو اپنے پیرؤوں کی خوش حالی سے وہ بھی خوش ہوتے ہیں۔

انسان کی نجات میں سرور کا اثر

سدیر صیرفی نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا: روز قیامت جب مومن کو قبر سے اٹھایا جائے گا تو اس کے سامنے اسی جیسا کہ ایک شخص بن جائے گا اور روز قیامت جتنے خوف و ہراس اس کے سامنے آئیں گے تو وہ شخص اس سے کہے گا کہ ڈرو نہیں، غم زدہ نہ ہو، خدا کی طرف سے ملنے والی مسرت و خوشی پر میں تمہیں مبارک بار دیتا ہوں۔ یہ شخص مستقل طور پر اس کے ساتھ رہے گا یہاں تک کہ حساب کے لئے بارگاہ خدا میں حاضر ہوگا اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور پھر حکم ہوگا کہ جنت میں چلے جاؤ وہ شخص اس مومن کے آگے آگے چلتا رہے گا تو مومن اس سے کہے گا: خدا تم پر رحم کرے جب سے میں قبر سے اٹھا ہوں اسی وقت سے تم میرے ساتھ ہو۔ تم نے مجھے خدا کی رحمت و خوش خبری دی۔ حساب میں میرے ساتھ رہے اسی طرح ہم یہاں تک آگئے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ وہ جواب دے گا میں وہ خوشی و مسرت ہوں جو تم نے دنیا کی زندگی میں مومن کے دل میں داخل کی تھی۔ خدا نے مجھے اسی مسرت و خوشی سے پیدا کیا ہے تاکہ میں تمہیں بشارت و خوشخبری دوں۔

اس حدیث میں اعمال کا مجسم ہونا بیان ہوا ہے کہ ہر عمل مخصوص صورت میں جلوہ گر ہوگا۔ اور وہ دنیا میں مومن کو خوش کرنا انسان کے سامنے حسین و جمیل انسان کی صورت میں جلوہ گر ہو کر اس کے آگے آگے چلے گا اور خوف و ہراس کی جگہ پر اس کے ہمت بندھائے گ اور ہمیشہ اسے خدا کے احسان و کرم کی خوشخبری دے گا۔

امام صادق ؑ کے ماننے والے محنتی ہیں :

کلینی نے محمد بن جمہوریہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: انبار کے کسانوں میں سے ایک نجاشی بھی تھا۔ اسے اہواز و فارس کا حاکم مقرر کردیا گیا تھا۔ نجاشی کا ایک کارندہ امام صادق ؑ کے خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کیا میں نجاشی کے بہت زیادہ ٹیکس کا مقروض ہوگیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آپ ؑ کا معتقد ہے اگر مناسب سمجھیں تو انھیں ایک خط لکھ دیجئے تاکہ وہ میرا خیال رکھیں۔ امام صادق ؑ نے اس طرح تحریر فرمایا :

اپنے بھائی کو خوش کرو خدا تمہیں خوش کرے گا۔

وہ آدمی امام صادق ؑ کا خط لے کر نجاشی کے پاس پہونچا اور تنہائی میں خط اس کے حوالے کیا نجاشی نے امام صادق ؑ کا خط دیکھا تو اسے بوسہ دیا اور کہا: تمہاری حاجت کیا ہے؟میں نے کہا: مجھ سے دس ہزار درہم ٹیکس کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ نجاشی نے حکم صادر کیا کہ اس سے ٹیکس نہ لیا جائے۔ پھر معلوم کیا : کیا میں نے تمہیں خوش کردیا؟ اس نے کہا: ہاں۔ نجاشی نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ اسے ایک سواری، ایک غلام اور ایک کنیز دی

جائے۔ پھر معلوم کیا: کہ کیا تم خوش ہوگئے ؟ اس نے عرض کی : ہاں میں خوش ہوں، پھر حکم دیا کہ جس قالین پر ہم بیٹھے تھے وہ بھی اس کو دے دی جائے۔ میں نے پورا واقعہ امام صادق ؑ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ بھی خوش ہوئے۔ میں عرض کی: آپ بھی خوش ہوئے ہیں ؟ فرمایا: ہاں خدا کی قسم رسول ؐ بھی خوش ہوئے ہیں۔

دوسروں کو خوش کرنا ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتا ہے:

امام صادق ؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جس نے کسی مومن کو خوش کیا خداوند عالم اس سرور سے ایک خوش اخلاق آدمی پیدا کردیتا ہے کہ جو مرتے دم اس کے پاس جاتا ہے اور اسے خدا کی کرامت و رضوان کی خوش خبری دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مستقل طور پر اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے یہاں تک اس کے ساتھ قبر میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اسے وہی بشارت دیتا ہے اور جب قبر سے اٹھایا جاتا ہے تو بھی یہی جملے کہتا ہے اور خوف و ہراس کے موقعہ پر اس کی دل جوئی کرتا ہے اور اسے بشارت دیتا ہے جب یہ اس کی طرف سے اتنی محبت و مہربانی دیکھتا ہے تو معلوم کرتا ہے: خدا تم پر رحم کرے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ وہ کہتا ہے : میں وہ وہ سرور ہوں جو تم نے فلاں فلاں مومن کے دل میں پیدا کیا تھا۔

اس باب کی آخری روایت میں ہشام نے امام صادق ؑ سے نقل کیا ہے:

ہشام بن الحکم نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ ؑ نے فرمایا: خدا کے نزدیک محبوب ترین عمل مومن کو خوش کرنا ہے۔ پھر خوش کرنے کے مصادیق کو اس طرح بیان فرماتے ہیں : اگر وہ بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھلائیے اور مشکلات سے نجات دلائیے اور اگر مقروض ہوتو اس کا قرض ادا کرے۔

ان روایات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام ہی دنیا و آخرت کا دین ہے، صرف آخرت ہی کا دین نہیں ہے۔ بہترین معاشرہ وہ ہے کہ جس کے افراد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے حسد و دشمنی نہیں رکھتے ہیں۔ ان روایات میں ہمارے معصوم ائمہ نے اپنے پیرؤوں کو ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی تاکید کی ہے تاکہ ان کے معاشرہ میں مدینہ فاضلہ وجوذ پذیر ہوجائے۔

اس کا حق جس نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے

لیکن اس کا حق کہ جس نے قول و فعل سے تمہارے ساتھ برائی کی ہے۔ اگر اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس سے درگزر کرو تاکہ کدورت کی جڑ کٹ جائے اور خلق خدا میں سے اس جیسے بہت سے لوگوں کے ساتھ شائستہ طریقہ سے پیش آؤ کیونکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے : جس نے اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد انتقام لے لیا تو اس پر کوئی الزام نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ نیز ارشاد ہے: یہ کام صحیح ہے پھر فرمایا ہے: اگر سزا دو تو ویسی ہی سزا دو حیسی تمہیں دی گئی تھی لیکن اگر تم صبر کروتو یہ صابروں کے لئے بہتر ہے یہ تو عمدی صورت میں ہے۔

لیکن اگر اس نے جان بوجھ کر بدی نہ کی ہو تو تم جان بوجھ کر اس پر ظلم نہ کرو اگر تم جان بوجھ کر اس کے ساتھ بدی کروگے تو خطا کار قرار پاؤ گے۔ جہاں تک ہوسکے اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور اس کے ساتھ محبت آمیز سلوک کرو۔

اس حق کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہارے ساتھ کسی نے بدتمیزی کی ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا جان بوجھ کر کی ہے تو بہتر ہے کہ اسے معاف کردو بشرط یہ کہ وہ معافی سے غلط فائدہ نہ اٹھائے۔ لیکن اگر غلطی سے بد تمیزی کی ہے اور تم اسے سزا دینا چاہتے ہو تو یہ غیر عمدی فعل کے مقابلہ میں عمدی ہوگی۔ بہتر ہے کہ لطف ومہربانی کے ساتھ اس کی غلطی کو معاف کردو۔

عفوودرگزر کی دعوت

ایسے لوگ بہت ہیں کہ جن سے بھول چوک، غلطی و اشتباہ نہ ہوا ہو اور ان سے دوسروں کے حقوق ضائع نہ ہوئے ہوں، اور اگر ہر آدمی یہ طے کرلے کہ اسے جب بھی موقعہ ملے گا اسی وقت اس کا انتقام لے گا تو یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جائے گا اور روز بروز اس میں شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی کیونکہ انتقامی حملوں پر کمیت و کیفیت کے لحاظ سے قابو نہیں پایا جاسکتا بلکہ جو حملہ رد عمل کے طور پر ہوتا ہے اس میں زیادہ شدت ہوتی ہے۔ دوسرے بالفرض اگر اس کا اندازہ لگانا ممکن ہو اور اس پر قابو پایا جاسکتا ہو تو پہلے حملہ و ظلم کی مقدار، ظالم و مظلوم کے لحاظ سے برابر نہیں ہوگی۔ بنابرایں اگر مد مقابل سے انتقام لینے پر ابھارے گی اور اس طرح انتقام در انتقام کا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ فتنہ و فساد اور انتقام کی آگ کو صرف عفوودرگزر کرنا اور چشم پوشی ہی بجھا سکتی ہے۔ اگر ہم صحیح طریقہ سے تحقیق و تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انتقام لینے میں انتقام لینے والے کے لئے کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس کو عقل صحیح قرار دیتی ہو، صرف وقتی طور پر اسے ایک تسکین ہوجاتی ہے اور کبھی ایک خیال برتری مل جاتی ہے جب کہ عفو و درگزر کرنے میں حقیقی سکون و آرام حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی منابع خصوصاً قرآن میں اس موضوع کی طرف لطیف اشارہ ہوا ہے اور اس کو اسلامی فریضہ قرار دیا ہے۔ ہم اپنی اس بحث کے آغاز میں ان آیات کو بیان کریں گے جن کو امام زین العابدین ؑ نے اپنے کلام کے متن میں بیان کیا ہے۔

مومنین سے مدد طلب کرنا

مدد طلب کرنا مومن کی علامت ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہے:

اور وہ لوگ کہ جن پر اگر ظلم ہوتا ہے تو وہ اس کو برداشت نہیں کرتے بلکہ دوسروں سے مدد طلب کرتے ہیں۔ واضح ہے کہ ان لوگوں کو مدد کرنا چاہیے جن سے مدد مانگی جارہی ہے۔ مظلوم کا یہ فرض ہے کہ وہ ظالم کے مقابلہ میں مقاومت کرے اور دوسرے مومنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کی مدد کریں۔ یہ بات سورۂ انفال میں بیان ہوئی ہے۔

اگر دین کی حفاظت کے لئے تم سے مدد طلب کریں تو تم ان کی مدد کرو۔

یہ مثبت اور تعمیری منصوبہ ظالموں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ مومنین اپنے ہم مذہب پر ہونے والے ظلم و تشدد پر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ سورۂ شوریٰ میں پتھر کا جواب پتھر کے بارے میں ارشاد ہے:

بدی کی سزا اسی جیسی ہے پس جو آدمی معاف کردیتا ہے اور اصلاح کرتا ہے تو اس کا اجر خدا پر ہے اور خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا ہے۔

ظالم کی حرکت کو ظلم ہی کہنا چاہیے۔ جیسا کہ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ لیکن اس کی سزا سیئہ ہی نہیں ہے اگرچہ مذکورہ آیت میں سیّئہ ہی مذکور ہے۔ اس کی وجہ قرینۂ مقابلہ ہے یا یہ ظالم کے نقطۂ نگاہ سے ہے یعنی اس کو جو سزا دی جاتی ہے وہ اس کو سیئہ سمجھتا ہے او یہ بھی ہوسکتا ہے سزا میں ایذا و آزار ہوتا ہے جو کہ طبیعی طور پر برا ہے اگرچہ قصاص کے وقت ظالم کو سزا دینا صحیح اور مستحسن ہے۔ یہ آیت سورۂ بقرہ کی اس آیت کے مشابہ ہے:

پھر جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پ زیادتی کی ہے اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور یہ جان لو کہ خدا پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

مدد مانگنا عیب نہیں ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

اور جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد مدد طلب کرتاہے اس کا کوئی جرم نہیں ہے۔

عفوودرگذر کرنا بہترین طریقہ

امام زین العابدین ؑ دوسری آیت بیان فرماتے ہیں :

لیکن جو مظلو صبر کرتے ہیں اور ظلم کرنے والے کو معاف کردیتے ہیں تو یہ بہترین کام ہے۔ ’’ عزم‘‘ یعنی کسی کام کو انجام دینے کا ارادہ کرنا بلکہ عزم، محکم و پختہ ارادہ کو کہتے ہیں۔ آپ ؑ نے دوسری آیت سورۂ نحل کی بیان کی ہے:

اور اگر تم ان کو سزا ہی دینا چاہتے ہوتو اتنی ہی سزا دو جتنی انھوں نے تم پر زیادتی کی ہے اور اگر صبر کروتو یہ کام صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ یہ آیت جنگ احد میں نازل ہوئی تھی۔ جب رسولؐ نے اپنے چچا حضرت حمزہ کے بدن کو مثلہ دیکھا تو بہت رنجیدہ اور غم زدہ ہوئے اور فرمایا: اے اللہ ! ساری تعریف تیرے ہی لئے ہے اور تجھ ہی سے شکایت کی جاکستی ہے اور جو میں دیکھ رہا ہوں اس پر تجھ ہی سے مدد مانگی جاسکتی ہے پھر فرمایا: اگر میں ان پر غالب آگیا تو انھیں مثلہ کروں گا، ستر مرتبہ یہی لفظ دہرایا یہاں تک کہ رسول ؐ پر یہ آیت نازل ہوئی تو رسولؐ نے فرمایا: میں صبر کرونگا و میں صبر کرونگا۔

عفو اور صفح کا فرق

سورۂ نور میں ارشاد ہے:

اور تم میں سے جو لوگ مالی لحاظ سے برتری رکھتے ہیں اور خوش حالی کی زندگی بسر کررہے ہیں وہ یہ قسم نہ کھائیں کہ اپنے قرابت داروں، مسکینوں اور راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کو کچھ نہ دیں گے، انھیں عفو و درگذر کرنا چاہیے۔ کیا تمہیں یہ پسند نہیں ہے کہ خدا تمہیں بخش دے؟ اور خدا غفوررحیم ہے۔ یہ آیت سورۂ نور میں واقعہ ’’ افک‘‘ کے بعد ہے۔ اس آیت میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ جس طر ح تم میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ خدا اس کے گناہ سے درگذر کرے تو اسے اپنے ان حقوق سے چشم پوشی کرنا چاہیے جو ایک دوسرے سے ٹکرانے کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ ’’ عفو وصفح‘‘ کے لغوی معنی میں فرق یہ ہے۔راغب کہتے ہیں :صفح،عفو سے بلند مرتبہ رکھتا ہے کیونکہ عفو، ملامت و سرزنش اور قہر وغیرہ کے بغیر ہوتا ہے لیکن جو شخص معمولی انتقام لینے سے پرہیز کرتا ہے لیکن زبان سے اس کے جرم کو بیان کرتا رہتا ہے در حقیقت اس نے عفو نہیں کیا ہے۔

برائی کا بدلہ اچھائی سے

قرآن مجید میں عفو و درگذر سے اہم و بلند مرحلہ بھی بیان ہوا ہے اور وہ ہے برائی کا بدلہ نیکی و اچھائی کے ساتھ دینا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یہ عمل روح انسانی کی بلند ترین تجلی ہے جس کے لیے روح کی خاص لطافت اور اخلاق کی بالیدگی کی ضرورت ہے اور یہ بہترین سبق ہے جو مجرم کو دیا جاسکتا ہے اور اس کے ذریعہ عداوتوں اور دشمنیوں کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ سورۂ فصلت میں اس کی بہترین توجیہ بیان ہوئی ہے:

خوبی و بدی مساوی نہیں ہیں بہترین اور شائستہ طریقہ سے دفاع کیجئے کہ اس سے دشمن بھی تمہارا دوست بن جائے گا اور یہ کام وہی انجام دے سکتا ہے جو صبر و مقاومت کی طاقت و قوت رکھتا ہو اور اس مرتبہ پر وہی پہنچ سکتا ہے جس میں انسانیت کا جوہر ہو۔

اس آیت میں پہلا معجزہ نما اثر، بہترین طریقہ سے دفاع بیان ہوا ہے، اس کے ذریعہ بڑے بڑے دشمنوں کو دوست بنایا جاسکتا ہے لیکن اس مرتبہ پر وہی فائز ہوسکتا ہے جو ایمان و تقوے اور علمی و اخلاقی فضائل سے آراستہ ہو اور خواہشات نفس پر صبر کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور یہ دونوں ناقابل انکار حقیقت ہیں۔

شائستہ طریقہ سے دفاع، دشمنی کو ختم کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مد مقابل یہیں سے انتقام لینے کے درپے ہوتا ہے اور اکثر خود کو انتقام کا مستحق سمجھتا ہے لیکن اس کے برخلاف جب ان کی بدی و برائی کا جواب نیکی او ر اچھائی سے دیا جاتا ہے تو ان کی سوئی ہوئی وجدانی طاقت بیدار ہوجاتی ہے اور اندر سے وہ خود ان کے مقابلے میں صف آرا ہوجاتی ہے اور اس کا ضمیر خود مد مقابل کی بے گناہی اور اپنی خطا کاری کی گواہی دیتا ہے اور انھیں اپنا راستہ بدلنے پر مجبور کرتا ہے۔

طاقت کے باوجود معاف کرنا

معاف کرنا اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص انتقام لینے کی طاقت و قدرت رکھتا ہو اور وہ اپنے غصہ کو پی جائے اور انتقام نے لے لیکن جس کے اندر انتقام لینے کی طاقت و قدرت نہ ہو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے فلاں شخص کو معاف کردیا اس بات کے ثبوت کے لیے دو نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت یوسف کا معاف کرنا:

قرآن حضرت یوسف اور ان کے خطا کار بھائیوں کا قصہ بیان کرتا ہے جب وہ تیسری دفعہ مص گئے اور یوسف کے بھائی ہونے کے لحاظ سے ان کے تعارف کے لیے زمین ہموار ہوگئی تو انھوں نے کہا:

کیا آپ ہی یوسف ہیں ؟ فرمایا: میں ہی یوسف ہوں ! اوریہ میرا بھائی ہے خدا نے مجھ پر احسان کیا ہے بیشک جو شخص پرہیزگاری اور صبر سے کام لیتا ہے تو خدا بھی نیکی اور احسان کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

اس وقت یوسف نے انھیں ان کی گزشتہ خطائیں یاد دلائیں اور ا ن سے پوچھا! اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ انھوں نے کہایوسف! ہم خطاکار ہیں آ پ کو حق ہے کہ ہم کو جو سزا چاہیں دیں لیکن کرم فرمائیں اور ہماری خطاؤں کو معاف کردیجئے۔ یوسف نے فرمایا:

آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے، خدا تمہیں معاف کرے اور سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

اس قصہ میں حضرت یوسف انتقام لینے پر قدرت رکھتے ہیں لیکن انھیں معاف کردیتے ہیں۔اس کو کہتے ہیں معاف کرنا۔

فتح مکہ میں رسولؐ کا معاف کرنا:

ہجرت کے آٹھویں سال رسولؐ نے مکہ کا محاصرہ کیا اور شہر میں داخل ہوئے۔ جب مسجد الحرام میں داخل ہوئے حجر اسود کو چوما اور فرمایا: حق آگیا، باطل چلا گیا بیشک باطل برباد ہونے والا ہی تھا۔ اس کے بعد آپ ؐ نے بتوں کو توڑنے کا حکم صادر فرمایا: اس کے بعد لا الہ الا اللہ وحدہ وحدہ پڑھا اور مکہ والوں سے فرمایا: تم کیا کہتے ہو اور تمہارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا: ہم نیک بات کہتے ہیں اور نیک امید وتوقع رکھتے ہیں ! آپؐ ہمارے کریم و بخشنے والے بھائی اور کریم کے فرزند ہیں۔ آج آپ ؐ فتح یاب ہیں۔

رسولؐ نے فرمایا:آج میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے فرمایاتھا:

آج تمہارے لئے کوئی خوف و خطر نہیں ہے او سب کو معاف کردیا اور فرمایا: جاؤ میں نے تم سب کو آزاد کیا۔ رسولؐ اس وقت اقتدا و قدرت کی بلندی پر ہیں اگر چاہیں تو ان سب کو قتل کرسکتے ہیں لیکن صرف انھیں لوگوں سے انتقام لیا کہ جنھوں نے انسانیت سوز مظالم کئے تھے اور باقی لوگوں کو معاف کردیا۔

اس سلسلہ میں حضرت علی بن ابی طالب ؑ فرماتے ہیں :

اس وقت عفووبخشش کی فضیلت آشکار ہوتی ہے جب ہر قدرت حاصل ہو۔

یہ بھی مذکورہ مطلب ہی کی طرف ایک اشارہ ہے کہ عفو اس جگہ ہوت ہے جہاں انتقام لینے پر قدرت ہوتی ہے ورنہ جس میں طاقت نہ ہو وہ معاف نہیں کرے گا تو کیا کرے گا۔ دوسرے جملہ میں فرماتے ہیں :

بہترین عفو وہ ہے جو طاقت و قدرت کے ہوتے ہوئے کیا جاتا ہے۔

نہج البلاغہ کے کلمات میں فرماتے ہیں :

جب اپنے دشمن پر غالب آجاؤ تو اس غالب آنے کا شکریہ ہے کہ اس کو معاف کردو۔

بیشک آزاد منش لوگوں کی بلند حوصلگی اسی کا اقتضا کرتی ہے کہ وہ طاقت و تسلط رکھتے ہوئے بھی انتقام لینے سے گریز کرتے ہیں اور مد مقابل کو معاف کردیتے ہیں اور اس کے اندر تبدیلی پیدا کردیتے ہیں۔

ہم مذہب کا حق

عام طور سے تمہارے ہم مذہب کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تہ دل سے ان کی خیریت و سلامتی طلب کرو اور ان کے لئے رحم و مہربانی کے پر پھیلاؤ اور ان کی خاطر تواضع کرو ان سے انس والفت پیدا کرو، ان کی اصلاح کرو اور اس کا شکریہ ادا کرو کہ جس نے اپنے، ان کے اور تمہارے اوپر احسان کیا ہے کیونکہ اس کا اپنیاوپر احسان کرنا ایسا ہی ہے جیسا تمہارے اوپر احسان کیا ہو اس لئے کہ تمہیں اذیت و تکلیف نہیں دی ہے اور اپنے خرچ سے تمہیں بے نیاز رکھا ہے اور اپنے کو تم سے باز رکھا ہے پس تم ان سب کے لئے دعا کرو اوراپنی نصرت سے ان سب کی مدد کرو اور ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک مخصوص مقام و مرتبہ قرار دو۔ ان کے بزرگ کو اپنے والد کی جگہ سمجھو اور ان کے بچوں کو اپنی اولاد کے برابر سمجھو اور درمیانی عمر والے کو اپنا بھائی قرار دو اور جو بھی تمہارے پاس آئے، لطف و مہربانی سے اس کی دل جوئی کرو اور اپنے بھائی کو بھائی کے حق سے مالا مال کرو۔

ملت کے لغوی معنی

ملت کا لفظ واحد ہے ’’ ملل ‘ ‘ اس کی جمع ہے جس کے معنی مذہب، عقیدہ، ایمان، آئین،جماعت، فرقہ لکھے ہیں : اس کی اصل ہے اور دین کو اس لئے ملت کہتے ہیں کہ دین خدا کی طرف سے املا ہوا ہے۔

ملت دین کے مانند ہے اس شریعت کا نام ہے جس کو خدا نے انبیاء کی زبان سے لوگوں کے لئے بھیجا ہے۔ ملت اوردین میں یہ فرق ہے کہ ملت کی نسبت صرف رسولؐ کی طرف دی جاتی ہے نہ خدا کی طرف نہ امت کی طرف، یہ نہیں کہا جاتا: ملت خدا، ملت زیدہاں دین خدا اور دین زید کہا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ دین کی نسبت خدا، نبی اور امت تینوں کی طرف دی جاتی ہے جب کہ ملت کی نسبت صرف دین لانے والے کی طرف دی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں کبھی قوم اور اس کے طریقہ کی طرف بھی اس کی نسبت دی جاتی ہے۔ مثلاً حضرت یوسف کہتے ہیں :

میں نے ایسے لوگوں کو چھوڑا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔میں نے اپنے آباء واجداد ابراہیم و اسحٰق اور یعقوب کی ملت (سنت) کا اتباع کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

یعنی ہم نے یہ باتیں آخری دین میں نہیں سنی ہیں، یہ سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں ہے۔

ملت کا اطلاق بت پرستوں کے طریقہ پر بھی ہوا ہے۔

لغوی بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ اس بیان میں امام زین العابدین ؑ ہم مذہب وہم مسلک کی وضاحت فرما رہے ہیں بعبارت دیگر ملت اسلام سے بحث ہے۔

اسلام اور معاشرہ کی اہمیت:

اسلام کے زاویہ نگاہ سے انسان مدنی الطبع ہے، مل جل کر زندگی گزارنے کا عادی ہے، انسان کے تکامل کو اسلام معاشرہ کے تکامل کے زیر سایہ قرار دیتاہے یہ مسئلہ قرآن کے خطاب سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے اس سلسلہ کی چند آیتیں ملاحظہ ہوں :

## منحرف راستوں سے پرہیز:

بیشک یہ میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر چلو دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ نتیجہ میں وہ تمہیں حق سے دور کردیں گے یہ وہ چیز ہے جس سے خدا تم کو وصیت کررہا ہے تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔

اس آیت میں خدا پوری جماعت سے گفتگو فرما رہا ہے کسی فرد سے نہیں۔

## اتحاد و ہم آہنگی کی دعوت:

اور اللہ کی رسی کو مضبوط طریقہ سے پکڑ لو اور تفرقہ اندازی نہ کرو اور تم پر جو خدا کی نعمت ہے اس کو یاد کروکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں محبت و الفت پیدا کردی اور اس نعمت کی برت سے تم بھائی بھائی ہوگئے۔

اس آیت میں اتحاد، اخوت و برادری سے بحث ہے، جو کل دشمن تھے آج وہ بھائی بھائی ہیں، اس اتحاد و نظم سے غیر انگشت بدنداں ہیں مثلاً برطانیہ ا مشہور دانشور جان ڈیون پورٹ لکھتا ہے : ایک سادہ عرب محمد نے تفرقہ کا شکار چھوٹے چھوٹے ننگے، بھوکے قبیلوں کو منظم معاشرہ میں تبدیل کردیا اور روئے زمین پر بسنے والی ملتوں کے درمیان ان کا تعارف نئے اخلاق سے آراستہ قوم کے عنوان سے کرایا اور تیس سال سے کم مدت میں قسطنطنیہ کی شہنشاہیت کو مغلوب کیا اور ایران کے بادشاہوں کو شکست دی، شام، بین النہرین اور مصر کو فتح کیا اور بحر اطلس سے لے کر دریائے خزروسیحون تک کا علاقہ فتح کرلیا۔

ہندوستان کا سیاست مدار آنجہانی نہرو لکھتا ہے: عرب کی سرگزشت و داستان اور یہ کہ وہ یورپ اور افریقہ تک اتنی جلد کیسے پھیل گئے اور عظیم تہذیب کیسے وجود بخشا یہ تاریخ بشری کے عجوبوں میں سے ہے۔ جس نئی طاقت و فکر نے عربوں کو بیدار کردیا اور انھیں اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھا دیا وہ اسلام ہی تھا۔ اس مذہب کا آغاز نئے رسول، محمدؐ سے ہوا جس نے ۵۷۰ئ؁ میں مکہ میں ولادت پائی۔

یہ تھے اس سلسلہ کے دو نمونے جو ہم نے سپرد قلم کردیئے ہیں اور دوسرے دانشوروں کے اتنے زیادہ اعترافات ہیں کہ ان کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

## تفرقہ کی ممانعت:

ان لوگوں کی مانند نہ ہو جاؤ کہ جو متفرق ہوگئے اور اختلاف کرنے لگے جب کہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی تھیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے سخت عذاب ہے۔

اس آیت میں اتحاد پر زور دیا گیا ہے اور تفرقہ و نفاق سے بچنے کی تاکید ہوئی ہے، اگلی قوموں، یہود و نصاریٰ کی مانند مسلمانوں کو تفرقہ و

اختلاف میں نہیں پڑنا چاہیے۔ تفرقہ سے اجتناب کرنے پر قرآن اس لیے زور دیتا ہے کہ اگر ایسا ہوگا تو مسلمانوں ی عظمت و عزت خاک میں مل جائے گی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا و نزاع مت کرو کہ تم سست پڑ جاؤ گے اور تمہای ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو بیشک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں رہبر و قائد کے کردار، اس کی اور اس کے حکم کی اطاعت اور نزاع و تفرقہ سے پرہیز کرنے و بیان یا ہے کیونکہ نزاع و فساد کے نتیجہ میں تم کمزور ہوجاؤ گے عظمت و عزت چلی جائے گی اس لئے کہ منزل مراد پرکشتیوں کہ ہمیشہ باد موافق ہی پہچانتی ہے اور ہوا ہی سے پرچم لہراتا ہے کہ جس سے حکومت کی طاقت و قدرت کا پتہ چلتا ہے۔

## اخوت و برادری مسلمانوں کا شعار ہے

جہاں قرآن نے ہم کو گذشتہ آیات میں جدائی اور کشمکش سے روکا ہے اور اس کے بھیانک نتائج کو ہمارے گوش گزار کیا ہے وہیں مسلمانوں کے معاشرے کو اخوت و برادری کی بھی دعوت دی ہے ارشاد ہے:

مومنین تو بس بھائی بھائی ہیں،اگر ان میں اختلاف ہوجائے تو سارے مومنین کا فریضہ ہے کہ ان میں صلح کرائیں اور انھیں یہ سمجھائیں کہ پورا اسلامی معاشرہ ایک ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان اجتماعی زندگی گذارنے کا عادی ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ معاشرے کے لوگ اپنے نفع کے چکر میں رہتے ہیں، اس سے ٹکراؤ اور نزاع ہوتی ہے، کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے اختلاف سے محفوظ رہیں ؟ اسلام کے مکتب اخلاقی میں کچھ ایسے دستورات ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو وہ انسان کے محفوظ رہنے کا سبب ہونگے۔ اصول کافی میں د و باب ہیں : باب مدارات اور باب رفق، ان دوابواب کی چند روایات ذیل میں بیان کی جاتی ہیں :

علی بن ابراہیم نے امام صادق ؑ سے اور آپ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ فرمایا:اگر کسی شخص میں تین چیز، ایسا ورع جو اسے خدا ی نافرمانی سے باز رکھے، ایسا اخلاق جس سے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک و مدارات کرے اور ایسا حلم و برد باری، نہ ہو جو جاہل کی جہالت کو روک سکے، تو اس کا کوئی عمل کامل نہیں ہوگا۔

دوسری روایت : محمد بن یحییٰ نے حسین ابن حسن سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام محمد باقر ؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جبریل رسولؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے اور عرض کی: اے رسولؐ !آپ کا پروردگا آپ پر سلام بھیجتا ہے اور فرماتا ہے: میرے بندوں کی باتوں کو برداشت کیجئے او ررعایت فرمائیں۔

ابو علی اشعری نے امام صادق ؑ سے روایت کی ہے آپ نے کہا: رسولؐ نے فرمایا: میرے پروردگار نے مجھے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، اچھی معاشرت اور ان کی رعایت کرنے کا حکم دیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے واجبات کا حکم دیا ہے۔

## رفق ونرمی اور اس کے آثار:

ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ شیخ کلینی ؒ نے اپنی کتاب اصول کافی میں ایک باب، رفق کے عنوان سے قائم کیا ہے ہم یہاں اس کی چند روایات تحریر کریں گے اور اس بات کی وضاحت کریں گے کہ رفق کے معنی بھی مدارات کے معنی سے قریب ہیں کیونکہ مدارا کے معنی لوگوں سے حسن

سلوک سے پیش آنا او ر ان کے ساتھ مہربانی و نرمی برتنا اور ان کی سخت باتوں کو برداشت کرنا ہیں، لیکن کبھی ان دونوں میں فرق بھی ماننا پڑتا ہے اور وہ اس لحاظ سے مدارا لوگوں کی اذیتوں کو برداشت کرنا ہے جب کہ رفق میں یہ بات نہیں ہے، علامہ مجلسی اپنی کتاب ’’ مراۃ العقول ‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں :

رفق، نرمی و مہربانی سے عبارت ہے، یعنی لوگوں کے ساتھ ہر حال میں نرمی سے پیش آئے سختی وغصہ سے نہیں۔امام محمد باقر ؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ہر چیز کا ایک قفل ہوتا ہے اور ایمان کا قفل رفق ہے۔

اس حدیث میں ایمان کو ایسے قیمتی و نفیس گوہر سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کی حفاظت کرنا چاہیے اور رفق کو خزانہ و قفل سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو دل میں گوہر کی حفاظت کرتا ہے اور شیطان کو دل میں نہیں جانے دیتا اور شیطان کو انسان کے ایمان کی چوری نہیں کرنے دیتا۔ اگر یہ قفل کھل جائے یا ٹوٹ جائے تو رفق برباد ہوجائے گا اور فتنہ و فساد لڑائی جھگڑا شروع ہوجائے گا۔

امام محمد باقرؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا: اگر رفق کو ئی مخلوق ہوتا کہ جس کو دیکھا جاسکتا تو اس سے حسین خدا کی کوئی مخلوق نہ ہوتی۔

دوسرے روایت میں امام محمدباقرؑ فرماتے ہیں : خدا مہربان اور صاحب رفق ہے اور صاحب رفق کو دوست رکھتا ہے اور جیسی جزا وہ رفق و نرمی کی دیتا ہے ایسی سختی و شدت کی نہیں دیتا ہے۔

امام صادق ؑ نے رسول ؐ سے روایت کی ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا: رفق و مہربانی میں برکت ہے جب کہ سختی وشدت نحس و شوم ہے۔

جو روایات باب مدارا و رفق میں بیان ہوئی ہیں ان سے امام زین العابدین ؑ کے اس جملہ ’’ والفق بمسئھم ‘‘ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں یعنی جو برے ہیں ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور ان کے نیک لوگوں کا شکریہ ادا کرو۔ اور اپنی نصرت سے ان کی مدد کرو اور ان میں سے ہر ایک کو اس کی جگہ رکھو، ان کے بزرگ کو مہربان باپ کی مانند، چھوٹے کو اپنے پیارے بچے کی مثل، اور جوانوں کو اپنے بھائی کی طرح سمجھو اور ان کے جو حقوق تمہارے اوپر ہیں انھیں پورا کرو۔

اس سے قبل آپ بزرگ، کمسن اور بھائی کے حقوق کو شرح و بسط کے ساتھ بیان فرما چکے ہیں۔اور اس کے آخر میں فرماتے ہیں، اور ان میں سے جو بھی تمہارے پاس آئے اس کے ساتھ نرمی و مہربانی، خندہ پیشانی اور ہشاش بشاش طریقہ سے پیش آؤ اور اپنے بھائی کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسا کہ واجب ہے یہ بھائی کے ان حقوق کی طرف اشارہ ہے جو وہ مسلمان بھائی پر رکھتا ہے۔ اس سے قبل ہم بھائی کے حق میں کچھ روایات بیان کرچکے ہیں مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام زین العابدین ؑ ہم مذہب کے حقوق کے بارے میں تاکید فرماتے ہیں کہ ان تمام حقوق کو پورا کیا جائے جو پہلے بیان کیے جاچکے ان حقوق کی ادائیگی میں ہم خدا ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

# اہل کتاب کا حق

لیکن اہل ذمہ یعنی اسلام کی پنا ہ میں رہنے والوں کا حق یہ ہے کہ ان کی اس چیز کو قبول کرلو جس کو خدا نے قبول کیا ہے اور اس عہد و ذمہ داری کو پورا کرو جو خدا نے ان کے لیے مقرر کی ہے اور اگر وہ مجبور ہوں یا اسے چاہیں تو وہ انھیں دو اور ان سے معاملہ میں خدا کے حکم پرعمل کرو اور چونکہ وہ اسلام کی پنا ہ میں ہیں لہٰذا خدا و رسولؐ کے عہد و پیمان کو وفا کرنے کے لیے ان پر ظلم نہ کرو کیونکہ ہم تک یہ بات پہنچتی ہے کہ فرمایا: جس نے اس شخص پر ظلم کیا جس سے معاملہ کیا ہے میں اس کا دشمن و مخالف ہوں، اللہ سے ڈر خدا کی طاقت و قوت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

’’ نمہ ‘‘ کے معنی عہدوپیمان ہیں۔ قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے:

وہ کسی مومن کے لیے نہ قرابت کا خیال رکھتے ہیں اور نہ کسی عہد و پیمان کے رعایت کرتے ہیں۔

اقرب الموارد میں تحریر ہے : یہودو نصاریٰ میں سے ذمی اس شخص کو کہتے ہیں جو اسلام کی پناہ میں رہتا ہے اور مسلمانوں سے اس کا معاہدہ ہوتا ہے۔ لفظ ذمہ قرآن مجید میں دوبار آیا ہے۔

نہج البلاغہ میں لکھا ہے:

امت کے طبقوں کے بارے میں فرمایا: ان میں جزیہ دینے والے، اہل ذمہ میں سے خراج دینے والے غیر مسلم اہل کتاب ہیں جو آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب کے ماننے والے ہیں کہ جن کا قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے۔ یہ اہل ذمہ ہیں۔ چونکہ یہ بیت المال کو ٹیکس ادا کرتے ہیں لہٰذا اسلامی ممالک میں رہ سکتے ہیں اور اسلام کی پنا ہ لے سکتے ہیں۔

اسلامی حکومت ان سے جزیہ لے کر ان کی جان و مال کی حفاظت کرے گی۔ اسلام کے قانون کے مطابق اہل کتاب اپنے اختلافات کے فیصلہ کے لیے اس صورت میں اپنے علما کے پاس جاسکتے ہیں جب ان کے مسائل ان کی آسمانی کتاب سے متعلق ہوں لیکن اگر یہ اختلافات مالی یہ خصوصی حقوق کے بارے میں ہوں تو اسلامی قاضی کے پاس جائیں گے اور اسلامی قاضی ان کے مقررات کے مطابق فیصلہ کرے گا، انھیں چیزوں کے بارے میں اہل ذمہ اپنے علما سے بھی رجوع کرسکتے ہیں۔

## اہل کتاب سے متعلق ہمارا فریضہ

یہ تو واضح ہوگیا کہ اہل ذمہ یہود و نصاریٰ ہیں جو کہ اہل کتاب ہیں ب دیکھنا یہ ہے کہ ان سے متعلق قرآن نے ہمارا کیا فرض بیان کیا ہے:

جو لوگ خدا پرایمان رکھتے ہیں نہ روزآخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا ہے اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں تو ان سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں۔

د ر حقیقت اسلام نے مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان کچھ احکام و حدود مقر ر کئے ہیں، کیونکہ اہل کتاب ایک آسمانی مذہب کی پیروی کرنے کے سبب مسلمانوں سے کچھ مشابہ ہیں۔ چنانچہ اسلام انھیں قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے لیکن انھیں اس صورت میں قریب آنے کی اجازت ہے جب وہ ایک صلح پسند اقلیت کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزاریں، اسلام کا احترام کریں اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانی نہ کریں۔

## جزیہ کیا ہے؟

جزیہ ’’ جزا‘‘ سے مشتق ہے، اس مال کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے اس کو جزیہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کی جزا میں یہ مال اسلامی حکومت کو دیتے ہیں۔ مفردات راغب سے یہی معنی سمجھ میں آتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل میں یہ عربی نہیں ہے بلکہ قدیم فارسی کے لفظ ’’ کزیت ‘‘ کا معرب ہے۔ کزیت اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو فوج کی تقویت کے لیے لیا جاتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ خالص عربی ہے اور یہ اس امن و امان کی جزا ہے جس کو اسلامی حکومت اقلیتوں کے لیے فراہم کرتی ہے۔ ہم ہاتھ کے حق میں صلوبا سے خالد بن ولید کے معاہدہ کے متن میں جزیہ کی وضاحت کرچکے ہیں۔

جزیہ اسلام سے پہلے:

بعض افراد کا نظریہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ساسانی بادشاہ انو شیرواں نے جزیہ لیا تھا اگر یہ ثابت نہیں ہے تو کم ازکم یہ مسلم ہے کہ انو شیرواں اپنی ملت سے جزیہ لیتا تھا اور جن لوگوں کی عمر بیس سال سے اوپر اور پچاس سال سے کم ہوتی تھی اور وہ حکومت کے رکن بھی نہیں ہوتے تھے تو ان میں سے ہر آدمی سے ۱۲ یا ۸ یا ۴ درہم جزیہ لیا جاتا تھا۔

اس ٹیکس کا فلسفہ ایک ملک کے وجود اور اس کی خود مختاری سے فارغ سمجھتا تھا جو کہ اس ملک کے جزیہ کے چھ شرائط ہیں۔ ۱۔جزیہ قبول کرے۔ ۲۔ امن و امان کے خلاف کوئی کام نہ کرے مثلاً مسلمانوں سے جنگ کا منصوبہ نہ بنائے۔ ۳۔ مسلمانوں کو مالی نقصان نہ پہنچائے اور ان کی ناموس کی ہتک نہ کرے چنانچہ اگر کوئی شخص ان کے رسولؐ کو برا کہتا ہے تو اس کو قتل کردیا جائے گا۔ ۴۔ اسلام نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان پر کھلم کھلا عمل نہ کرے، مثلاً شراب خوری، سور کا گوشت کھانا اور محرم سے شادی کرنا اگران پرعمل کرے گا تو معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔ ۵۔ اسلامی سر زمین پر کینسہ نہ بنائے، ناقوس نہ بجائیں اور مسلمانوں سے اونچے مکان نہ بنائیں۔ ۶۔ ان پر مسلمانوں کے احکام جاری ہونگے۔ فقہا نے یہ شرائط جزیہ کے لیے بیان کیے ہیں۔ البتہ فقہی کتابوں میں فقہا نے جزیہ کو مفصل طور پر بیان کیا ہے ہم نے امام زین العابدین ؑ کے بیان کی مناسبت سے اختصار سے کام لیا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اخلاقی و انسانی لحاظ سے اہل ذمہ کے کیا حقوق ہیں ؟

اہل ذمہ سے متعلق مسلمانوں کی ذمہ داری

حضرت علی ؑ نے اپنے رزمیہ اور جہاد سے متعلق خطبہ میں اہل کوفہ سے فرمایا:

مجھے خبر ملی ہے کہ معاویہ کی فوج کا کوئی سپاہی کسی مسلمان عورت اور اہل ذمہ کی کسی عورت کے گھر میں گھس کر ان کی پازیب، کنگن، گلو بند اور گوشوارے چھین کر لے گیا ان کے پاس حفاظت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا بس یا فرد کرکے اور انا للہ وانا الیہ راجعون، کہہ کر بیٹھ گئیں، اور وہ لوٹ کا سامان لے کر چلے گئے، نہ ان میں سے کسی کو کوئی زخم آیا اور نہ کسی کا خون بہا۔ اس صورت حال میں اگر کوئی مسلمان غم و غصہ میں مر جائے تو بہتر ہے، اس کو ملامت نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس کو اس کا حق پہنچتا ہے۔

اس سلیس و سادہ بیان سے امام و رہبر کے دل میں قوم و ملت کی محبت و ہمدردی کا پتہ چلتا ہے جو شخص اسلام کی پناہ میں ہے اس پر ایسے حملہ سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام ان لوگوں کا کتنا خیال رکھتا ہے جو اسلام کی پناہ میں ہیں۔

جب حضرت علی ؑ نے ایک مسیحی آدمی کو لوگوں سے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ ایک عیسائی ہے۔ فرمایا : پہلے تم نے اس نے اس سے کام لیا اب وہ بوڑھا ہوگیا تو اس کو چھوڑ دیا؟ حکم دیا کہ اس کو بیت المال سے اتنا دیا جائے جس سے اس کی ضرورت پوری ہوجائے۔

وعدہ وفائی

امام زین العابدین ؑ نے اہل کتاب و اہل ذمہ کے حق کے بارے میں بعض اہم اخلاقی موضوعات کی تاکید فرمائی ہے ان میں سے وعدہ وفائی اور اس عہد کو پورا کرنا بھی ہے جو اہل کتاب سے کیا جاتا ہے خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرمایاہے:

اپنے عہد کو پورا کرو بیشک عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

اور جو لوگ اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں۔

ان دوآیتوں میں وعدہ اور عہد کے پورا کرنے کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور ان کو مومنوں کی پہچان قرار دیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں انسان سے سوال کیا جائے گا اس بارے میں رسولؐ اور ائمہ سے جو روایات وارد ہوئی ہیں ان سے اس کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

علی بن ابراہیم سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے امام صادق ؑ سے سنا کہ فرماتے ہیں : مومن کا اپنے بھائی سے وعدہ کرنا اس نذر کی مانند ہے جس کا کفارہ نہیں ہے۔ جس طرح نذر پر عمل کرنا انسان کا فریضہ ہے اسی طرح عہد و پیمان کا پورا کرنا بھی اس کے لئے واجب ہے۔

رسولؐ فرماتے ہیں : کل قیامت میں تم سے وہ شخص مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوگا جس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا ہے۔

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں : کل قیامت میں تم میں سے وہ شخص مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوگا جو تم سب سے زیادہ سچا، سب سے زیادہ امانت ادا کرنے والا، سب سے زیادہ وعدہ وفا کرنے والا اور سب سے زیادہ خوش خلق اور سب سے زیادہ لوگوں سے نزدیک ہوگا۔

مسلمان یا کافر سے معاہدہ:

رسول ؐ فرماتے ہیں : تین چیزوں کی کسی کو چھوٹ نہیں دی گئی ہے۔

۱۔مسلمان یا کافر سے کئے گئے عہدوپیمان کا پورا نہ کرنے کی۔

۲۔ماں، باپ کے ساتھ نیکی نہ کرنے کی، خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔

۳۔امانت ادا نہ کرنے کی خواہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی۔

جو چیز روایات میں بیان ہوئی ہے اور جس پر عمل کرنے کی تاکید کی گئی ہے ان کو امام زین العابدین ؑ نے اس حق میں بیان کردیا ہے۔ بنا برایں جس شخص نے ذمی کا حق ادا کردیا یا اس نے خدا و سولؐکا حق ادا کردیا۔ اور اگر اپنے عہد کو پورا نہ کیا تو اس نے ظلم کیا۔ رسولؐ فرماتے ہیں : روز قیامت میں اس سے نزاع کرونگا۔

قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ دشمنان اسلام میں سے جن لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے تم بھی ان کے ساتھ بدی نہ کرو۔

خدا تمہیں ان لوگوں سے چھیڑ خانی کرنے سے منع کرتا ہے جو دین کے بارے میں تم سے جنگ نہیں کرتے ہیں اور جنھوں نے تمہیں تمہارے وطن سے نکالا ہے ان کے ساتھ نیکی اور عدل کرو بیشک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

لیکن جنھوں نے تم سے جنگ کی ہے اور تمہیں وطن سے نکالا ہے خدا ان سے جنگ کرنے سے منع نہیں کرتا ہے۔ خداوند عالم تمہیں ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی ہے اور تم کو وطن سے نکالا ہے پھر جوان سے دوستی کرے گا وہ ظالم ہے۔

قرآن مجید اہل کتاب کو مشترک اعتقادی مسائل میں مسلمانوں سے متحد ہونے کی دعوت دیتا ہے اور انھیں تفرقہ پردازی سے منع کرتا ہے۔

(اے رسولؐ) کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ اس بات پر متحد ہوجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تم خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک قرار دیں اور خدائے واحد کے علاوہ ہم اپنے میں کسی کو خدا نہ مانیں۔اس پر بھی اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ گواہ رہنا ہم مسلمان ہیں۔

حج کے حق میں ہم نے کتاب مکارم الاخلاق سے جو متن نقل کیا ہے وہ تحف العقول میں نہیں ہے لہٰذا شمارہ گزاری کے لحاظ سے ۵۱ حقوق ہوتے ہیں، ہم نے دونوں کتابوں کے شماروں میں ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کی غرض سے، مدی اور مدعا علیہ کے حق کو ایک نمبر کے تحت بیان کیا ہے۔

اس لحاظ سے حقوق کی مقدار ۵۰ ہی ہوتی ہے۔

رسالۃ الحقوق کے خاتمہ پر امام زین العابدین ؑ فرماتے ہیں :

یہ پچاس حق ہیں جو تمہارے پورے وجود کو ڈھانکے ہوئے ہیں اور زندگی کے کسی موڑ پر بھی تم ان کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ان کی رعایت کرنے کی کوشش کرنا تمہارے اوپر واجب ہے اور خدا سے مدد طلب کرو تاکہ وہ تمہیں ان حقوق کو ادا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور خدا کے علاوہ کوئی طاقت و قدرت نہیں ہے۔ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جو عالمین کا پروردگارہے۔

نثار احمد زین پوری